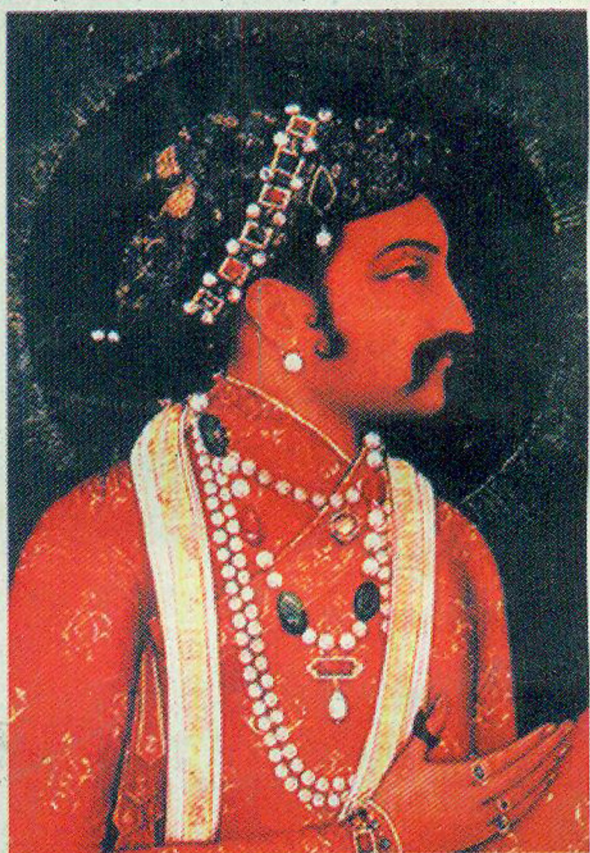
تاریخ شاہجہاں



ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

تاریخ شاہجہاں

بنارسی پرشاد سکسینہ



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پہلی اشاعت	:	1978
چوتھی طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	-/98 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	859

Tareekh-e-Shahjahan

by

Banarsi Prasad Saxena

ISBN :978-81-7587-384-1

ناشر ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025 فون نمبر49539000، فیکس49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر کے پورم، نئی دہلی-110066، فون نمبر26109746

فیکس نمبر26108159

ای-میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www urducouncil.nic.in

طابع ہائی ٹیک گرافکس، 167/8، سونا پریا چمبرس، جولینا، نئی دہلی-110025

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

دیباچہ

اس مقالہ کی محدود ضخامت میں شاہجہانی دورِ حکومت کی تاریخ پیش کرنا بعض مسائل متعلقہ سے ناانصافی کرنے کا مترادف تھا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی تکلف نہیں کہ ثقافتی اور انتظامی اداروں کے ابواب اس سے زیادہ تفصیلات کے ساتھ بیان کیے جاسکتے تھے۔ لیکن امتحان کی اہم ضروریات نے مجبور کیا کہ ضخامت کم کر کے ان کو موجودہ صورت میں پیش کیا جائے۔ حالانکہ اضافہ کرنے میں مواد کی کمی نہ تھی۔ اس کوتاہی کے لیے یوں تو عام پبلک سے معذرت خواہ ہوں مگر مغلیہ ہندوستان کے طلباء سے خاص طور پر اظہار شرمندگی کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس کمی کی تلافی ہو جائے گی۔

لیفٹننٹ کرنل سر ولزلے ہیگ کا احسان مندی کے ساتھ شکریہ واجب الادا ہے۔ موصوف کی رہنمائی کے بغیر میں اس سہولت کے ساتھ یہ کام ختم نہ کرسکتا جیسا کہ اب کرسکا ہوں۔ اس سلسلے میں سر، ای، ڈینی سن راس کو بھی فراموش نہیں کرسکتا جن کی کارآمد تجویزات میری معلومات میں خوشگوار اضافہ تھیں۔ کنگ کالج لندن کے ایم گرد گین صاحب کا بھی میں بہت ممنون ہوں، جنہوں نے میرے مقالہ پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کی، میرے دوست ورفیق کاربشیشور پرشاد صاحب ایم اے نے اپنا بہت سا قیمتی وقت پروف پڑھنے اور کتاب کی طباعت میں صرف کیا۔ ان کا بھی سرگرم شکریہ واجب الادا ہے۔

اپنے شاگردوں بھوانی پرشاد، شمبھو سرن لال اور حافظ احمد خان کا شکریہ ادا کروں، نیز اسٹیٹ لائبریری رام پور کے لائبریرین مرے براؤن، ڈپٹی لائبریرین اورنٹیل اسٹڈیز لندن اور ڈپٹی لائبریرین الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کا شکرگزار ہوں۔

شعبۂ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی

26/ ستمبر 1932ء

حرفِ آغاز

اپنی تصنیف کے تعارف میں ڈاکٹر سکسینہ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ شاہجہاں کا عہد حکومت بجائے خود ایک تاریخ ہے یہی دورِ حکومت جس میں وہ سلطنت جس کو غلطی سے "مغلیہ سلطنت" کہا جاتا ہے، اقتدار و دولت کے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اس عملداری کو عہد متوسط کی کتاب تاریخ کا شان دار باب بتاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ منصفانہ انداز میں یہ بھی کہا ہے کہ اس طویل باوقار حکومت میں آثار زوال بھی نظر آتے ہیں۔ تیمور یہ خاندان کی سلطنت کی سرحد ہنوز اپنی آخری حد تک نہ پہنچی تھی کیونکہ شاہجہاں کے جانشین نے دوسری دو سلطنتوں کے الحاق سے اس میں مزید اضافہ کیا۔ لیکن اس توسیع کو حکومت سے براہِ راست منسلک کرنے کا جو کام انجام ہوا وہ بھی شاہجہاں کی برتر دانشوری کا ثبوت ہے۔ اس سے اس نے ان سلطنتوں کو ملحق کرنے کے بجائے اپنا محکوم ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

شاہجہاں کی کردار نگاری کے وقت اس کو نہایت عیاش، ظالم، عیار اور غیر محتاط دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بمشکل صحیح ہے۔ خواہ اس کا عہد ہو یا اس کے بعد کا زمانہ ہو ایشیا کے دوسرے تاجداروں کے عام دستور کے مطابق اس نے بھی قریبی رشتہ داروں کو اپنے راستے سے ہٹانے میں پیش و پس نہ کیا۔ ان ہی حکمرانوں کی طرح لذت نفس پرستی سے بھی اسے گریز نہ تھا۔ لیکن وہ کاہلی میں وقت گزارنے

والا بھی نہ تھا، اس کو اپنے شاہانہ فرائض کا مثالی احساس تھا۔ اس بات کا ثبوت کثرت سے ملتا ہے کہ اس کی زندگی محنت شاقہ کا نمونہ تھی۔

اگرچہ باعتبار خون وہ نصف سے زیادہ ہندو تھا لیکن اپنے باپ، دادا سے بہتر مسلمان تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بزرگوں کی غیر اسلامی روایات کو منسوخ کر دیا۔ چوبیس سال سے پہلے کبھی شراب نہیں پی۔ اس کے بعد پی بھی تو اپنے باپ کے اصرار پر۔ وہ کبھی ایسی عادت کا غلام نہیں رہا جو اس کے خاندان کے لیے باعث لعنت بنتی۔ اس کے دو چچا اور ایک بھائی شدید مے نوشی سے مرے۔ صرف اس کے باپ کی خداداد پُر زور صحت نے اتنی مدت تک شدید مے خواری کا مقابلہ کیا۔ لیکن شاہجہاں نے باوجود گاہے ماہے شرع کی خلاف ورزی کے خداداد نعمتوں کو ضائع نہ کیا۔ بڑھتی ہوئی عمر میں اس پر نفس پرستی کا الزام جس کو مغربی سیاحوں نے مبالغہ سے پیش کیا ہے۔ اس کو اس روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ اپنی اہلیہ مرحومہ سے اسے والہانہ فریفتگی تھی جو چودہ میں سے بارہ اولادوں کی ماں تھی اس کے مرنے کا غم اور اپنی دل شکستگی کا احساس کتنا تھا۔ ان ہی تاثرات کی یادگار آگرہ کے شاہانہ حسن میں جلوہ افروز ہے۔ دہلی کے محل اور دوسری بہت سی عمارتیں شاہجہاں کے ذوق فن تعمیر کی امتیازی خصوصیات ہیں لیکن تاج محل، یادگار محبت کا جواب دنیا بھر میں نہیں۔

تعجب ہے کہ ایسے حکمران کی حکومت اب تک کسی انگریزی لکھنے والے مورخ کی توجہ کا مرکز نہیں ہو سکی۔ مرحومہ مسز بیورج نے اپنی تصنیفات سے بابر اور اس کے لڑکے کو یادگارِ زمانہ بنا دیا۔ دوسرے اور لوگ جنہوں نے تاریخ یا افسانے کو اپنے فکر و فن کا مرکز بنایا، انہوں نے خواب دیکھنے والوں شہزادوں کے شہزادے یعنی اکبر کے بارے میں اتنا کچھ لکھا کہ فہرست پیش کرنے کی گنجائش یہاں نہیں، جہانگیر بھی یہاں نظر انداز نہیں کیا گیا، اورنگ زیب کا تفصیلی بیان قابل قدر مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے کیا لیکن شاہجہاں کا مطالعہ اب تک نہیں

کیا گیا، اس کے عہد کی اطلاعات جو تاریخوں میں عام طور سے شائع ہوئی ہیں، ہنوز تشنہ ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ مقالہ اسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس پر میں یہ اور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اقدام بہت کامیاب ہے۔

ڈاکٹر سکسینہ نے یہ موضوع زیر بحث قابل تعریف غیر جانب داری سے قلم بند کیا ہے، ان کے ہاتھ میں شاہجہاں نہ تو اتنا نیک کردار ہے کہ اس کے دامن پر کوئی دھبّہ نہ ہو، جیسا کہ ہندوستانی مورخوں نے لکھا ہے۔ برخلاف اس کے نہ تو اخلاقی نظریہ سے اتنا معرا ہے کہ عفریت صفت سمجھا جائے جیسا کہ بعض مغربی سیاحوں نے اس کو پیش کیا ہے۔ ان سیاحوں نے اپنی تحریر کو دربار کی گپ بازی کی چاشنی سے دلکش بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کو ہندوستان میں تیموریہ تاریخ کے طالب علموں کو مطالعہ کرنے کی تہہ دل سے سفارش کرتا ہوں اس لیے کہ اس موضوع پر یہ مقالہ ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہے۔

ولزلے ہیگ

آٹھی نیوم پال مال، لندن۔ ایس ڈبلو آئی

7/مارچ 1932ء

چند باتیں

کسی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اور یہ اُمید کرنا کہ اصل زبان و بیان کا پورا لطف ترجمہ میں بھی باقی رہ جائے اگر خام خیالی نہیں تو صحیح بھی نہیں۔ جن اہل قلم کو اس وادی دشوار سے گزرنا پڑا ہوگا ان کی مشکلات کا اندازہ بھی کرنا آسان نہیں۔ علمی کارگزاری کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ کا کام تصنیف کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اپنے خیالات کو اپنی زبان میں بیان کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا دوسری زبان کی جملہ خصوصیات اپنے الفاظ میں منتقل کرنا انگریزی زبان کی وسعت و معنویت پختگی وزور اس کے لفظیات کی ہمہ گیری، اظہار مفہوم کی صلاحیت اُردو غریب کو کہاں نصیب ان باتوں کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اپنی پوری توجہ کے، تاریخ نویسی کی پوری فضا میں نہیں پیدا کر سکا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ ابلاغ و ترسیل کے مرحلے کو ہمواری سے طے کرنے کی میں نے کوشش کی ہے کہ ہر قدم پر یہ فکر دامن گیر کہ مفہوم کہیں مجروح نہ ہونے پائے اس نظریہ کے تحت ممکن ہے آپ کو زبان و بیان میں کہیں بھی لغزش نظر آئے۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں مگر ایسی حرف گیری کے وقت یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ انگریزی میں طویل جملے کا استعمال مستحسن سمجھا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اُردو میں فعل، فاعل، مبتدا اور خبر کا قریب تر ہونا دلکشی کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے طویل جملوں کو اپنے طور پر بالا اختصار انداز

میں پیش کرنے میں پسینہ آجاتا ہے۔ اس ضمن میں کبھی کبھی مجھے ایک جملہ کو اردو میں حسن واثر کے ساتھ ترجمہ کرنے میں گھنٹوں صرف کرنا پڑے ہیں اور شاید حسب خواہش بات قلم بند نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ اُردو کی لفظیات کا ذخیرہ بھی اتنا وافر نہیں جتنا انگریزی کا۔ ہر موقع کے تاثرات کی تصویر کشی کے لیے الفاظ کی کمی نے کبھی کبھی حسن بیان کو اُبھرنے نہیں دیا۔

یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا اگر مصنف میری مدد نہ کرتے حسن اتفاق سے وہ میرے کرم فرما استاد بھی ہیں۔ اگلے زمانے کے استاد و شاگرد میں جو روحانی ارتباط پیدا ہو جاتا ہے وہ خوش قسمتی سے ہم دونوں میں ابھی تک باقی ہے۔ چنانچہ جب کبھی میں نے ان سے اس سلسلے میں مدد چاہی تو موصوف نے بڑی خندہ پیشانی سے میری مشکل حل کرنے کی زحمت گوارا کی۔ منجملہ ان کے دیگر احسانات کے میں اس کرم فرمائی کو بھی دل میں محفوظ کر لینا الفاظ میں اظہار شکر گزاری سے بہتر سمجھ کر خاموش ہوں۔

شکر گزاری کے سلسلے میں ڈاکٹر سید حسن احمد صاحب (لکچرر شعبہ، پولٹیکل سائنس، مسلم یونیورسٹی) کا احسان نہ ماننا میرا اخلاقی جرم ہوگا۔ موصوف نے جس محنت و نظر سے مسودہ پر نظر ثانی کی ہے وہ میرے لیے بڑی گراں بہا ہے۔ اگر ان کی توجہ شامل نہ ہوتی تو ترجمہ میں بعض ایسی فرو گزاشتیں رہ جاتیں جو کتاب چھپنے پر خود میرے لیے ناقابل برداشت ہوتیں۔

اس سلسلے میں پروفیسر اقتدار عالم صاحب کا بھی ممنون کرم ہوں موصوف کی ہمت افزائی و محنت طلبی میرے لیے بانگِ درا سے کم نہ تھی ان ہی کی آواز پر لبیک کہتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ منزل بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔

اعجاز حسین

نشیمن الہ آباد

اختصاریہ

1	آئین	آئین اکبری
2	ا،ن	اکبر نامہ
3	عرضداشت	خطوط سید مظفر بارہہ خان جہان
4	بساطین	بساطین السلطان
5	ب۔م	برٹش میوزیم کٹلاگ، مخطوطات فارسی
6	فتوحات	فتوحاتِ عادل شاہی
7	حدیقات	حدیقۃ السلاطین
8	آئی،او،ال	انڈیا آفس لائبریری کٹلاگ مخطوطات فارسی
9	اقبال نامہ	اقبال نامہ جہانگیری
10	ج،ا،س،ب	جرنل آف ایشاٹک سوسائٹی۔ بنگال
11	ج،ر،ا،س	جنرل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی
12	لاہوری	پادشاہ نامہ
13	قزوینی	پادشاہ نامہ
14	قصاص	قصاص الخاقانی
15	ر،ب	راجرس اور بیروج۔ توزک جہانگیری
16	ریو	برٹش میوزیم کٹلاگ، فارسی مخطوطات

17	رو	امیسے آف سر ٹامس رو
18	صالح	عمل صالح
19	طباطبائی	پادشاہ نامہ طباطبائی
20	طبقات	طبقاتِ شاہجہاں
21	وارث	پادشاہ نامہ

نوٹ: مجموعہ، مراسلات کے لیے دیکھئے جامع مراسلات فی الباب

تعارف

ایسے دور میں جب شخصیت کے بجائے واقعات کا مطالعہ تاریخ کے سنجیدہ طالب علم کی توجہ کا مرکز ہو رہا ہے تو یہ بات ذرا نامناسب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی صلاحیت ایسے کام میں صرف کرے جو صرف ایک منفرد شہنشاہ کے عہد کے تشریحی بیان تک محدود ہو۔ لیکن شاہجہاں کے دورِ حکومت کی خصوصیت اس سے مختلف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا عہد حکومت اس کے دادا اکبر کی حکومت کی طرح بجائے خود ایک دور ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ کام ابھی حدِ امکان تک کیا بھی نہیں گیا۔

مقالہ کے حدود

اس مقالہ کا مقصد اس خلا کو پُر کرنا ہے جو چغتائی خاندان کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ مقالہ کی وسعت 1592ء سے 1657ء تک محدود ہے۔ شاہجہاں کی شدید علالت کے بعد جو جنگ وراثت کا سلسلہ شروع ہوا وہ اس موضوع کے باہر ہے کیونکہ سر جادوناتھ سرکار نے اپنی گرانبہا تصنیف "اورنگ زیب" میں اس کا تذکرہ بڑی شرح وبسط سے کر دیا ہے۔ اس لیے شاہجہاں کی زندگی کے آخری دور کا بھی بیان اس مقالہ کے حدود سے باہر رکھا گیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہے معروف واقعات کی تکرار سے بھی گریز کیا گیا ہے، لیکن جہاں کہیں بیان میں ربط قائم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں نہایت اختصار کے ساتھ ذکر بھی

کر دیا گیا ہے۔

میرے مطالعہ کا انحصار زیادہ تر ایرانی عصری ذرائع ہیں۔ جہاں کہیں کافی مواد میسر نہیں ہو سکا تو اس عہد کے بعد کے مواد سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ میں نے مغربی سیاحوں کے ان مواد سے بھی استفادہ کیا ہے جو انگریزی زبان میں یا بذریعہ ترجمہ انگریزی میں آئے ہیں۔ ذخیرہ کے اس خام مواد کی پوری طرح چھان بین کر کے مفید مطلب جو نتائج اس مقالہ میں شامل کیے گئے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں (1) ابتدائی تصنیفیں (2) عصری تاریخی روزنامچے (3) مغربی سیاحوں کے بیانات۔

ابتدائی تصانیف: اکبر نامہ و آئین

اکبر نامہ: ابوالفضل کی یادگاری جلد سوئم میں ہم کو شہزادے خرم کی ولادت و تعلیم کے بارے میں جا بجا حوالے ملتے ہیں، لیکن اس کی دوسری تصنیف آئین، مغل بادشاہوں کے انتظامی ادارت کے مطالعہ کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسی کتاب کی بہترین تنقید ڈبلو، ایچ مور لینڈ کی تصنیف ''اسلامی ہندوستان کی زراعتی تنظیم''میں ملتی ہے۔

توزک جہانگیری: لیکن اکبر نامہ سے زیادہ دلچسپ اور موضوع سے متعلق توزک جہانگیری ہے۔ اس کی حیثیت جتنی ادبی اعتبار سے قابل قدر ہے، اتنا ہی تاریخی اعتبار سے بھی۔ جہانگیر اپنے قلم سے روزانہ یہ حالات قلمبند کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس کی حکومت کے تقریباً 17ویں سال کے اواخر تک قائم رہا۔ 18ویں اور 19ویں سال کے حالات معتمد خان نے لکھے ہیں۔ اس لیے کہ شہنشاہ کی روز افزوں کمزوری سدراہ تھی۔ توزک میں جہانگیری عہد حکومت میں شاہجہاں کے عروج کا ذکر مسلسل آتا ہے۔ لیکن جب شہزادے نے بغاوت کی تو جہانگیر کا رویہ بدل گیا۔ اور اب بجائے پُر شوکت لقب شاہجہاں کے اس کو ''بے دولت'' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

مخزن افغانیہ

مخزن افغانیہ کا مصنف نعمت اللہ تیس سال تک اکبر کے زمانہ میں محکمہ خالصہ سے وابستہ تھا اور جہانگیر کے زمانہ میں ۱۱ سال تک وقائع نویس کے عہدہ پر فائز رہا۔ اس کے علاوہ وہ بتایا ہے کہ 1595ء میں خانخاناں کے یہاں داروغہ کتب خانہ کی حیثیت سے اس نے کام کیا۔ 1608ء میں وہ سرکاری ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ اس کے بعد اس کو خان جہاں لودی کی سرپرستی حاصل ہوئی۔

13/ فروری 1612ء میں اس نے یہ کتاب ملکاپور (برار) میں لکھنی شروع کی۔ اس نے صاف صاف اعتراف کر لیا ہے کہ اس کا مقصد اپنے سرپرست کی مدح سرائی ہے۔ پہلے چار ابواب میں اس نے لودی اور سوری خاندان کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ پانچویں باب میں خاں جہاں کے آباواجداد کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کتاب میں آخری واقعہ خان جہاں کی اس سبک دوشی سے متعلق ہے جو مئی 1612ء میں ایلیچ پور میں ہوئی۔

معاصر جہانگیری اور اقبال نامہ

شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد دو ایسی کتابیں ملتی ہیں جو تفصیل کے لحاظ سے قریب قریب یکساں ہیں۔ یہ ان لوگوں کے کارنامے ہیں جو دربار سے بہت قریب تھے۔ مرزا کامگار حسینی نے 1630ء میں معاصر جہانگیری تصنیف کی اور معتمد خان نے 1632ء کے کچھ بعد اقبال نامہ ختم کیا۔ ان دونوں کارناموں کے تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں مصنفوں کا واقعاتی ذریعہ معلومات ایک ہی تھا لیکن کامگار سے زیادہ سرقہ کا مجرم معتمد خان ہے کیونکہ اس نے توزک کی عبارت کا چربہ اپنی زبان میں اتار لیا ہے۔ خافی خان کی رائے کے لحاظ سے بھی معتمد خان سے زیادہ راست گو و قابل اعتماد، کامگار ہے۔ لیکن کامگار، عبداللہ خان فیروز جنگ کا طرف دار ہے کیونکہ اس کا قریبی رشتہ دار ہے۔ دو موقعوں پر اس نے فیروز جنگ کے عیارانہ کردار کی صفائی میں بڑے زور و شور سے وکالت کی

ہے۔ پہلا موقع تو وہ ہے جب اس نے بلوچ پور کی لڑائی کی ابتدا سے کچھ پہلے ہی اپنا پہلو بدل دیا اور دوسرا موقع وہ ہے جب اس نے شاہجہاں کا ساتھ اس وقت چھوڑا جب آخرالذکر بنگال سے واپس آیا تھا۔ باوجود دونوں کتابوں کی خامیوں کے ہم کو ان سے ایسے زمانے کی قیمتی اطلاعات مل جاتی ہیں کہ جن کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مثلاً شاہجہاں کی بغاوت اور وہ حالات جو اس کی تخت نشینی کے پہلے رونما ہوئے۔

عصری تحریروں کی تعداد اور ضخامت حیرت انگیز ہے۔ ان کی قدر قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے نوعیت کے لحاظ سے ان کو حسب ذیل چار حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔

(1) سرکاری تاریخ اور وہ تحریریں جو مغل دربار سے قربت رکھنے والوں نے لکھیں۔

(2) بیجاپور اور گول کنڈہ کی تاریخیں۔

(3) ایران کی تاریخیں۔

(4) عصری مراسلات جن میں ڈائری اور اخبارات بھی شامل ہیں اور وہ مختصر بیانات بھی جو کسی ایک جنگ یا حادثہ سے متعلق ہیں۔

گمشدہ تحریرات

شاہجہاں چونکہ فطرتاً خود پسند تھا اس لیے اس کو بڑی فکر تھی کہ اس کے زمانے کے تاریخی واقعات پر شکوہ الفاظ میں آئندہ نسلوں تک پہنچیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے متعدد آدمی اس کام کے لیے مقرر کیے۔ محمد صالح کمبوہ نے لکھا ہے کہ حکیم حاذق اور ملا عبداللطیف گجراتی ان عہدوں سے اس لیے برطرف کیے گئے کہ ان کے رفیق کار، اُن سے جلتے تھے۔ بد قسمتی سے ان لوگوں کے کام کا نام و نشان باقی نہیں۔ اس لیے ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے کیسے اور کیا لکھا۔

قزوینی کا پادشاہ نامہ

شاہجہاں کے سرکاری مورخوں میں جن کا کارنامہ اب تک محفوظ ہے سب سے پہلے مرزا امناتی قزوینی کا نام ملتا ہے قزوینی افضل خاں کا پروردہ تھا۔ وہ ہندوستان کب آیا اس کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں لیکن خود اس کا بیان ہے کہ 1630ء میں وہ دکن میں موجود تھا جب یہاں شدید قحط سالی کا دورہ تھا۔ شاہجہاں کی حکومت کے پانچویں سال وہ شاہی ملازمت میں داخل ہوا اور جب شہنشاہ 1633-34ء میں کشمیر گئے تو قزوینی، افضل خان کے ہمراہیوں میں تھا۔ اس کی پہلی تحریر اس معرکہ کا بیان ہے جس میں اورنگ زیب سدھاکر ہاتھی سے لڑا تھا۔ شہنشاہ نے اس بیان کو بہت پسند کیا۔ اس کے بعد اس نے بندیلہ کی لڑائی قلم بند کی۔ شاہجہاں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس کو درباری مورخ کی جگہ دے دی۔ اس عہدہ پر وہ اس زمانہ تک کام کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے شاہجہاں کے پہلے دس سال حکومت کا ذکر مکمل کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے حسد کی وجہ سے برطرف کیا گیا۔

قزوینی کے بادشاہ نامہ کی زبان سادہ اور دلکش ہے۔ اس زمانے کے خالص فارسی اسلوب بیان کا مثالی نمونہ ہے۔ فطرتاً مصنف اپنے سرپرست شہنشاہ کا جانب دار ہے۔ چنانچہ شہنشاہ کی ابتدائی زندگی اور خاص کر اس کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے وہ سارا الزام نورجہاں پر رکھ دیتا ہے۔ نورجہاں کو برُے الفاظ میں یاد کرتا ہے۔ دراصل بغاوت کا بیان بہت مختصر ہے۔ مصنف کوشش کرتا ہے کہ اس عہد کے کشمکش کی بنیاد وہم کی باتوں پر رکھ دے۔ باوجود ان باتوں کے اس کا کارنامہ اس لیے قیمتی ہے کہ شاہجہاں کی ابتدائی تعلیم اور اس کی حکومت کے ابتدائی دس سال کے واقعات کا اندازہ ہوتا ہے۔

طباطبائی کا پادشاہ نامہ

قزوینی کی طرح ایک دوسرا بادشاہ نامہ جلال الدین طباطبائی کا لکھا ہوا ہے۔ جو

حصہ محفوظ ہے اس میں شاہجہاں کے عہد حکومت کے صرف چار سال کا ذکر ہے۔ یعنی 5ویں سے 8ویں سال تک کا، لیکن اس کتاب میں منتشر حوالے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ طباطبائی نے اس سے پہلے کے زمانہ کا بھی حال لکھا ہے۔ اس کی زبان بڑی خوبصورت اور مرصع ہے۔ طرز بیان دیسی فارسی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس کام کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ کیونکہ یہ صرف اس کے پیش رَو اور ہم وطن قزوینی کے بیان کا چربہ ہے۔ بعض مقامات پر خاص کر کشمیر کے بیان میں محسوس ہوتا ہے کہ طباطبائی نے بلا تکلف قزوینی کی نقل کی ہے۔ طباطبائی نے اپنی کتاب 1640ء میں مکمل کی۔

لاہوری کا پادشاہ نامہ

تیسرا سرکاری مورخ جو شاہجہاں کے معیار پر پورا اترا وہ عبدالحمید لاہوری تھا۔ محمد صالح کے خیال میں وہ ابوالفضل اسکول کا مقلد تھا۔ درباری مورخ ہونے سے پہلے ہی وہ عمر کی زوال پذیر منزل میں تھا۔ جب کہ اس کے کام کی ابتدا حقیقتاً شاہجہاں کے عہد حکومت کے بارہویں سال سے پہلے کی نہیں۔ خیال یہ ہے کہ تخمیناً سولہواں سال شاہجہاں کے عہد کا تھا جب اس نے یہ کام شروع کیا۔ محمد وارث کا کہنا ہے کہ عبدالحمید نے اپنا کام 9/نومبر 1648ء میں مکمل کیا۔ اس کا انتقال 30/اگست 1654ء میں ہوا۔

لاہوری کا پادشاہ نامہ شاہجہاں کے حکومت کے پہلے 20 سال پر مشتمل ہے۔ مصنف نے ابتدا میں ابوالفضل کا اسلوب بیان اختیار کیا لیکن بعد میں ترک کر دیا۔ پہلے دس سال کا ذکر قزوینی کے بیان کی تکرار ہے۔ البتہ جا بجا تفصیل میں کچھ اضافہ ہے۔ نور جہاں کے متعلق فیصلہ کرنے میں لاہوری اتنا ہی سخت ہے جتنا اس کا پیش رَو تھا۔ کشمیر کا بیان بعینہٖ مشابہ ہے۔ اس کے کام کی اصل قیمت دوسرے حصہ میں ہے جس میں دوسرے دور کے واقعات کا بیان ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ مکمل ہے لیکن اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی ادب کے طالب

علم کی توجہ یا تعریف کا مرکز بنے۔

وارث کا پادشاہ نامہ

لاہوری اپنے کام کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔ پیرانہ سالی نے اس کو معذور رکھا۔ لہٰذا یہ کام اس کے ایک شاگرد محمد وارث کے سپرد کیا گیا۔ جس نے شاہجہانی عہد کے تیسرے دور کا ذکر کیا ہے۔ شاہجہاں آباد کی عمارتوں کا ذکر بہت ہی شرح وبسط کے ساتھ بڑے دل کش انداز میں ہے۔

محمد وارث کا شاہجہاں نامہ

محمد وارث کے بعد اطلاعات کے لیے ہم کو بعض ایسے افسروں کی تحریر پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو دربار سے بہت زیادہ قریب تھے، اس سلسلہ میں اوّل و اہم ترین کام محمد صادق کا شاہ نامہ ہے۔ باوجود متعدد خود نوشت سوانحی حوالہ جات کے مصنف کی شناخت مشکل ہے۔ بہر حال اگر شاہجہاں نامہ، غیر معمولی اہمیت کا کارنامہ نہیں تو کم از کم اس میں شک نہیں کہ یہ اسی زمانہ کی معتبر تاریخی اسناد میں سے ہے۔ یہی نہیں کہ مصنف ایک مخصوص عہدہ پر مامور تھا۔ (ایک زمانہ میں وہ داروغہ غسل خانہ تھا) جس سے اس کو موقع ملتا تھا کہ اپنے پیش کردہ حالات کو دیکھ کر، سمجھ کر ایک سوچے سمجھے تجزیہ کی صورت میں قلم بند کرے بلکہ جہاں کہیں بیانات کو ذاتی علم کا سہارا نہیں مل سکا وہاں بھی اس کے اطلاعی ذرائع مشکوک نہیں۔ اس نے اپنے چار چچاؤں کے نام بتائے ہیں جن میں سے تین سرکاری ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے۔ اسحاق بیگ یزدی، ممتاز محل کا میر سامان تھا۔ امیر خان، میر توزک تھا اور باقی خاں عرصہ دراز تک اکبر آباد (آگرہ) کا ناظم تھا۔ اس کا چوتھا چچا محمد یار صرف احدی یا رسالے میں سوار تھا۔ محمد صادق کو اپنا کوئی مطلب نکالنا نہیں تھا۔ نہ وہ درباری مورخ تھا نہ کسی سرپرست کے خوش کرنے کے لیے لکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شاہجہاں کا جانب دار ہے۔ اور نہ وہ منصف مزاج ہے۔ وہ ضروری تنقید سے کبھی باز نہیں آتا نہ ناخوشگوار حقائق

لکھنے میں تکلف کرتا ہے، وہ جہانگیر کی موت سے کام شروع کرتا ہے اور شاہجہاں کی نظر بندی تک حالات رقم کرتا ہے۔

اس کی غیر جانب داری کی یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً خان جہاں لودی کے ساتھیوں کی جدو جہد کی تعریف، حالانکہ آخری معرکہ میں یہ لوگ بلحاظ تعداد سادات بارہہ سے کم تھے، دکنی تیغ زنی کا کمال، مراری پنڈت کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے اس کو "صاحب سیف و قلم" کہنا، نور جہاں کی مرحوم شوہر کے ساتھ وفاشعاری، بعض ہندوافسروں بالخصوص آصف خان کے دیوان کمند رائے کی تعریف، بالآخر اس کے اعتراف کہ قندہار میں مغل اس لیے ناکامیاب رہے کہ ان کے آتش بار اسلحے گھٹیا قسم کے تھے۔ دارا کی شکست کے بعد اس نے شاہجہاں اورنگ زیب کی گفت و شنید میں براہ راست حصہ لیا تھا۔ اس لیے اس کا بیان نہایت مستند ہے۔

ملّا طاہر کی ملخّص:

محمد طاہر اشنا کی تصنیف ملخاص شاہجہانی دور کے 30 سال کی مکمل تاریخ ہے، شاہ نواز خاں اس کے صاف ستھرے طرزِ بیان کی تعریف کرتا ہے لیکن بہ حیثیت مورخ اس کا شمار نقل نویسوں میں ہو سکتا ہے۔ اہل تخلیق میں نہیں، اگرچہ شاہی ملازمت میں اسے بلند مرتبہ نصیب تھا اور اپنے عہدے کے لحاظ سے بے لوث اطلاعات فراہم کر سکتا تھا۔ (وہ کشمیر کے ناظم ظفر خاں کا بیٹا تھا) لیکن اس نے کمتر درجہ کا رویہ اختیار کیا۔ محمد امین قزوینی و عبدالحمید لاہوری وغیرہ کی تاریخوں سے حرف بہ حرف نقل کر دیا۔ وہ اتنا آرام طلب تھا کہ تبت کی فتح کو بھی اپنی معلومات سے جاندار بنانے کی زحمت نہ کی حالانکہ یہ مہم اس کے باپ نے سر کی تھی۔ وہ شاہجہاں کا طرف دار ہے اس لیے خسرو کے قتل کا ذکر نہیں کرتا نہ اس کا ذکر کرتا ہے کہ شاہجہاں نے بغاوت سے پہلے اپنے باپ سے کیا مطالبات کیے تھے۔ اس کا یہ بیان دلچسپ ہے کہ بلخ کی مہم کی نوعیت انتقامی جذبہ تھی۔ کیونکہ نظر محمد خان

نے کابل فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔

عمل صالح مصنفہ محمد شاہ کمبوہ

محمد شاہ کمبوہ نے شاہجہاں کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ 1659ء میں مکمل کی۔ بعض حوالوں سے خیال ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتاب جنگ وراثت سے پہلے شروع کی تھی۔ مثلاً شاہجہاں کی ممتاز محل سے شادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس ازدواجی رشتہ سے چار لڑکے ہیں جو چار دانگ عالم پر قبضہ کیے ہیں"۔ لیکن جب وہ ملکہ کی وفات کا ذکر کرتا ہے تو شہزادہ اورنگ زیب کی تعریف کی لمبی فہرست پیش کرتا ہے۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ، تعریف کے پل باندھنے کی نہ تھی۔ شاہجہاں کے المیہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے کا سلسلہ 1659ء کے بعد بھی قائم تھا۔ اس کے علاوہ شجاع کے بارے میں مصنف کا یہ کہنا کہ اب تک (1669ء) اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا"۔ ظاہر کرتا ہے کہ اعمال صالح اس سال تک ختم نہیں ہوئی۔

غلام یزدانی اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ مصنف شاہی محکمہ اندراجات میں ملازم تھا اس لیے اس کو براہ راست معلومات حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ لیکن اس کی تصنیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز آخری جز کے محمد صالح نے شاہجہاں کی حکومت کے عصری حالات کو رنگین زبان میں بیان کر دیا ہے، دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شاہجہاں کا جانب دار اور نور جہاں کا مخالف تھا۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ شاہجہاں خسرو کے قتل میں شریک تھا، ایک بڑا ثبوت اس کی آزاد رائے کا ہے۔

ظفر نامہ عالمگیری

بے جا نہ ہوگا اگر یہاں چند کتابوں کا ذکر کیا جائے جو اگرچہ قطعی طور پر عصری نہ تھیں مگر اس عہد کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔ اس سلسلہ میں "ظفر

نامہ پادشاہ عالم گیر" پہلے نمبر پر آتا ہے ریو(Rieu) اس تصنیف کو میر خان، صوبہ دار قابل سے منسوب کرتا ہے یہ مصنف اس عہد کے واقعات انگیز کی دستاویز ہے۔ جس میں اورنگ زیب اپنے باپ کو تخت سے اتارنے اور دوسرے حریفوں کو محروم کرنے میں کامیاب ہوا۔ پر مصنف نے اپنی ذاتی معلومات سے جہاں آرا کے اورنگ زیب کے پاس جانے سے متعلق جو کچھ لکھا ہے بہت دلچسپ ہے۔ محمد صادق کی طرح وہ بھی خلیل اللہ خان کی اس غداری کا ذکر کرتا ہے جس نے اورنگ زیب کو اپنے باپ سے بالکل بیگانہ کر دیا۔

فتوحات عالمگیری

فتوحات عالمگیری اورنگ زیب کی حکومت کا تاریخی دستاویز ہے جس کا مصنف اسر داس ناگر ساکن سہر پٹن (گجرات) ہے۔ یہ کتاب اورنگ زیب کے عہد حکومت کی تاریخ ہے جس میں عروج اقتدار سے چونتیس سال تک کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ اس میں سات باب ہیں جس کے صرف دو باب ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ پہلے باب کی ابتدا شاہجہاں کی علالت اور دارا کے حصول سلطنت کی جدوجہد پر مشتمل ہے اس میں اختصار کے ساتھ شجاع کی اس شکست کا بھی ذکر ہے جو جے سنگھ اور سلیمان شکوہ کے ہاتھوں اسے اٹھانی پڑی اس کے بعد مصنف، مراد کے ہاتھوں علی نقی کے قتل کا جواز پیش کرتا ہے اس جواز کی بناء اس امر پر ہے کہ علی نقی دارا سے ساز باز رکھتا تھا۔

دوسرے باب میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ اس وعدہ کا ذکر ہے جو اورنگ زیب نے مراد سے کیا تھا کہ وہ اس کو تخت پر بیٹھا کر خود دنیا ترک کر دے گا۔ اس سے آگے چل کر وہ خلیل اللہ خان کی اس دغابازی کا ذکر کرتا ہے جو اس نے دارا کو ہاتھی سے اتر جانے کی رائے دی تھی۔ مجموعی حیثیت سے وہ مراد کا طرفدار ہے اور اس کا بیاں اس لیے بھی قابل اعتماد نہیں کہ اس کی بنیاد مستند ثبوت پر نہیں۔

نسخہ دل کشا

اس طرح کی دوسری تاریخی تصنیف نسخہ دل کشا ہے۔ اس کا مصنف بھیم سین ولد رگھوناتھ داس ایک کایستھ ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ سرکاری ملازمت ترک کرنے پر وہ ترک دنیا بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عزیزوں کی محبت نے اس کو یہ راستہ نہ اختیار کرنے دیا۔ اس نے راؤدل پت سے دوستی کرلی۔ راؤدل پت، بیر سنگھ دیو بندیلا کی اولاد میں تھا، بھیم سین اس کی خدمت میں داخل ہو گیا۔

ایک مختصر تعارف کے بعد بھیم سین، راودل پت کے بزرگوں کے ذکر سے اپنی کتاب شروع کرتا ہے اس کے بعد وہ شہر برہان پور کا ذکر کرتا ہے۔ اتفاقیہ طور پر ملک عنبر کی ولادت ووفات کا مادہ تاریخ بیان کرتا ہے۔ وہ کھڑکی کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اس شہر کو ملک عنبر نے آباد کیا تھا لیکن اورنگ زیب نے یہ نام بدل کر اورنگ آباد کردیا۔ واقعات کا وہ بیان جو شاجہاں کی علالت کے بعد ہی رونما ہوئے اور خاص کر دکن میں ہوئے وہ بالکل ہی قابل اعتماد ہے۔ شاہجہاں کے عہد حکومت کی تاریخ کے لیے اس کتاب کے ابتدائی 20 صفحات اہم ہیں۔ اس نے لفظ بھونسلا، کی جو تشریح کی ہے وہ دلچسپ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس خاندان کا بانی راجہ اُرسین تھا جو چتوڑ سے دکن چلا گیا تھا۔ وہاں پرندا کے ایک گاؤں بھونسا میں آباد ہو گیا۔ اس گاؤں کی نسبت سے اس کی اولاد بھونسلا کہلائی۔

مراۃ العالم

اس عہد کی غیر مخصوص کتب تواریخ میں تین قابل ذکر ہیں۔

(1) مراۃ العالم۔ ریو[1] اس تصنیف کو بختاور خان سے منسوب کرتا ہے۔ بختاور خان عہد قدیم کے تاریخی قصوں کا ماہر تھا۔ لیکن ایتھ[2] اس بیان کی تردید

---

(1) Rieu (2) Ethe (I.O.L Cat P.47)

کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ شیخ محمد بقا کی تصنیف ہے اس نے اپنے اصل کام میر اضافہ کر کے اس کا نام "مراۃ جہاں نما" رکھا۔ مصنف نے شاہجہاں کی تاریخ باب ششم میں سرسری طور پر پیش کی ہے۔

خلاصۃ التواریخ

(2) خلاصۃ التواریخ۔ اس کا مصنف سجان رائے کھتری، پٹیالہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی جوانی اور اس کے بعد سے بلند پایہ سرکاری افسروں کا منشی رہا ہے۔ اسناد کی ایک طولانی فہرست رامائن سے لے کر تاریخ بہادر شاہی" سے اخذ کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے ان ہی بنیادوں پر اپنا کارنامہ تیار کیا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ چونکہ اس کتاب میں اورنگ زیب تک متعدد بادشاہوں کا تذکرہ ہے اس لیے اس نے اس کتاب کا نام "خلاصات" رکھا ہے۔ کتاب کے نصف حصہ میں صوبہ جات اور ان ہندو اور مسلمان بادشاہوں کا ذکر ہے جو چغتائی سے پہلے حکمراں تھے۔ ہندوؤں کے سلسلہ میں وہ کمبھ میلہ کا بھی ذکر کرتا ہے جو ہر بارہویں سال ہردوار میں ہوا کرتا ہے۔ خسرو کے قتل میں شاہجہاں کا ملوث ہونا اس کے نزدیک مشتبہ ہے۔ جہانگیر کی حکومت کا حال بھی مختصر ہے۔ شاہجہاں کی حکومت کی تفصیل کے لیے وہ محمد وارث کے شاہجہاں نامہ کا حوالہ دیتا ہے۔ جنگ وراثت کے سلسلے میں جسونت سنگھ کا میدان چھوڑ کر بھاگنا اس کے نزدیک جسونت سنگھ کے ساتھیوں بالخصوص راجہ رائے سنگھ یسودیا اور راجہ سجان سنگھ چندراوت کی وجہ سے ہوا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ خلیل اللہ خان کی رائے سے دارا ہاتھی سے اترا۔ دارا کا سندھ سے گجرات فرار ہونے پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ مصنف بے ربطی سے بیان کرتا ہے کہ اورنگ زیب 92 سال کی عمر 1707ء میں دکن میں مرا۔

منتخب اللباب

(3) منتخب اللباب۔ اس ضخیم تاریخی کتاب کا مصنف خانی خان ہے۔ بلاشبہ وہ

بڑا سمجھدار مصنف ہے۔ لیکن جہاں تک شاہجہاں کے دور کا سوال ہے وہ ہماری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتا۔ جب وہ دکن کا بیان کرتا ہے تو صاف صاف کہتاہے کہ اس نے سارے واقعات پادشاہ نامہ سے لیے ہیں۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی وہ اسی کتاب کا حوالہ دیتا ہے۔

دکن کی تواریخ

تذکرۃ الملوک......اس کتاب کا مصنف رفیع الدین شیرازی 1559ء میں ہندوستان آیا۔ گجرات، ولی اور ساگر کی سیاحت کے بعد وہ بیجاپور چلا گیا۔ یہاں وہ اپنے چچازاد بھائی افضل خان کے ساتھ رہنے لگا۔ افضل خان شاہی مراعات کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ علی عادل شاہ نے اس کو خواں سالار کے عہدہ پر مامور کیا اور وہ اپنے آقا کے ساتھ ٹالی کوٹ کے میدان بھی گیا۔ بعد ازاں ترقی کر کے خزانچی اور شاہ برج کے نگران کے عہدے تک پہنچا۔ عادل شاہ کے انتقال کے بعد افضل خان اور رفیع الدین دونوں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ صرف قسمت کی یاوری تھی کہ رفیع رہا کر دیا گیا، اس کو ابراہیم عادل شاہ کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ اس کی سرپرستی میں جمعدار، مصاحب، محل کا نگراں اور بالآخر بیجاپور کا ناظم مقرر ہوا۔

اس کا کارنامہ دکن کی عام تاریخ ہے اگرچہ اس نے اپنی توجہ بیجاپور پر مرکوز کی۔ لیکن ہندوستان کے مغلوں اور ایران کے صفویوں کے متعلق بھی اس کتاب میں ذکر ہے۔ وجے نگر، گولکنڈہ، احمد نگر اور گجرات کے متعلق بھی تاریخی تحریریں اس میں مل جاتی ہیں۔ ملک عنبر کی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں جن کا ذکر نہ فرشتہ میں ملتاہے نہ کسی دوسری عصری تاریخ میں۔ مجموعی حیثیت سے اس کارنامہ کی امتیازی خصوصیت سادہ وپُر زور تحریر ہے۔ اس میں نہ تو ثقیل الفاظ ہیں نہ مبالغہ آمیز بیانات، نہ استعارہ سے بوجھل زبان ہے اگرچہ اس کا موضوع سخن ایک وسیع عہد سے متعلق ہے لیکن کسی لحاظ سے تھکا دینے والا نہیں۔ بعد میں آنے والے مورخوں نے اس سے بہت فائدے حاصل کیے۔

چنانچہ فرزدنی استر آبادی نے بے شمار حوالے اس کتاب سے دیئے ہیں۔ بساط السلاطین کا کہنا ہے کہ یہ کتاب محمد عادل شاہ کو اس موقعہ پر نذر کی گئی جب وہ مصطفیٰ خان کے گھر گیا تھا۔ اس کتاب میں صرف ایک خرابی ہے کہ مصنف نے یوسف عادل شاہ کی اصلیت بیان کرنے میں قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔

فتوحات عادل شاہی

فتوحاتِ عادل شاہی۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ اس کتاب کے مصنف قزیونی استر آبادی کو دربار عادل شاہ جانا پڑا۔ ہوا یہ کہ وہ اپنے وطن استر آباد سے حج کر کے مکہ گیا، لیکن راستہ کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے واپس اپنے گھر نہ جا سکا بلکہ ہندوستان چلا آیا۔ اثنائے سفر مالا بار کے راہزنوں نے اسے لوٹ لیا۔ ناچار مصطفیٰ باد (دیبل) کی بندرگاہ پر خستہ حالی و کس مپرسی کے عالم میں اتر پڑا...... بندرگاہ ناظم نے مدد کی، اس کو بیجاپور پہنچا دیا۔ یہاں مصطفیٰ خاں نے اس کو عادل شاہ کی حضوری میں پیش کر دیا۔ یہ تصنیف اس نے اپنے سرپرست کی فرمائش پر قلم بند کی۔

فتوحات میں ابراہیم عادل شاہ کے عہد حکومت اور محمد عادل شاہ کی ابتدائی حکمرانی کا کافی ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح قزیونی وہ خلا پُر کرتا ہے جو فرشتہ اور خافی خان کے درمیان ملتا ہے۔ محمد عادل شاہ کی حکومت کے متعلق اس کے بیانات اس لیے قابل اعتماد ہیں کہ اس نے اپنی رائے مستند ذرائع پر قائم کی اور اس لیے بھی کہ غالباً سرکاری دستاویزات تک اس کی پہنچ تھی۔ اس نے مغل بادشاہوں کی دکنی جدوجہد کا تذکرہ بالتفصیل کیا ہے۔ شافعیہ میں ملک عنبر کے متعلق جو حالات ملتے ہیں ان میں قزیونی نے اضافہ بھی کیا ہے۔ ان تعلقات پر بھی بحث ہے جو بیجاپور اور مغلوں کے درمیان 1641ء تک رہے۔ آخری واقعہ جس کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے وہ سلطان محمد کا 1644ء میں گیسو دراز کے مزار پر جانا ہے۔

بساطین السلاطین

بساطین السلاطین۔ یہ کتاب بیجاپور کی تاریخ کا مکمل خلاصہ ہے۔ بنیاد سے

زوال تک کی روداد اس میں ملتی ہے۔ اس کے مصنف غلام مرتضیٰ نے ان اسناد کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جن سے اس نے استفادہ کیا۔ اس فہرست کی بعض کتابیں نایاب ہو گئی ہیں۔ دوسرے عصری مواد کی عدم موجودگی میں تاریخ بیجاپور از سر نو مرتب کرنے کے لیے بساطین کی موجودگی زبردست سہارا ہے۔

تاریخ محمد قطب شاہی

اگرچہ کسی لحاظ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گول کنڈہ کے قطب شاہان، فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں بخیل تھے لیکن بدقسمتی سے ان کو غیر معمولی صلاحیت کا کوئی مورخ دستیاب نہ ہو سکا۔ سب سے قدیم نسخہ جو ہنوز باقی ہے اس کا نام ہے "تاریخ محمد قطب شاہی" یہ کسی گمنام مؤلف کا کارنامہ ہے جس میں ان کے مفصل بیانات کا خلاصہ کردیا ہے۔ جو فرشتہ نے شاہ خُرشان سے منسوب کردیا ہے۔ مؤلف نے یہ کام محمد قطب شاہ کے حکم سے شروع کیا تھا۔ اس نے اس خاندان کی تاریخ 1616ء تک پیش کی ہے۔ حکمران وقت کا تذکرہ بہت مختصر ہے، بعد ازاں خانی خان کو باوجود کافی محنت و تلاش کے کوئی ایسی اطلاع نہ مل سکی جو تاریخ محمد قطب شاہی میں اضافہ سمجھی جاتی۔ اس لیے گیارہ سال کا افسوس ناک خلا اس خاندان کی تاریخ میں رہ جاتا ہے۔

حدیقۃ السلاطین

حدیقۃ السلاطین میں اگرچہ 1614ء سے تذکرہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے لیکن بجز عبداللہ قطب شاہ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کے کسی دیگر واقعہ کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ اس کا مصنف نظام الدین احمد بن عبداللہ شیرازی، وزیر اعظم شیخ محمد کا منظور نظر تھا۔ اسی کے حکم پر اس نے یہ کام شروع کیا، اس نے بھی ایسے درباری مورخوں کے طرز پر لکھا جو ہمیشہ بدی کو نیکی سے تعبیر کردیتے ہیں۔ اس کا بیان مغلق اور پرپیچ ہے۔ جیسے لفظ "مشعل" اور "ڈیوٹ" ایک ساتھ استعمال ہوا ہے۔ لیکن بہ حیثیت عصری تاریخی دستاویز کے حدیقہ بہت کارآمد ہے۔ ان

روداد کا بھی بیان ہے جو مغل اور قطب شاہی درباروں میں سرانجام پاتی رہیں۔ اگرچہ ہر موقعہ پر مصنف عبداللہ کی بیچارگی ونرمی کا جواز پیش کرتا ہے، تاریخی واقعات کے علاوہ مصنف بعض بڑی دلچسپ باتیں لکھ جاتا ہے۔ مثلاً وہ بیان کرتا ہے کہ نمک کیسے تیار کیا جاتا تھا اور عبداللہ نے اس پر سے چنگی ہٹانے کے لیے کیا کیا، اس نے گولکنڈہ میں مینا بازار کے وجود کا بھی ذکر کیا ہے اس میں مغربی عورتیں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ حدیقہ 1940ء میں ختم ہوئی، یعنی عبداللہ کی حکومت کے 16ویں سال میں۔

حدیقۃ العالم

حدیقۃ العالم۔ ابوالقاسم بن رضی الدین موسوی، عرف میر عالم کی تصنیف ایک جامع ومانع قطب شاہی خاندان کی تاریخ ہے۔ مصنف نظام علی آصفی کا وزیر اور معتمد ملازم تھا۔ وہ مشہور ومعروف شوشتر خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس نے آصفی سلطنت کے آغاز کی تشریح کے لیے قلم اٹھایا تھا۔ یوں تو اس نے تاریخ محمد قطب شاہی، فرشتہ اور خافی خان کی تواریخ پر اپنے بیانات کی بنیاد رکھی ہے۔ لیکن وہ اپنی تنقیدی ذکاوت سے مختلف فیہ، بیانات میں معقول دلائل بھی پیش کرتا ہے۔ مگر بہت کم وہ نئی معلومات پیش کرتا ہے۔ چنانچہ محمد قطب شاہ کی حکومت کا بیان بھی اتنا ہی نامکمل ہے جتنا ان مورخوں کے بیان جن سے اس نے کتاب لکھنے میں مدد حاصل کی، وہ اپنی کتاب کا خاتمہ اورنگ زیب کی اس حکومت پر اعتراض کے ساتھ کرتا ہے۔ جو گولکنڈہ سے متعلق ہے، مصنف کے نزدیک مغل سلطنت کو اس تسخیر سے بہت کم فائدہ ہوا بلکہ برخلاف اس کے کمزوری کا سبب بن گئی کیونکہ اسی اقدام نے مرہٹہ سلطنت کے قیام کا راستہ ہموار کردیا۔

تواریخ ایران: تاریخ جدید

تاریخ جدید...... اس کا مصنف مرزا طاہر وحید، وزیراعظم مرزا تقی الدین محمد، کا آوردہ تھا۔ شاہ عباس ثانی کی حکومت میں وہ مجلس نویس، کے عہدہ پر مامور

تھا۔ 1689ء میں وزیر ہو گیا۔ اسی عہدہ پر اٹھارہ سال تک کام کرتا رہا۔

ولی قلمی شاملو، طاہر وحید کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے اسلوب بیان کا پہلا استاد تھا۔ خود مصنف کا کہنا ہے کہ تاریخ جدید شاہ عباس ثانی کی فرمائش پر لکھی گئی، اس لیے یہ کتاب اس کے عہد کی سرکاری دستاویز ہے۔ تحریر کا سلسلہ 1656ء کی ابتدا تک جاتا ہے۔ آخری واقعہ جو اس کتاب میں بیان ہوا ہے اس زلزلے کا ذکر ہے جو اس وقت قزوین میں رونما ہوا۔

ایران کی عصری تاریخ کے لحاظ سے یہ کارنامہ بالکل قابل اعتماد ہے کیونکہ ان واقعات کے ہجوم میں جو مصنف نے بیان کیے ہیں زیادہ تر ایسے ہیں جن کا یا تو اس نے خود مشاہدہ کیا ہے یا تحریر کی بنیاد ان اطلاعات پر ہے جو دربار میں پیش ہوئیں۔ اس کے بعد کے جملہ موزخین نے ایران کی تاریخ لکھتے وقت اس کتاب سے استفادہ کیا۔ دو خاص عیب اس کتاب میں ہیں۔ ایک تو وہ عام عیب ہے جو اس نمونہ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے یعنی حکمران وقت کی جانب داری اور دوسرا عیب سال وماہ لکھنے کی کمی ہے۔ جس سے بیان کردہ واقعات غیر متعین ہو جاتے ہیں۔

چغتائی یا ہندوستانی مغلوں کی طرف مصنف کی توجہ قندہار کے معاملات سے شروع ہوتی ہے ان واقعات کے اندراج میں مصنف بڑی جانب داری سے کام لیتا ہے۔ علاوہ بریں اکثر وہ اس سلوک کا ذکر کرتا ہے جو ''شاہ'' نے نام نہاد شاہزادہ بلاقی اور اس کے چچازاد بھائی باسنقر کے ساتھ کیا تھا۔ یہ دونوں ہندوستان سے بھاگ کر وہاں پناہ گزین تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلاقی، شاہ ایران کو بہت عزیز تھا۔ کیونکہ وہ اکثر اس کو محفل جام و مینا میں شرکت کے لیے قزوین سے بلاتا تھا۔

قصاص الخاقانی

قصاص الخاقانی...... یہ تصنیف صفوی خاندان کی تاریخ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن اس میں شاہ صفی اور شاہ عباس ثانی کے دور حکومت کا بیان ہے۔ اس کا نام قصاص الخاقانی اس لیے پڑا کہ اس میں ''حضرت صاحبقران شاہ عباس ثانی کے

جنگی کارناموں کا ذکر ہے۔ یہ ان چند عصری دستاویزات میں سے ہے جو شاہ عباس ثانی کے دور حکومت کا مکمل بیان پیش کرتی ہے۔ کتاب کا وہ حصہ جو ہندوستان سے متعلق ہے اس کے لیے مصنف یعنی ولی قلی شاملو، مرزا طاہر وحید کا ممنون معلوم ہوتا ہے جس کے اقتباسات اس نے آزادی سے پیش کیے ہیں۔ لیکن واقعات کو حتی الامکان مکمل بنانے کے لیے وہ اپنے ذاتی معلومات سے بھی کام لیتا ہے۔

جانب داری کی جڑیں اس کے دماغ میں بُری طرح پیوست تھیں، اس امر واقعہ کو وہ چھپاتا بھی نہیں اور اسی نظریے کے تحت وہ ان واقعات پر ملمع کر دیتا ہے جن سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ اس کے سرپرست پر کوئی آنچ جائے گی۔ بلکہ کبھی کبھی ایسے واقعات ضبط تحریر میں لاتا ہی نہیں۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے وہ موقع باموقع، خطابت، شاعری، رنگینی سے کام لیتا ہے۔ قندھار کے واقعاتی بیان کے سلسلہ میں مصنف صاف صاف تسلیم کرتا ہے کہ وہ ہندوستانی مورخوں کی مبالغہ پسندی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ قصص لکھنے میں غالباً لطائف الاخبار نے اس کو قلم اٹھانے کا جذبہ دیا۔ شاہجہاں کی علالت کے بعد ہندوستان کے وہ واقعات بھی اس نے قلم بند کیے جو اس کے سننے میں آئے لیکن مراد سے اس کی جانب داری واضح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہزادے نے شاہ عباس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس نے اپنے شیعہ ہونے کا بھی قرار کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کو مصنف نے ایک بے ایمان سیاست داں کی صورت میں پیش کیا ہے کیونکہ اورنگ زیب نے مراد کو راہ راست سے منحرف کر دیا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ ساموگڑھ کی جنگ کے بعد بقول مصنف مراد آگرہ محاصرہ کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ اس نے اپنے بھائی کو رائے دی تھی کہ ہم دونوں باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کی معافی مانگ لیں۔ ولی قلی خان کی رائے میں اورنگ زیب کی دو عملی پالیسی میں اس کے عامل میر شیخ کا ہاتھ تھا۔

خلد بریں

خلد بریں...... یہ ایک مکمل تاریخ ہے صفوی خاندان کی۔ اس کا مصنف طاہر وحید کا چھوٹا بھائی ہے۔ اُس کا نام اس لیے نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ گم ہے اور اسی میں شاہ عباس اوّل اور اس کے پیش رو حکمرانوں کا کارنامہ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ شاہ صفی کی حکومت کا آخری دور تھا جب بہ حیثیت منشی مال گزاری کے محکمہ میں وہ ملازم ہوا۔ بعد ازاں جب محکمہ توپخانہ علاحدہ صورت میں قائم ہوا تو وہ اس کا وزیر بنادیا گیا۔ اس نے یہ کتاب 1701ء میں مکمل کی۔

وہ ایسے اعلیٰ مرتبہ پر مامور تھا جس نے اس کو بہترین موقع دیا ہوگا کہ اپنی معلومات کے لیے اصل ذرائع سے فائدہ اٹھا سکے بلکہ پیش کردہ واقعات کا مشاہدہ بذات خود کر سکے۔ لیکن اس عہدے کے دوسرے مصنفوں کی طرح غیر جانب داری کی نعمت سے وہ بھی محروم تھا۔ غالباً اس زمانے میں یہ خصوصیت قابل قدر نہ سمجھی جاتی تھی۔ شاہ صفی کے مفصل حالات کے سلسلہ میں غالباً یہ واحد عصری تاریخ ہے جو اس وقت مرتب ہوئی جب خون ریزی پر کوئی پشیمان نہ ہوتا تھا، قتل کرنا زمانہ کا عام دستور ہو گیا تھا۔ چنانچہ رائج الوقت بھیانک المیہ پر بجائے خوف وہراس کے اظہار کرنے کے مصنف اس کو جواز عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ ترکوں کی لڑائیوں کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کی جانب داری قریب قریب مجرمانہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایرانیوں کی شکست بھی وہ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ان پر فتح کا گمان ہونے لگتا ہے۔ شاہ عباس ثانی کے سلسلہ میں مصنف کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ وہ تاریخ کو 1660ء تک لایا ہے۔

خلد بریں میں ہم کو طاہر وحید کے یہاں سے زیادہ تفصیلی اطلاعات ملتی ہیں۔ مثلاً اُن شکوک کے وجوہات مصنف پوری طرح بیان کرتا ہے جو علی مردان خان کو شاہ صفی کے متعلق تھے۔ اور پوری تفصیل سے اس ترغیب کا بھی ذکر کرتا ہے

جو شاہ صفی نے قندھار کے ناظم کو ہموار کرنے کے لیے دی تھی۔ تاکہ وہی خونیں انجام اس کا بھی ہو جو اور بہت سے افسروں کا ہوا ہے۔ پھر مصنف بلاقی کی اس دعوت کا بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے جو دربار ایران میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اس پناہ گزین کی صحیح شناخت پر شک کرتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی جنگ وراثت کا بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اورنگ زیب کی عیاری پر زور دیتا ہے اور مراد کے ایلچی کا ایرانی دربار میں آنا بھی بیان کرتا ہے۔ اس تیاری کا بھی مذکور ہے جو شاہ نے اس کی اور بعدہٗ دارا کی امداد کے لیے کی تھی۔ دوسری غیر معروف مگر دلچسپ حقیقت جس کا ذکر آیا ہے وہ بلاقی کی مجوزہ اسکیم، ہندوستان کے تخت حاصل کرنے کی ہے وہ قزوین سے اصفہان اس لیے آیا کہ شاہ سے امداد کی درخواست کرے لیکن جب اس نے دارا کی قید کا واقعہ سنا تو خاموشی سے اپنی قیام گاہ واپس چلا گیا۔ باوجود سنگین معائب کے خلد بریں، تاریخ ایران اور بالخصوص شاہ صفی اور عباس ثانی کے دور کے مطالعہ کے لیے بڑی کار آمد سند ہے۔ ابھی تک یہ مطالعہ موجودہ اہل قلم کی توجہ سے بہت کم سیراب ہوا ہے۔ اگرچہ تاریخ وار اندراج بعض مقامات پر بڑا مبہم ہے پھر بھی بہت کار آمد ہے کیونکہ طاہر وحید کی تصنیف سے مل کر یہ شک وشبہہ دور جاتا ہے بلکہ بیانات قطعی اور واضح ہو جاتے ہیں۔

زبدۃالتواریخ

یہ ایک ایسی عام تاریخ ہے جو حضرت نوح کے زمانے سے شروع ہو کر شاہ عباس ثانی کے عہد تک پہنچتی ہے۔ جو حصے برٹش میوزیم کے مجموعہ نمبر 2060 میں محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی ایسا عام اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے اس کتاب کی افادیت یا نقص کا اندازہ ہو سکے۔ اس کا مولف کمال خان بن جلال اپنے کو ایرانی دربار کا خانہ زاد کہتا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے سپہ سالار رستم خان کے ساتھ جارجیہ کی مہم (32-1631) میں گیا تھا۔ اس کے بعد جب قندھار میں بھیجے گئے

افسروں نے ایک جوتشی کی خدمات کا مطالبہ کیا (49-1648) تو بادشاہ کی نظر انتخاب مصنف ہی پر پڑی، اس طرح وہ دربار سے پوری طرح قریب ہوتا گیا۔ چنانچہ عصری واقعات کا علم اسے ذاتی طور پر ہوتا رہا۔ اس کی کتاب میں صفی کے عہد حکومت کے عام نظم و نسق کا بیان صفائی اور سادگی سے ادا ہوا ہے۔ لیکن قندھار کے محاصرہ کا ذکر بہت مختصر ہے۔ دربار ایران میں بلاقی کی آمد و استقبال کا ذکر بھی اس نے کیا ہے۔

روزنامچے اور عصری مراسلات

چار کتابیں جن کو ڈائری کہا جاسکتا ہے۔ قابل ذکر ہیں۔ (1) صبح صادق بن محمد صالح میں اُن فقرا، علما، شعرا اور فلسفیوں کا ذکر ہے جن سے مصنف کی ملاقات گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال، بہار اور دکن کے دوران قیام میں ہوئیں۔

(2) طبقات شاہ جہانی

مصنفہ صادق خان یہ ایک قسم کی بیاض ہے کیونکہ اس میں تیمور کے زمانے سے شاہجہاں کے ابتدائی عہد حکومت تک کے شعرا اور فلسفیوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ آخری حصہ میں مصنف نے اپنے ذاتی علم سے بہت واضح طور پر اپنے زمانے کے ان مشاہیر کا ذکر کیا ہے جن سے اس کو ملنے کا اتفاق ہوا۔ طبقات کے منتشر اندراجات سے ہندوستان کی 17ویں صدی کے طریق تعلیم سے ہم کو واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

(3) عرضداشت

یہ کارنامہ مجموعہ ہے ان خطوط کا جو سید خان جہاں نے دربار کو لکھے۔ اس کے آخر میں تین مختصر خاکے شیخ جلال الدین حصاری نے شامل کر دیے ہیں۔ آخر الذکر سید کا اخبار نویس تھا۔ ان میں سے ایک خاکہ گوالیار کی ایک ایسی تاریخ ہے جو ایک ہندی کتاب کی بنیاد پر ہے۔ یہ کتاب ایک برہمن مسمّٰی شیام کے قبضے میں پائی گئی۔ شیام کے بزرگوار اس جگہ کے پرانے باشندے تھے۔ دوسرا خاکہ جھجھار

سنگھ کی بغاوت کا ہے جس کے فرو کرنے میں خان جہاں نے نمایاں حصہ لیا۔ شیخ جلال بندیلوں کی ابتدا بیان کرنے میں خیال آرائی سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ان کے آباواجداد بوندی سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ اس خاندان نے جو بستی بسائی وہ اپنے پرانے وطن کے نام پر تھی۔ تیسرا خاکہ سید خان جہاں کے نور پور کی مہم کا بیان ہے۔ شیخ جلال کے ایک شاگرد بال کرشن نے جو خطوط فراہم کیے وہ بیر سنگھ دیو کے خاندان کے زوال سے متعلق ہیں۔ بعض اہم اطلاعات فراہم کرتے ہیں جن کا تعلق چمپت رائے کی تگ ودو سے ہے۔

(4) لطائف الاخبار: مصنفہ بدیع الزماں رشید خان

شہزادہ داراشکوہ کی قندھار کی مہم کا یہ ایک جریدہ ہے۔ دیباچہ میں مصنف ایک مختصر بیان اورنگ زیب کی دو سابقہ مہمات رقم کرتا ہے۔ یہ تحریر قندھار کے روز مرہ واقعات کا سیدھا سادا بیان ہے۔ مصنف نے اپنے دوستوں کے لیے یہ حالات قلم بند کیے تھے، کسی سرپرست کو خوش کرنے کے خیال سے نہیں۔ اسی لیے وہ صاف گو اور قابل اعتماد ہے، بدیع الزماں کو دارا کا طرفدار سمجھنا غلط ہے بلکہ برخلاف اس کے وہ آزادی سے اس کی ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی کا ذکر کرتا ہے کیونکہ دارا نے زرکثیر صرف کر کے ایسے فقرا سے دعا کرنے کی درخواست کی جو زیادہ تر فریبی وعیار تھے۔ بدیع الزمان کے نزدیک دارا کی شکست کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے میر آتش، جعفر خان پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر لیا۔ اور خود مصروف کار نہیں رہا۔ اس رویے نے تجربہ کار افسروں مثلاً جے سنگھ اور قلیچ خان کو شہزادہ سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے علاوہ مصنف ان شاہی افسروں کی اس شیخی بازی کا بھی ذکر کرتا ہے جو قندھار کی جنگ سے پہلے وہ کیا کرتے تھے۔ دارا کے نابالغ لڑکے سلیمان شکوہ نے قندھار کا فرضی قلعہ بنایا اس کا محاصرہ بھی کیا اور فتح بھی کر لیا۔ جعفر خان نے کہا کہ صاحبزادے کی نظر قندھار فتح کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن چتر سال نے طنزیہ جواب دیا "اگر تم کوا

ہو جاؤاور اس کی طرح پرواز کی کوشش کرو تو اندیشہ یہ ہے کہ قبل اس کے قلعہ پر نظر ڈالو تم کو مار کر گرادیا جائے"۔

عصری مراسلات کے حسب ذیل 8 مجموعے بڑی کار آمد کتاب بن جاتے ہیں۔ اس وقت کی تاریخ پر قابل قدر روشنی پڑتی ہے۔

1۔ عنایت نامہ۔ مصنفہ عنایت خان راسخ ولد شمس الدین لطف اللہ خان جس نے یہ مجموعہ 49 سال کے سن میں مرتب کیا۔ وہ شاکر خان کا بھائی تھا۔ شاکر خان محمد شاہ اور اس کے جانشینوں کی تاریخ کا مصنف ہے۔

2۔ جامع الانشاء

3۔ جامع المراسلات فی الالباب

4۔ مراسلات قطب شاہی:...... خطوط نظام الملک حاجی عبداللہ منجانب عبداللہ قطب شاہ وابوالحسن بنام شاہجہاں، دارا، اورنگ زیب، شجاع اور عادل شاہ بیجاپوری۔

5۔ منشیات طاہر وحید۔

6۔ بہار سخن:...... اس کے مصنف محمد صالح، کمبوہ نے ان خطوط کو جمع کرنا شروع کیا جو شاہجہاں نے اورنگ زیب اور حکمراں ایران وماوراالنہر کو لکھے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خطوط بھی ہیں جو دربار کے دوسرے افسروں نے لکھے۔ یہ سلسلہ مولانا ابوالبرکات منیر کے انتقال کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ کیونکہ انہوں نے اس مجموعہ کا دیباچہ لکھنے کو کہا تھا۔ اس کام کو مکمل کرنے کے بعد محمد صالح نے نظر ثانی کے لیے مولانا ابوالفتح ملتانی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کتاب میں چار چمن ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے زیادہ اہم اورنگ زیب کا وہ خط ہے جو اس نے عبدالعزیز خان ماوراء النہری کو لکھا تھا۔ اس میں اس نے اپنی فتح کی خبر آخر الذکر کو دی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دارا کے قتل کو جائز قرار

دیا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک دارالمحد تھا۔ دوسرا چمن ذاتی خطوط پر مشتمل ہے، تیسرے میں مصنف کی وہ تصنیف ہے جس میں شاہجہاں آباد (دہلی) لاہور، اکبر آباد (آگرہ) کشمیر اور درباری تقریبات، قلعہ آگرہ کی آرائش۔ شاہجہاں کے سیم وزر میں تولے جانے کی رسم، قلم بند کی گئی ہے۔ چوتھا چمن ان مختلف خطوط کا مجموعہ ہے جو سرکاری عہدہ داروں کو لکھے گئے تھے۔

7۔ چار چمن: ..... یہ کارنامہ منشی الزماں چندر بھان کا ہے جس کا ذکر 10ویں باب میں آیا ہے۔

8۔ آداب عالم گیری:۔ یہ مجموعہ ہے ان خطوط کا جو قابل خان نے اورنگ زیب کی طرف سے لکھے تھے۔ ان خطوط سے شہزادے کے کردار کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے حوصلے اور جذبات کا صحیح انکشاف ہوتا ہے۔

جب اورنگ زیب دکن میں نائب سلطان تھا تو اپنے باپ کو برابر خط لکھا کرتا تھا اور ہر خط میں درازی عمر اور خوشحالی کی دعا کرتا تھا۔ خدا نے درازی عمر سے تو شاہجہاں کو سرفراز کیا لیکن اس کی خوشحالی اس کی معزولی کے بعد ختم ہو گئی۔ ان مراسلات سے ایک دلچسپ بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاہجہاں کو دکنی آموں سے بڑی رغبت تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب کو لکھا کرتا تھا کہ آم بھیجنے کی ایک مسلسل رسد قائم رکھی جائے۔

مغربی سیاح

17ویں صدی کے نصف اوّل میں کافی بڑی تعداد میں مغربی سیاح ہندوستان آئے اور اس ملک میں جو کچھ ان کے علم و عمل میں آیا قلم بند کر دیا۔ لیکن بد قسمتی سے ان کے بیانات پر اس بات کا اثر ہے کہ وہ اپنے قارئین کی قیاس

آرائی کو آسودہ کرنے کی فکر میں رہتے۔ علاوہ بریں ان میں سے اکثر سیاحوں کو اپنی قومی برتری کا وہم تھا اس لیے وہ اس قابل نہ تھے کہ جن اداروں کا ذکر کرتے ان کا مناسب جائزہ لے سکتے۔ ہندوستانیوں کے لیے وحشی، کا عام لقب ان کی زبان زد تھا۔ یہی ایک بات ان کی زبان زد تھی۔ یہی ایک بات ان کی تنگ خیالی کی واضح دلیل ہے۔ ان سیاحوں میں بعض نیم تعلیم یافتہ اور نااہل تھے۔ وہ نہ صحیح زاویہ نظر سے کام لے سکتے تھے نہ اپنے بیانات صحیح طور سے قلمبند کر سکتے تھے، نہ اختصار سے کام لے سکتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کو مستند سیاسی اطلاعات کی آگاہی نہ تھی اس لیے انہوں نے افواہ اور بازاری خبروں کا قلمبند کرنا کافی سمجھا۔ ان میں سے جو سیاح اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور بلند خاندانوں سے وابستہ تھے ان میں ایک دوسرے قسم کا سخت عیب نظر آتا ہے، یہ لوگ مغل حکومت اور ہندوستانی اداروں کو ان مثالی نظام سلطنت کی کسوٹی پر پرکھتے جو ان کے ذہن میں پہلے سے تھی۔ اور جب نتیجہ ان کی امیدوں سے کم نظر آتا تو معائب کو زیادہ اہمیت دیتے اور محاسن کو نظر انداز کر دیتے۔ ان باتوں نے میرے ذہن کو مشکوک کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان سیاحوں کا بیان صداقت سے دور ہے۔ اس لیے عہد متوسط کے سیاسی یا سماجی اداروں پر ان کی تنقید میرے لیے قابل قبول نہیں۔ علاوہ بریں دور متوسط کے اداروں کا موجودہ اداراں سے مقابلہ کرنا اور یہ نتیجہ نکالنا کہ آخر الذکر ادارے اوّل الذکر سے برتر ہیں۔ حالانکہ یہ رویہ عہد حاضر کے اُن بہت سے اہل قلم کا ہے جو مغربی سیاحوں کے اشاروں کنایوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ نہ صرف غلط ہے بلکہ اصول ارتقاء کے اعتقاد میں ضعف کا بھی ثبوت ہے۔

قبل اس کے کہ فرداً فرداً سیاح کے ان کارناموں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شائع شدہ دستاویزات کا ذکر کر دیا جائے جو اطلاعات کا مخزن ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی

دستاویزات کو مرتب کر کے ولیم فاسٹر نے ہندوستان کی تاریخ نویسی کی بڑی خدمت کی ہے۔ دو سلسلے مطبوعات ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات (17-1602) اور "ہندوستان میں انگریزی کارخانے" (56-1618) علاوہ ہندوستان میں انگریزی تجارت کی نشو و نما پر روشنی ڈالنے کے اکثر اپنے زمانے کے سیاسی واقعات کی بھی کار آمد اطلاعات پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سورت کے کارخانے کے نگراں نے جو روز مرہ کے خطوط انگلستان بھیجے بڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن ان کے مندرجات کو احتیاط سے قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ بعض اوقات گپ اور افواہ کو بھی ان میں جگہ دی گئی ہے۔ گو اس کے پس پشت شر انگریز ارادہ نہیں معلوم ہوتا۔

سر ٹامس رو

دربار جہانگیر میں ابتدائی سیاحوں کی فہرست میں سر ٹامس رو کا نام بہت نمایاں ہے۔ اپنی ڈائری میں وہ شہزادے خرم کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے کردار، شکل وشباہت کی مرقع کشی کرتا ہے۔ چونکہ گجرات شہزادہ خرم کی جاگیر تھا اس لیے قدرتی طور پر سر ٹامس رو کو اس سے رابطہ قائم کرنے کا بہت موقع ملا۔ لیکن یہ انگریزی سفیر ہر موقع و محل پر اپنی من مانی بات پوری نہ کر سکتا، اس لیے کہ وہ ترش رو بھی ہو جاتا اور مغل حکومت کی نامناسب تصویر پیش کرتا ہے۔ بایں ہمہ مغل دربار کی جتھابندی کا بیان بہت دلچسپ ہے۔

پلسارٹ[1]

فرانکوس پلسمارٹ دسمبر 1620ء میں ہندوستان بحیثیت گماشتہ ڈچ فیکٹری آیا۔ دوران قیام وہ زیادہ تر آگرہ میں رہا۔ یہاں سے وہ 1627ء کے اواخر میں ہالینڈ واپس گیا۔ اس کی کتاب "ری[2] مانسٹران ٹی" اس کے سات سالہ تجربات کا دفتر ہے۔ اس نے آگرہ، لاہور، کشمیر، برہان پور کا ذکر کیا ہے شاید ان شہروں میں خود

(1) Pelsaert (2) Remmstrantee

گیا تھا۔ وہ خسرو کے قتل کا ذمہ دار شہزادہ خرم کو ٹھہراتا ہے۔ نور جہاں کی بالادستی کی سخت مذمت کرتا ہے۔ ضلع کی عدالتوں اور گاؤ کشی بند کرنے کے بیانات بھی دلچسپ ہیں۔ سرکاری طور پر اس گاؤ کشی کی بندش کو وہ گورنمنٹ کے اس احترام سے منسوب کرتا ہے جو ہندوؤں کے جذبات سے وابستہ تھا اور اس میں یہ اقتصادی پہلو بھی تھا کہ بیلوں سے یہاں وہ ہر کام لیا جاتا ہے جو ہالینڈ میں گھوڑوں سے لیا جاتا ہے۔

ڈی لا یٹ[1]

سچ پوچھئے تو ڈی لا یٹ یوروپ سے آنے والے سیاحوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ ہندوستان کبھی نہیں آیا اس کا کام صرف کاغذات کا مرتب کر دینا تھا۔ اس کے اس کام کا ترجمہ Hoyland اور Banesji نے کیا ہے۔ اس کے آخر میں شہزادہ شاہجہاں کی بغاوت، جہانگیر کی موت اور شاہجہاں کی تخت نشینی کا بیان الجھا ہوا ہے۔

پیٹرو ڈِی[2] لاویل

اٹلی کا ایک اچھا تعلیم یافتہ باشندہ تھا۔ یہ 10/ فروری 1623ء میں شہر سورت آیا۔ اپنے چار سالہ قیام میں اس نے دکن کے خاص خاص شہروں کی سیر کی۔ اس نے دیانت داری سے وہ واقعات رقم کیے جو اس کے دیکھنے میں آئے۔ اس نے صدق دل سے ایمان دار رہنے کی کوشش کی۔ اس کا تاریخی بیان بڑی حد تک صحیح ہے۔ البتہ بابر کی مہمات کا بیان خالی ہے۔ بابر کا نام اس نے نہیں لیا۔ یہی حال خرم کی بغاوت کے اسباب کا ہے۔ اس بیان میں بھی اس نے قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ علاوہ بریں اس کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ قطب شاہ نے باغی شہزادے کی مدد اس لیے نہیں کی کہ اس پر جہانگیر کا خوف طاری تھا۔ خرم سے آصف خان کی جانب داری کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ پلسارٹ کی طرح وہ بھی خسرو کے قتل کا

---

(1) De laet

(2) Pietrodellwvalle

ذمہ دار خرم کو قرار دیتا ہے۔ مغل حکومت میں آزادی خیال کا بھی ذکر اس نے کیا ہے اور ہندوؤں کے جذبات کے احترام میں کا ہے کی گاؤکشی بند کرنے کا بھی بیان ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے دور کے انتظامات کا ذکر زیادہ نہیں کیا لیکن ان شہروں اور قصبات کے چشم دید بیانات بہت واضح ہیں۔

سر ٹامس ہربرٹ

مغلیہ سلطنت کی تاریخ نویسی کا حق سر ٹامس ہربرٹ کو صرف اس لیے دیا جاسکتا ہے کہ ایک قلیل وقفہ کے لیے سرزمین ہند پر وہ قیام پذیر تھا۔ وہ اپنی تاریخی تحریر کی ابتداء عہد تیمور سے کرتا ہے۔ تیمور کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ سلطان بایزید کے قید خانہ کا داروغہ تھا۔ بیانات کا سلسلہ شاہجہاں کی تخت نشینی تک چلتا ہے۔ اکبر و جہانگیر کی حکومت کا بیان کتاب کے بہت بڑے حصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی اہم واقعہ نظر انداز نہیں ہوا لیکن مصنف تو تاریخی سلسلہ کا خیال کرتا ہے نہ واقعات کی علت و معلول کا۔ ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات وہ زبردست جغرافیائی غلطی کا مرتکب نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں غلطیوں کو چھپانے کے لیے وہ اپنے طرز بیان کی دلکشی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھی خسرو کے قتل کا مجرم شہزادہ خرم کو قرار دیتا ہے اور باپ سے بغاوت کرنے کے سلسلے میں شاہجہاں پر غلط الزامات کا اضافہ کرتا ہے۔ اس نے بہت صحیح عبداللہ خان فیروز جنگ کو ہندوستان کا باد پیما کہا ہے۔ لیکن بنگال میں شاہجہاں کی کارگزاری کا بیان بہت الجھا ہوا ہے۔

مینڈلسلو[1]

جان البرٹ وان مینڈلسلو ایک نوجوان جرمن تھا جو اپنے دوستوں سے الگ ہو کر اپریل 1638ء میں سورت آیا۔ اس کے دوست ڈیوک آف ہوسٹین سفیر برائے ایران تھے۔ سال کے اواخر میں اس نے شمالی ملک کا دورہ شروع کیا۔ احمد،

(1) Mandelslo

کمبے، آگرہ اور لاہور کی سیر کی۔ اس نے جنوری 1639ء میں سورت کو خیر باد کہا۔ اپنے سفر کی ابتدا سے بارہ مہینے کے اندر ڈوور[1] واپس گیا۔ اُلیریس[2] نے مینڈلسلو کے سارے اندراجات 1658ء میں شائع کیے۔ چار سال بعد اس کا فرانسیسی ترجمہ ابراہم ڈی وکفورٹ نے شائع کیا۔ ولیم فارسٹر کی رائے میں آخر الذکر نے اصل مسودہ میں کافی ردّو بدل کیا۔ اسی مسخ شدہ نسخے کا ترجمہ جان ڈے وس[3] نے انگریزی میں کیا۔ اس سے بہتر اور زیادہ صحیح نسخہ کی عدم موجودگی میں مجبوراً اسی انگریزی ترجمہ کو غنیمت سمجھ کر میں نے مطالعہ کیا۔

مینڈلسلو نے مغلیہ نظم و نسق کا تفصیلی بیان سپرد قلم کیا ہے اس کے بعض بیانات قیاس آرائی کے نتیجے ہیں اور بعض میں حقیقت کی جھلک ہے۔ اس نے شہر آگرہ اور قلعہ کا ذکر کیا ہے۔ جشن نوروز اور تولے جانے کی رسم کے بھی حوالے دیئے ہیں۔ تعزیہ کی ابتدا اس نے غلط بیان کی ہے۔ (امام حسن اور امام حسین کی قبروں کی نقلی صورت۔ امام حسین کی شہادت کربلا کی لڑائی میں ہوئی) اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ جلوس نکلنے پر کسی ہندو کو گلی کوچے میں آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ اس کے آگے لکھتا ہے کہ شاہجہاں نے بلاقی سے تخت چھین لیا تھا۔ بلاقی کو مینڈلسلو نے قزوین میں دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی اپنے بیان میں کہا ہے کہ شاہجہاں کو برہنہ رقص بہت پسند تھا۔

پیٹر منڈی

پیٹر منڈی 1628ء میں سوت پہنچا اور 1630ء میں آگرہ فیکٹری میں ملازم ہوا۔ ہندوستان کے ہشت سالہ قیام میں اس نے مالوہ، موجودہ اترپردیش اور بہار کے متعدد شہر دیکھے۔ اس کے بیان میں ایسے حوالے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے صحیح نظریہ سے ہندوستان کے بعض ایسے خاص سماجی اور ایسے عجیب و

(1) Dover
(2) Olearius
(3) Johnn Davis

غریب ہندو سماجی و مذہبی مراسم دیکھنے کی کوشش کی جو دوسرے سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکے۔

منجملہ عام دلچسپ موضوعات کے جو اس کے بیان میں آئے ہیں ان میں حسب ذیل کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ گوالیار محل، فاصلہ کی پیمائش کا طریقہ ہندوستانی حجاموں کی مالش میں ہنرمندی، پان، بہنگی، بھاری چیزیں اٹھاکر لے جانے کے واسطے لمبا بانس اور اسی سے ملتی جلتی دوسری باتیں۔ آگرہ، اس کے بازار اور مکانات کا بیان واضح اور دلچسپ ہے۔

اس نے بادشاہ اور دربار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ہاتھیوں کی لڑائی چیتا کا شکار، جنگلی ہاتھیوں کا پکڑنا، بقر عید میں بادشاہ کا جلوس، دارا اور شجاع کی شادیاں، نوروز اور مینا بازار سب کا بیان اس کے یہاں ملتا ہے۔ وہ فتح پور سیکری کا تقابل مغربی شہروں سے عمارت کی مناسبت کے لحاظ سے کرتا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ مغلیہ بادشاہ بجز دریائے گنگا کے پانی کے اور کہیں کا پانی نہ پیتے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ شاہی دربار میں برہمن اور مسلمان جوتشی جمع ہیں کیونکہ بادشاہ کی توہم پرستی شگون نیک و بد سے ہمکنار تھی۔

عصری سیاسی واقعات میں بلخ میں فریبی باتسنغر کا قصہ شاہجہاں کے حکم سے بنارس کے مندروں کا گرانا، آصف خان اور مہابت خان کا معزز مرتبہ عبداللہ خان فیروز جنگ کی ہوس ناکی اور ظلم پرستی، شاہجہاں کی دکنی مہمات، مہابت خان کا تقرر، دولت آباد فتح کرنے کے لیے ان سب کا بیان مصنف کے یہاں ملتا ہے۔ مصنف کچھ ایسے واقعات بھی بیان کرتا ہے جو شاہجہاں کی تخت نشینی سے پہلے ہوئے تھے مثلاً خسرو کا قتل، نورجہاں کا اپنے داماد کے لیے تخت و تاج حاصل کرنے کی کوشش اور اس کے محرکات میں آصف خان کی خلل اندازی لیکن سلیم شاہ اور شیر شاہ کی حکومت کے بیانات مایوس کن ہیں۔ اس کا یہ بیان بھی مہمل ہے کہ نورجہاں شاہ جہان کی ماں تھی۔ اس طرح اس کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ

جہانگیر نے اپنا جانشین بلاقی کو بنایا تھا۔ یہ قیاس آرائی بازاری خبروں کا نتیجہ ہے۔ مغل طرز حکومت پر اس کا بیان غلط مبحث کا نمونہ ہے لیکن 1630ء کے قحط کی تصویر کشی اور لوگوں کی پریشانی کا ذکر بہت پُر اثر ہے۔

مان ریکو[1]

اپر[2] ٹو کا ایک پرتگالی باشندہ مان ریکو 1629ء میں بنگال مشن سے وابستہ ہوا۔ بعد میں چھ سال وہ ارکان میں رہا۔ اس نے تین سال (40-1637ء) فلپائن و چین کی طولانی سیاحت میں صرف کیے۔ (41-1640ء) میں یوروپ جاتے ہوئے شمالی ہندوستان پہنچ کر اس نے ڈھاکہ سے قندہار کا سفر کیا۔ 1643ء میں وہ روم پہنچا اور اپنی تصنیف آئی ٹے نی رے ریو (Itenerario) 1649ء میں شائع کی۔ 1669ء میں وہ قتل ہوا۔

اس کی تصنیف کا بڑا حصہ ارکان سے متعلق ہے۔ صحت کے ساتھ، عصری معاشی زندگی کی تصویر کشی نے اس کے بیان کو بے حد قیمتی بنادیا ہے، باوجود ایک مشنری اور رومن کیتھولک ہونے کے وہ بے لوث ہو کر مشرقی تہذیب کے اچھے عناصر کی تعریف کرتا ہے۔ دوسرے متعدد عصری سیاحوں کی طرح وہ مغربی تعصب کا ثبوت نہیں دیتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ہماری معلومات میں زیادہ اضافہ نہیں کرتا لیکن اس کے ذاتی تجربات جو اس کی پوری کتاب میں رواں دواں ہیں کتاب کی اہمیت بڑھا دیتے ہیں۔

شمالی ہند میں لوگوں کی خوش حالی، زمین کی زرخیزی، سامان خورد و نوش کی ارزانی، اس کے لیے باعث حیرت ہے۔ وہ ہندوستانیوں کے شطرنج کھیلنے کی دانائی اور آم کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ مغل فوج کی تنظیم و ترتیب کی بڑی داد دیتا ہے۔ ارکان کی عوامی تعلیم جو عبادت گاہوں اور خانقاہوں تک مرکوز تھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ مغلوں کی عیش پرستی کا بیان بالکل صحیح

---

(1) Manrique (2) Oporto

ہے۔ جس شہر میں اس نے قدم رکھے اس کا بیان تفصیل سے لکھا۔ مصنف کے مغلیہ شہنشاہ کے سیم وزر میں تولے جانے کی رسم، مغل دربار اور تاج محل کی بنتی ہوئی عمارت کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ تاج محل کی نقشہ سازی اس نے جرمینو ویرونیو[1] سے منسوب کی ہے۔

عصری سیاسی واقعات کا ذکر مان ریکو نے بہت کم کیا ہے۔ قندھار کی سپردگی اور ناظم فرح کی قندھار واپس لینے کی افواہی کوشش کا بھی بیان ہے۔ اس نے آصف خان کے بے پناہ اثر کا بھی ذکر کیا ہے، اس کو Secundur De Rege کہتا ہے۔ مرزا رستم صفوی کی لڑکی سے شجاع کی شادی کا بھی تذکرہ اس نے کیا ہے۔

مان ریکو جب ان تاریخی واقعات کا بیان کرتا ہے جس سے اس کو ذاتی واقفیت نہیں تو اوروں کی طرح وہ بھی حقیقت وافسانہ کا مخلوط نمونہ پیش کرتا ہے۔ ان باتوں کا مثالی نمونہ شاہجہاں کی بغاوت کا بیان ہے اس کے یہاں ہگلی کی تسخیر کا ذکر صرف اتنا ہی ملتا ہے جو اس نے فادر ڈی کرسٹو کے قصہ میں بیان کیا ہے۔ یہ شخص 9 سال تک آگرہ کے قید خانہ میں تھا، لیکن مان ریکو جب اراکان کا بیان کرتا ہے تو کچھ ہلکی روشنی ان پرتگالی محرکات پر پڑتی ہے جو مغل بادشاہ کے حملہ کرنے کا سبب بن گئیں۔ مغل سرکار کا بیان اس نے ڈی[2] لیٹ کے یہاں سے نقل کیا ہے۔

رچرڈ[3] ڈبل اور جان کمپ[4] بل

رچرڈ بل اور جان کمپ بل کے سفر ناموں کو دوبارہ سر رچرڈ ٹمپل نے برٹش میوزیم کے سلوان[5] مجموعہ نمبر 811، ہندوستانی آثار قدیمہ (1906-8) میں شائع کیا۔ مدیر کا کہنا ہے کہ Bell کو زبانی بول کر لکھایا گیا تھا۔ جان بل کے لکھے ہوئے واقعات کو زبانی کہے جانے والی داستان کی صورت میں لانے کے لیے حیرت

---

(1) Germino Veroneo.
(2) De Leat.
(3) Richard Bell
(4) John Compbell
(5) Sloon Collelion

انگیز طریقہ پر توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ جن واقعات کو جان کمپ بل نے چشم دید بتایا ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے مضحک ہو گئے ہیں۔ مثلاً مراد کو شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا بتایا گیا ہے اور اورنگ زیب کو سب سے چھوٹا۔ جنگ وراثت کا سارا بیان مخلوط و ناقابل فہم ہے۔ کچھ ایسے دعوے بھی ہیں جو صریحاً غلط ہیں۔ مثلاً مراد کو اورنگ زیب کے حکم سے کچل کر مار ڈالا گیا اور شاہجہاں معزولی کے وقت 130 سال کا تھا، حالانکہ کمپ بل جب دارا کا ہاتھی سے جنگ میں اتر آنے کا قصہ دُہراتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ کسی معزز شخص کے کہنے سے ہاتھی سے اتر پڑا تھا اور یہی حادثہ اس کی موت کا باعث ہوا۔ اسی طرح وہ اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے جب اورنگ زیب کے سفیر سے شاہ ایران نے بہ نظر حقارت پوچھا تھا کہ اورنگ زیب اپنے آپ کو عالم گیر کیوں کہتا ہے۔ نہ اس نے ترکوں کو فتح کیا نہ عیسائیوں کو، اس نے صرف اپنے باپ کو قید کیا اور خاندان کو برباد کیا۔ قندھار کا بیان دلچسپ ہے۔

برنیر[1]

مغربی سیاحوں میں جنہوں نے مشرق کے متعلق کچھ لکھا ہے اس میں برنیر کا بیان سب سے زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ فلسطین، شام اور مصر بھی گیا تھا۔ یہاں آنے کے لیے قاہرہ سے بحری سفر کرتا ہوا 1658ء کے اواخر میں روانہ ہوا۔ ابھی وہ آگرہ نہ پہنچا تھا کہ احمد آباد کے قریب دارا سے ملاقات ہو گئی۔ دارا کو دیورائے (متصل اجمیر) میں شکست ہوئی تھی۔ پسپا ہو کر وہ گجرات چلا گیا تھا۔ ہندوستان میں اپنے قیام کی مدت برنیر نے 12 سال بتائی ہے۔ اس زمانہ میں اس نے لاہور، کشمیر، راج محل، قاسم بازار، مسولی پٹم اور گول کنڈہ کی سیر کی۔ یہیں اس نے شاہجہاں کے انتقال کی خبر سنی۔ ایران سفر کرتا ہوا 1669ء میں وہ مارسلیز پہنچا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے اپنی کتاب شائع کی، اور 1688ء میں مر گیا۔

---

(1) Bernier.

دہلی میں دانشمند خان نے اس کی سرپرستی کی۔ دانشمند خان دربار کا سر برآوردہ منصب دار تھا۔ برنیر نے کبھی کبھی اپنی معلومات کے ذرائع کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً دھرمات کی لڑائی کا حال اورنگ زیب کے ایک ایسے فرانسیسی توپچی سے اس نے سنا، جو اس کی ملازمت میں تھا۔ شجاع کی قسمت کے آخری فیصلہ کا حال اس نے پرتگالیوں، مسلمانوں، اور ڈچ کے باشندوں سے سنا جو بنگال میں موجود تھے، مغل حرم سرا کا تذکرہ خواجہ سراؤں کے بیانات پر مبنی ہے۔ اس نے اُن مغربی تجار سے بھی مشورے کیے جو عرصہ دراز سے یہاں تھے۔ ان کے علاوہ سفیروں، مشیر کاروں اور ترجمانوں سے بھی اس نے حالات معلوم کیے۔

اس کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس نے مغل دربار، اس کی رُوداد، وزندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بہت سے ذرائع استعمال کیے مگر پھر بھی اس کی بیان کردہ معلومات سب کی سب ذاتی نہ تھیں۔ علاوہ بریں چونکہ وہ نہایت مہذب آدمی تھا۔ اس کے لیے بعض اوقات یہ ممکن نہ ہوا کہ مثالیت اور حقیقت کو علاحدہ علاحدہ رکھ سکتا۔ مغلیہ گورنروں کے مظالم اور شخصی سلطنت کے معائب کا دلچسپی سے بیان کرنا اس قسم کی مثالیں ہیں۔ فطرتاً وہ ایسے نتیجے بھی نکالتا ہے جن کی تائید اس کے دوسرے ہمعصروں کے بیان سے نہیں ہوتی۔ اس کو فرانسیسی اداروں کی برتری کا وہم بھی تھا۔

بایں ہمہ جنگ وراثت کا بیان نہایت واضح ہے۔ حالانکہ اس کی جہاں آرا کی کردار نگاری بعید از قیاس ہے۔ اس نے دہلی میں دارا کی تشہیر بہ چشم خود دیکھی تھی۔ سلیمان شکوہ کا دربار میں پہنچنا بھی اس نے بیان کیا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے قیدی باپ کو قلعہ کے اندر پوری آزادی دے رکھی تھی، اگرچہ یہ بیان منوچی کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ دور شاہجہاں کے سیاسی واقعات کے سلسلہ میں ہگلی اور تبت کوچک کی فتح، مندروں کے گرائے جانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کی فوجی تنظیم کی خامیوں پر اس کی رائے صحیح ہے

لیکن فوج کی تعداد کا بیان قابل اعتماد نہیں۔ دہلی، آگرہ، کشمیر کا بیان دلچسپ ہے۔ تاج محل کو جو اس نے خراج عقیدت پیش کیا ہے، تاج محل اس تعریف کا مستحق بھی ہے۔

ٹیورنیر[1]

ٹیورنیر کو جہاں گرد لوگوں کا شہزادہ کہہ سکتے ہیں۔ 21 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے فرانس، انگلستان، ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، ہنگری اور اطالیہ کے بہترین حصے دیکھ لیے تھے۔ یوروپ کی زبانوں کا اسے اچھا خاصا علم تھا۔ مشرق کے 6 سفروں نے اسے تاریخ میں مشہور کر دیا، پہلی بار 1640ء میں ہندوستان آیا اور بعد کے متعدد سفروں میں اس ملک کا کافی بڑا حصہ دیکھ لیا۔ برنیر[2] سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے بنگال کا سفر بھی کیا۔ اپنے سفر نامہ کے لیے وہ اس رفیق کار، اور ہم وطن کا ممنون ہے۔

ٹیورنیر کا روزنامچہ اس وقت کی تجارتی تاریخ کے لیے اہم ہے۔ سڑکوں اور شاہراہوں کا بیان بھی معاشرتی زندگی کے اتفاقیہ بیانات کی طرح بڑا دلچسپ ہے۔ سیاسی تاریخ کا باب، افسانہ و حقیقت کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ شاہجہاں نے عیاری سے تخت حاصل کیا، جن امراء اور شہزادوں سے وہ بدگمان تھا ان لوگوں کو گوالیار میں قید رکھا لیکن ان کو اپنی جائداد سے روپیہ حاصل کرنے کی اجازت تھی، دولت آباد کی تسخیر خیالی ہے۔ جنگ وراثت کا بیان شاید برنیر کی نقالی ہے۔ لیکن میر جملہ کے معملات اور قطب شاہ کی لڑکی سے سلطان محمد کی شادی کا بیان اس نے کافی صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ شاہجہاں کی بغاوت کا بیان قطعاً غیر معتبر ہے، اس کی وجہ غالباً اس کی لاعلمی ہے۔ لیکن شہنشاہ کے بیش قیمت جواہرات کا بیان بالکل قابل اعتماد ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ ذخیرہ اس کو اورنگ زیب نے دکھایا۔ شائستہ خان اور میر جملہ سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ اس کا

---

(1) Jean - Baptiste Tawernier. (2) Oporto

خیال ہے کہ شاہجہاں جواہرات کا بڑا نقاد تھا۔ اس کا یہ قول کہ جہاں بنیے سودا کرنے پر تیار نہیں ہوتے وہاں اہل مغرب کو نفع کی کیا امید ہو سکتی ہے، ہندوستانی تجار کی ہوشیاری کا اعتراف ہے۔

منوچی[1]

17ویں صدی کے نصف اوّل کے مغربی سیاحوں میں سب سے زیادہ لکھنے والوں میں منوچی ہے۔ ابھی وہ 14 سال کا لڑکا تھا کہ وینس کو اس نے خیر باد کہہ کر بقیہ زندگی اور خاص کر ہندوستان میں گزاری۔ اس کو فارسی و ترکی زبانوں سے بھی کام چلانے بھر کی واقفیت تھی۔ جس کی وجہ سے دارا کی ملازمت حاصل ہوئی، دارا کی خدمت اس نے خلوص اور وفاداری سے کی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ شریک تھا۔ وہاں سے بچ بچا کر اپنے سرپرست کے شریک غم ہونے کے لیے لاہور پہنچا، ملتان اور بھکر بھی اس کے ہمراہ گیا۔ یہاں خواجہ سرا بسنت کے ساتھ وہ قلعہ کا محافظ مقرر ہوا۔ بھکر فتح ہو جانے پر وہ لاہور چلا گیا اور وہاں سے دہلی واپس آیا۔ اعتبار خان نے زور دیا کہ وہ اورنگ زیب کی ملازمت میں آجائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اورنگ زیب کے کشمیر جانے کے بعد اس نے بنگال کا طولانی سفر اختیار کیا۔ وہاں سے واپس آکر راجہ جے سنگھ کی ملازمت میں آگیا۔ اسی کے ساتھ دکن گیا۔ 1666ء میں وہاں بھی استعفیٰ دے دیا اور ایک خطر پسند زندگی بسر کرنے کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ وہ 7-8 سال طبیب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ 1678ء میں شاہ عالم کی ملازمت میں داخل ہوا۔ جس کے ساتھ وہ اورنگ زیب کی راجپوتانہ اور دکن کی لڑائی میں رہا تھا۔ اس کا انتقال 1717ء میں ہوا۔ جو کتاب اس نے فرانکوس[2] مارٹن اور بیوریوڈس[3] لینڈ کی فرمائش پر لکھی تھی اس کے متن میں اس نے اپنے اسناد و مخزن کا پتہ برابر دیا ہے۔

(1) Niccolao Manucci.
(2) Francios Martin
(3) Boureav Deslands.

حسب مذکورہ بالا وہ راجہ جے سنگھ کی ملازمت میں تھا۔ راجہ کے لڑکے کیرت سنگھ سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ امانت خان، مرزا لہراسپ ولد مہابت خان اور فدائی خان کو وہ اپنے بے تکلف دوستوں میں شمار کرتا ہے۔ منطقی طور پر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ دارا اور بیگم صاحبہ کا منظور نظر تھا اس لیے اور بہت سے افسروں سے بھی اس کی ملاقات رہی ہو گی۔

اس نے دھرمات کی جنگ کی خبر ایسے بلند پایہ اشخاص سے پائی جو خود جنگ میں شریک تھے۔ اورنگ زیب کے مغربی توپچیوں سے بھی اس لڑائی کی خبر ملی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ خود بھی شریک تھا۔ سلیمان شکوہ کی تگ ودو کا حال جے سنگھ نے اسے بتایا۔ کھجوا کی لڑائی کی تفصیلات راج محل کے ناظم مرزا جانی اور ہگلی کے ناظم محمد مغل سے معلوم ہوئیں۔ دیورائے کی لڑائی کے حالات میر تقی کے ایک مصاحب نے بیان کیے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی جنگ وراثت کے متعلق اس کے بیانات صحیح ہیں۔ لیکن شاہجہاں کی حکومت سے پہلے کے حوالہ جات مہملات کا مجموعہ ہیں۔

ولیم اروِن نے صحیح کہا ہے کہ بجز برنیر کے جزوی نقالی کے منوچی نے کسی دوسرے کی نقل نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ منوچی، برنیر سے زیادہ باخبر و تجربہ کار آدمی تھا۔ آخر الذکر کی وہ پُرزور تردید کرتا ہے اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ دوسرے لوگ جو اس کی حقارت کے مرکز بنے، ان میں پرتگالی، یسوعی اور اورنگ زیب تھے۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی ہندوستانی کردار کو بڑی نیچی سطح پر پاتا ہے۔ اس ضمن میں ہندو، مسلمان دونوں شامل ہیں۔ منوچی کارآمد تو ہے لیکن بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں۔

خاتمہ

مذکورہ بالا اسناد کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاہجہاں کا عہد حکومت صحیفہ دور متوسط کا سب سے زیادہ شاندار باب تھا۔ اس عہد میں امن

چین، خوش حالی تھی، ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں بہترین، شاندار عمارتیں ظہور میں آئیں۔ بڑے بڑے پُر حوصلہ جنگی معرکے ہوئے لیکن اسی جاہ وجلال، شان وشوکت کی تہ میں زوال کے ایسے آثار بھی جھلک رہے ہیں اور ایسے خطرناک رجحانات کے سامان بھی نظر آتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے آگے چل کر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ایک دھماکہ بن کر حکومت کے خاتمہ کا پیام بن گئے۔ از روئے انصاف یہ سب تباہ کن عناصر شاہجہاں کی حکومت سے وابستہ ہیں۔

باب 1

بچپن اور جوانی

شہزادہ خرم جو تاریخ میں عموماً شاہجہاں، شہنشاہ والاشان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے 5/ جنوری 1592ء کو بوقت شب بروز جمعرات لاہور[1] میں پیدا ہوا۔ یہ اس کے دادا کے عہد حکومت کا چھتیسواں سال تھا۔ اس کی ماں راجپوت شہزادی مان متی یا جگت گسائیں تھیں جس کے ساتھ جہانگیر[2] نے 1556ء میں شادی کی تھی۔ وہ موٹا راجہ اودے سنگھ کی لڑکی تھی۔

اس کا مستقبل

بچے نے زہرہ و مشتری کی یکجائی روشنی میں آنکھیں کھولیں[3]۔ مجموعہ نجوم نے عظیم خوش قسمتی و طوفانی کردار کی نشان دہی کی۔ درباری جوتشیوں نے اس کی جنم کنڈلی دیکھی اور متفقہ رائے بچے کی غیر معمولی خوش قسمتی کی پیشین گوئی کی۔ شعرا بھی فنکاری و مدح سرائی میں پیچھے نہ رہے۔ اپنی نظموں کا سہارا لے کر آگے بڑھے ان میں مادہ سے دو تاریخ خاص طور پر قابل توجہ ہیں:۔

1- لمعۂ آفتاب عالمگیر

2- شاہ روے زمین و شاہجہاں

اگر شعراء کے اس بظاہر الہامی بیان کو اہمیت دی جائے تو دوسرا مادۂ تاریخ واقعی شہزادے کی زندگی کے مستقبل کا مظہر معلوم ہوگا۔

اکبر کے لیے اس پوتے کی پیدائش معمولی دلچسپیوں سے زیادہ اہم تھی۔ دو طرح سے یہ قابل خیر مقدم تھی، اس کی حسب معمولی مسرت کا باعث ہوئی لیکن اس سے بھی زیادہ اس کی لاولد ملکہ سلطان بیگم[5] کی پژمردگی کے لیے تازگی بخش ثابت ہوئی۔ ملکہ کے جوتشی ہر گوبند نے اس مژدہ کی خبر پہلے ہی دے دی تھی اور کہا تھا کہ بچے کو اپنا متبنیٰ کر لے۔

حسب دستور شاہی خاندان، پیدائش کے چھٹے دن سلیم نے اکبر کو مدعو کیا تاکہ نوزائیدہ کو نام عطا کرے۔ اکبر نے اس کا نام خرم رکھا اور واقعی شاہی خاندان میں اس بچے کی آمد سے بڑی خوشی منائی گئی۔ اسی دن بچہ رقیہ بیگم کے حوالے کیا گیا اور اس نے اسے گود لے لیا۔ یہ بچہ ہوش سنبھالنے کے تین سال بعد تک اسی ملکہ کے زیر سایہ پروان چڑھتا رہا۔

تعلیم

مغلوں میں دستور تھا کہ بچہ کی تعلیم ختنہ کے فوراً بعد شروع ہو اس لیے جب شہزادہ چار سال چار ماہ چار یوم کا ہوا تو مکتب کی رسم ادا کی گئی غالباً اس موقعہ پر مروجہ شان و شوکت سے جشن[6] منایا گیا۔ خرم کے پہلے استاد ملا قاسم بیگ تبریزی[7] مشہور مرزا جان تبریزی کے شاگرد تھے۔ علاوہ ممتاز عالم اور علوم عقلی کے ماہر ہونے کے وہ ایک صوفی بھی تھے۔ مجموعہ البلدان ایسی ضخیم جغرافیہ کی کتاب کے مترجم بھی تھے۔ ان کے بعد شہزادے کے اتالیق شہرۂ آفاق حکیم علی گیلانی[8] ہوئے جو مشہور طبیب، اور قابل قدر خوبیوں کے مالک تھے۔ حکیم گیلانی طباعت میں اپنے ماموں حکیم الملک شیرازی اور ان کے بعد شاہ فتح اللہ گیلانی کے شاگرد تھے۔ دینیات میں انہوں نے شیخ عبدالنبی سے کسب فیض کیا تھا۔ سارے استادوں سے زیادہ شہزادہ کو حکیم گیلانی سے سروکار رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد کو استاد سے بڑا لگاؤ تھا بعد میں شہزادہ مسرت واحسان مندی کے ساتھ ان کو اکثر یاد کرتا تھا۔ اس یاد میں اس علم کا اظہار تشکر بھی تھا جو عہد تربیت کے سب سے

زیادہ اثر پذیر زمانے میں اس نے اپنے استاد سے حاصل[9] کیا تھا۔ ان کے علاوہ جن لوگوں کو شہزادے کی ذہنی نشوونما کی رہنمائی و تشکیل کی خدمت سپرد ہوئی تھی ان میں شیخ صوفی[10] کا ذکر ضروری ہے۔ یہ میاں وجیہ الدین گجراتی کے شاگرد، خوش مذاق شاعر اور شگفتہ مزاج و آزاد خیال آدمی تھے۔ دوسرے اتالیق شیخ ابوالخیر برادر شیخ ابوالفضل باخبر و متوازن مزاج آدمی تھے[11]۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مشہور علماء کی صحبت نے نوخیز طالب علم کے ذہن کو تیز تر کردیا ہوگا لیکن اپنے باپ کے برخلاف اس کا ذہن عملی زیادہ تھا مفکرانہ کم تھا۔ اس نے بہت جلد فارسی زبان سیکھ لی بلکہ اظہار بیان پر بھی قدرت حاصل کرلی لیکن ترکی زبان سے اسے انس نہ پیدا ہوسکا۔ آبائی زبان سے اس کی بیگانگی کی شکایت ایک مرتبہ جہانگیر نے رقیہ بیگم سے کی[12] اور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی 1601ء میں اس نے شہزادہ کو ترکی[13] زبان سکھانے کے لیے تاتار خان کو مقرر کیا۔ یہ صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ نئے استاد نے اس نوجوان شاگرد میں کس قدر جذبہ شوق پیدا کیا۔ لیکن خرم کند ذہن لڑکا نہ تھا۔ اس کا ذہن تیز اور حافظہ غیر معمولی تھا۔ تفصیل پسندی اور اس پر عبور حاصل کرنے کی اس میں خاص صلاحیت تھی۔

جسمانی تعلیم و تربیت

لیکن ایک مغلیہ شہزادے سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس کو صرف کتب بینی کا شوق ہوگا۔ اس کی تعلیم اس نہج کی ہوتی کہ دماغ اور جسم دونوں توانا ہوسکیں۔ اکبر نے حسب ضرورت شہزادے خرم کی جسمانی تربیت کا بھی خیال رکھا۔ جب 1597ء میں وہ آخری بار کشمیر جارہا تھا تو اس نے اپنے پوتے کو لاہور میں زیر نگرانی میر مراد جوانیسی[14] چھوڑ دیا۔ شہزادے کو تیر اندازی سکھانا اور تعلیم قور کی روزانہ تعلیم دینا میر کا فرض منصبی ہوگیا۔

بعد ازاں جب خرم اپنے دادا کے ساتھ دکن گیا تو بندوق چلانا سکھانے کے

لیے راجہ سلیوان[16] کو تعینات کیا گیا سواری و تیغ زنی کی مشق اس کی روزانہ ورزش کا ایک جزو ہو گئی۔ فن عروض و خطابت جیسے خشک موضوعات کے مقابلہ میں شہزادے کو ان فنون سے زیادہ دلچسپی ہوئی باپ کی طرح وہ بھی تیر کمان و بندوق کے استعمال کا ماہر ہو گیا۔

کشمیر سے واپسی پر اکبر لاہور میں بہت کم ٹھہرا فوراً آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اب اُس نے فیصلہ کیا کہ جہانگیر کو رانا کے مقابلے میں روانہ کرے۔ ان کی آمد پر آگرہ کے قریب ولی عہد نے ان کا استقبال کیا۔ میواڑ روانہ ہونے سے قبل جہانگیر نے باپ سے درخواست کی کہ اس کا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ کر دیا جائے۔ خرم کو اکبر جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خسرو کو بھی اس کے ساتھ بھیجنا مناسب نہ سمجھتا تھا پرویز کو اس کے باپ کے ساتھ بھیجنے میں اس کو عذر نہ تھا۔[17]

خرم کی علالت

ایسا ہوا کہ جیسے ہی سلیم آگرہ سے روانہ ہوا خرم چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اس کی حالت نازک ہو گئی دادا کو گھبراہٹ ہوئی اس نے فوراً ہوشیار طبیبوں کو شہزادے کے علاج کے لیے بلایا۔ اور صدق دل سے اس کے جلد اچھا ہونے کی دعا مانگی۔ دعا بااثر ثابت ہوئی شہزادہ جلد ہی اچھا ہو گیا.......... حسب دستور شہزادے کا غسل صحت ہوا اس دن اکبر نے بے دریغ فیاضی سے کام لیا خیرات تقسیم کی اور بہت سے قیدیوں کو رہا کیا۔ اس کے بعد خرم اپنے دادا کے ساتھ دکن[18] روانہ ہوا۔

خرم آگرہ کے لیے روانہ کیا گیا

سلیم کی بغاوت نے اکبر کو مجبور کیا کہ وہ شمال کی طرف فوراً چلا جائے۔ جب خودسر شہزادہ کو راہِ راست پر لانے کے لیے پرامن ذرائع ناکامیاب ہو گئے تو اکبر نے اسے سخت گیری کے ساتھ قابو میں لانے کا ارادہ کیا۔ اگست 1604ء[19] میں ایک زبردست فوج کے ساتھ وہ آگرہ سے چل پڑا لیکن آگے نہ بڑھ سکا۔ ماں کی

اچانک علالت کی خبر نے اسے معذور رکھا پہلے تو اس نے یقین نہیں کیا کہ اس کے ساتھ سختی کے برتاؤ کیے جائیں۔ بہر حال خبر کی صداقت کے لیے اس نے خرم اور حکیم علی کو آگرہ بھیجا تاکہ معلوم ہو کہ علالت کوئی حیلہ تو نہیں۔ خرم سیدھے اپنی پردادی کے کمرے میں گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی حالت نازک ہے وہ فوراً اپنے دادا کے پاس یہ کہنے چلا آیا کہ اگر وہ اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو فوراً آگرے واپس آنا چاہیے۔ اکبر، ماں کے پاس بروقت پہنچا۔ وہ موت کے پنجے میں تھی چنانچہ چند گھنٹوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔[21]

اکبر کی علالت

دادی کے انتقال کے بعد سلیم نے اپنے آپ کو باپ کے سپرد کر دیا۔ اکبر کی صحت اب تیزی سے خراب ہونے لگی۔ دل بہلانے کے لیے اس نے ایک دن خسرو اور سلیم کے ہاتھیوں میں لڑائی کا انتظام کیا اکبر اور خرم جھروکے سے دیکھ رہے تھے سلیم کے ہاتھی کا پلہ بھاری ہونے لگا۔ سلیم کے ملازموں نے خسرو کے آدمیوں کی مذمت کی۔ خسرو اپنے دادا کے پاس شکایت لے کر گیا۔ بادشاہ نے خرم کو سلیم کے پاس اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ ہنگامہ ختم کر دیا جائے۔[22] اکبر اس تفریح سے واپس ہوا تو بہت تھکا ہوا تھا اس کی رات بے چینی میں گزری صبح کے وقت اس پر بخار کا حملہ ہوا اور ساتھ ہی اسہال نے بیماری کو اور پیچیدہ بنا دیا۔[23]

سازش

دربار کے غیر مطمئن لوگوں کو سازشی منصوبے تیار کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے جانشینی کا طریقہ بدلنے اور خسرو کو تخت پر لانے کی کوشش کی۔ حصولِ کامیابی کے لیے ان لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ سلیم جب باپ کی عیادت کو آئے تو اسے روکا جائے لیکن بروقت اطلاع نے اس کو دشمنوں سے بچا لیا۔ مگر وہ اپنے لڑکے خرم کی خیریت کے لیے بہت فکر مند تھا۔ خرم، اکبر سے جاں نثارانہ طور سے[24] وابستہ تھا۔ وہ اس کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اس کی

ماں نے کوشش کی کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے تو خرم نے سختی سے جواب دیا۔ "نہیں جب تک شاہ بابا کی ایک سانس بھی باقی ہے مجھے کوئی طاقت ان سے جدا نہیں کر سکتی" اچھا ہی ہوا کہ وہ ماں کے ساتھ نہیں آیا کیونکہ سازش کرنے والوں نے کچھ لوگوں کو اس پر لگا دیا کہ جب وہ ایوانِ شاہی سے نکلے تو اسے گرفتار کر لیا جائے۔[25]

اکبر کا انتقال

دشمنوں کی کوشش جب کامیاب نہ ہوئی تو سلیم، باپ کی آخری عیادت کے لیے گیا۔ اکبر نے اپنے مصاحبوں کو اشارہ کیا کہ شہزادے کو میری تلوار دیدی جائے اور میری پگڑی اس کے سر پر رکھ دی جائے جب یہ ہو چکا تو اکبر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ اب آخر کار جہانگیر خرم کو اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سلیم کی تخت نشینی

باپ کے انتقال کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد بتاریخ 24/اکتوبر 1605ء بروز جمعرات جہانگیر تخت پر جلوہ گر ہوا۔ اس کے بعد ہی خسرو کی بغاوت سے حکومت میں ہلچل پیدا ہوئی۔ خسرو 6/اپریل 1606ء کی شام کو آگرہ سے بہانہ کر کے نکلا کہ وہ اکبر کی قبر پر جا رہا ہے لیکن وہ پنجاب کی طرف چلا۔ راستہ میں اس کو حسین بیگ بدخشی اور عبدالرحمٰن مل گئے۔ خسرو کے بچ کر نکل جانے کی خبر سے جہانگیر پریشان ہو گیا۔ شیخ فرید بخاری کو حکم دیا کہ باغی کا پیچھا کرے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود بھی اس مہم کے لیے فوراً روانہ ہو جائے۔ چونکہ دارالسلطنت کے تحفظ کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا اس لیے ایک مجلس نیابت بنا دی گئی۔ اس میں شیخ علاءالدین نبیرۂ شیخ سلیم جو بعد میں معروف بہ اسلام خاں اور بنگال کے گورنر ہوئے، مرزا غیاث بیگ تہرانی، دوست محمد خواجہ جہاں اور راجہ راو سنگھ بھرتا شامل تھے۔ شہزادہ خرم صدر انجمن بنایا گیا۔ خرم کے لیے سرکاری طور پر عوامی رابطہ کا یہ پہلا

موقع تھا۔[26]

خرم اپنے باپ کے ساتھ کابل جا رہا ہے

ایک مہینہ سے بھی کم عرصہ میں خسرو کی بغاوت ختم ہو گئی اور 9 / مئی 1606ء کو جہانگیر لاہور پہنچا اس کے بعض وفادار مشیر کاروں نے اس کو صلاح دی کہ وہ فوراً آگرہ واپس جائے۔ گجرات، دکن اور بنگال[27] میں فضا بہت ناہموار ہے لیکن ایران کے خطرناک رویہ کے پیش نظر جہانگیر نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ وہ گیارہ مہینے تک لاہور میں ٹھہرا رہا۔ سرحد کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ چونکہ اس کا ارادہ تھا کہ حالات اعتدال پر آجائیں تب وہ کابل کا سفر کرے، اس لیے اس نے خرم کو حکم دیا کہ مریم زمانی اور دوسری بیگمات کو لے کر وہ لاہور آجائے۔ جب خرم لاہور کے قریب پہنچا تو جہانگیر دھار تک اپنی ماں کے استقبال کے لیے گیا۔[28] شہزادہ پرویز اس سے پہلے دربار میں آگیا تھا اس طرح ایک شادکام خاندان کا اجتماع ہوا۔

خرم کی نسبت ارجمند بانو سے

جہانگیر کے قیام لاہور میں 21 / مارچ 1607ء کو خرم کو پہلا فوجی منصب ہشت ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار مع طومان تغ و طبل و علم کے عطا ہوئے۔[29] تقریباً ایک ہفتہ بعد وہ ارجمند بانو بیگم بنت اعتقاد خاں سے منسوب کیا گیا یہی اعتقاد خاں آگے چل کر آصف خاں کے لقب سے مشہور ہوا۔ جہانگیر نے اپنے دستِ مبارک سے ہونے والی بہو کو انگوٹھی پہنائی بہت کچھ خوشی و مسرت کا اظہار[30] ہوا۔ اسی سال کے ماہ نومبر میں کابل سے واپسی پر جہانگیر نے خرم کو اجین کی جاگیر اور حصار، فیروزہ کی سرکار عطا کی۔ اس کے علاوہ اجازت دی کہ وہ سرخ خیمہ نصب کر سکتا ہے یہ عنایت خاص سب سے بڑے شہزادے کو دی جاتی تھی۔ ان اعزاز کو اور معزز بنانے کے لیے ایک مہر ازک کے سپرد کی گئی۔ حکم دیا گیا کہ جملہ فرامین و پروانہ جات پر اس کی مہر ثبت ہونی چاہیے۔[31]

خرم کابل کی چند تعمیرات درست کراتا ہے

ایران کا خطرہ اب ختم ہو چکا تھا۔ 26/مارچ 1607ء کو جہانگیر لاہور سے روانہ ہوا۔ دس ہفتہ کے سفر کے بعد چاندی، سونا بکھیر تا ہوا 4/جون کو کابل میں داخل ہوا۔ اُرتا باغ شہزادہ خرم کو قیام کے لیے دیا گیا۔ وہاں کی عمارتیں شہزادے کو پسند نہ آئیں۔ اس نے فوراً مناسب ترمیمات کر دیں اور اس کے بعد باپ کو باغ کی سیر کے لیے مدعو کیا۔ جہانگیر بدلی ہوئی صورت اور نئی عمارتوں کی خوشنمائی اور تناسب سے بہت خوش ہوا۔ بیٹے کے گھر میں پورا دن آرام و آسایش کے ساتھ اس نے گزارا۔ اس موقع پر مروجہ دستور کے مطابق منجان درباری کی رائے کے پیش نظر ستاروں کی نحوست دور کرنے کے لیے شہنشاہ نے شہزادے کی قمری سال گرہ منائی۔ وہ سونا چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں میں تولا گیا جو غریبوں اور حاجت مندوں میں، بانٹ دی گئیں۔[32]

خسرو کی سازش

خسرو شاہی جلوس کے ساتھ کابل گیا تھا۔ اس کی نگرانی کچھ کم ہونے لگی۔ وہ پھر بے قرار ہوا اس نے جلد ہی اپنا ہم خیال دوسرے غیر ذمہ دار نوجوانوں کو بنالیا۔ مثلاً شریف ابن اعتماد الدولہ، نور الدین برادر زادہ، آصف خاں اور اعتبار خاں۔ ان لوگوں نے 400 آدمیوں کو اپنا شریک کار بنایا۔ منصوبہ یہ بنایا کہ شہنشاہ کو کسی ایسے وقت قتل کیا جائے جب اس کا کوئی محافظ نہ ہو اور شہزادے کو رہا کر دیا جائے۔ بہت ممکن تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جاتی، لیکن اس جتھا کے ایک شخص کے احساس ندامت نے اعتراف جرم کرادیا۔ اس شخص نے شہزادے خرم کے دیوان خواجہ واعظ سے صاف صاف اقبال جرم کر لیا۔ اس سازش کی خفیف سی خبر آصف خان کو کسی دوسرے ذریعہ سے پہلے پہنچ چکی تھی لیکن سب سے پہلے یہ اہم خبر بادشاہ کو نوجوان خرم نے دی۔ وہ دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا۔ اور سازش کرنے والوں کے منصوبے سے باخبر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سازش کے سرغنہ پکڑ لیے گئے،

ان کو سزا دی گئی اور تحریک ختم ہو گئی۔ حکم ہوا کہ خسرو کو اندھا کر دیا جائے۔ مگر یہ اہم انکشاف جس کی وجہ سے بادشاہ کی جان بچی تھی۔ وہ خرم کے ایک عہدہ دار نے کیا تھا۔ یہ بات خرم کے اعزاز میں مزید اضافہ کا باعث ہوئی۔ باپ کی نظر میں شہزادہ خرم کا وقار ہمیشہ سے زیادہ ہو گیا۔[33]

دربار آگرہ واپس آتا ہے

اس سازش سے پہلے ہی جہانگیر کابل سے روانہ ہو چکا تھا۔ سازش دبانے کے بعد اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا راستہ میں کئی مقامات پر اس نے تفریح کے لیے اپنا دل پسند مشغلہ قمرعہ[34] کا لطف اٹھایا۔ جن ابدال پہنچ کر خرم اور پرویز دونوں کو اس شکار[35] میں حصہ لینے کی اجازت ملی۔ شاہی قافلہ 23/ نومبر 1617ء کو لاہور پہنچا۔ یہاں 6 مہینے سے کچھ زیادہ قیام کے بعد آگرہ کا سفر اختیار کیا گیا۔ شہنشاہ 12/ مارچ 1608ء کو دار السلطنت میں داخل ہوا۔ شہزادہ خرم اب 16 برس کا نوجوان تھا۔ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کو ایک علیحدہ مکان اور ساز و سامان دیا جائے۔ جہانگیر اس کو اپنے سے الگ بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے اس کو محمد مقیم عرف وزیر خان کا مکان دے دیا۔ یہ مکان قلعہ میں ایوان شاہی کے قریب تھا۔ کابل کی طرح یہاں بھی شہزادے نے اپنے تعمیری ذوق کا ثبوت دیا۔ اپنے مذاق کے مطابق گھر میں ترمیم کی اس کے بعد باپ کو مکان میں مدعو کیا۔ حسب دستور شہزادہ نے قیمتی تحفے نذر کیے۔ جنہیں جہانگیر نے خوشی بہ خوشی قبول کیے۔[36]

خرم کی نسبت صفوی شہزادی سے کیوں؟

7/ ستمبر 1609ء کو شہزادے خرم کو باپ نے ایک لعل اور دو دانہ در یتیم قیمتی چالیس ہزار روپیہ عنایت کیے،[37] 4 ماہ بعد اس کی نسبت مرزا مظفر حسین صفوی خانوادۂ اسماعیل شاہ ایران کی لڑکی سے ہوئی۔ جہانگیر اس رشتہ اتحاد کے لیے اصول سے الگ کیوں ہوا[38]؟ خاص کر جب نسبت اس سے پہلے ہی ارجمند بانو

سے ہو چکی تھی۔ پہلی نگاہ میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا مغل خاندان میں عام بات تھی لیکن یہاں صورت دوسری تھی۔ شہزادہ خرم کی شادی اس کی پہلی منگیتر سے نہ ہوئی تھی تو پھر دوسری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی عمر اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ کیونکہ صفوی شہزادی سے اس کی شادی فوراً نہیں ہوئی، بلکہ برخلاف اس کے اصل رسوم کو ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اس زمانے کی تحریروں میں کوئی اشارہ نہیں کہ خرم کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اور نہ اس کی بعد کی زندگی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے بالآخر کوئی سیاسی وجہ بھی پس پشت نظر نہیں آتی۔

کوئی نہ کوئی ایسی خاص بات ضرور ہو گی جس نے شہنشاہ کا دماغ بدل دیا۔ کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں ضروری ہو جاتا ہے کہ بین السطور کا مطالعہ کیا جائے اور حالات کا جائزہ بعض واقعات کی روشنی میں لیا جائے۔ 30/ مارچ 1607ء کو شیر افگن بنگال میں مارا گیا۔ اس کی بیوی مہرالنساء قصر شاہی میں بلائی گئی۔ یہاں آنے پر اس کو ملکہ سلیمہ بیگم کی خدمت میں جگہ دی گئی گمان غالب ہے کہ اس کے کچھ ہی دن بعد جہانگیر نے اسے دیکھا۔ اس پر عاشق ہو گیا اور اپنی تمنا کی درخواست مستقل مزاجی سے پیش کرنے لگا۔ جب وہ اس غیر معمولی طور سے اس جذباتی خاتون کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہوا تو فطرتاً اس کو دوسری تدبیریں کام میں لانی پڑیں۔ جہانگیر اس کو دھمکی دے سکتا تھا، کہ اس کو برطرف کر کے اس کی بھتیجی کو صدمہ پہنچا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی سنجیدگی کا بھی اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے لڑکے کی نسبت ایرانی شہزادی سے کر دی۔ لیکن جب یہ تدبیر بھی راس نہ آئی تو اس نے شاہزادے کی شادی 29/ اکتوبر 1610ء کو رچائی۔ وہ خود شہزادے کے گھر گیا رات بھر وہاں رہا۔ اکثر امراء کو اعزازی خلعت دیے اور گوالیار کے قید خانہ سے بہت سے قیدی رہا

کر دیے گئے۔[39]

اس واقعہ کے کوئی پندرہ روز بعد شام کو جہانگیر چیتا کے شکار میں مصروف تھا۔ انوپ رائے شکاریوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے اتفاق سے ایک بڑے درخت کے قریب ایک نیم خوردہ بیل دیکھا اس کے بعد ہی ایک زبردست شیر جھاڑیوں سے نکل پڑا اور تیزی سے گزر گیا۔ انوپ رائے نے فوراً آدمی دوڑائے کہ جہانگیر کو خبر کر دیں۔ جہانگیر گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی تیزی اور جوش میں اس مقام پر آ گیا۔ شہزادہ خرم۔ اعتماد رائے اور حیات خاں اس کے ساتھ تھے۔ جہانگیر کا گھوڑا شیر دیکھ کر بھڑکا۔ شیر ایک درخت کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھا جہانگیر گھوڑے سے اتر پڑا۔ شہزادہ خرم تھوڑے فاصلہ پر بائیں جانب کھڑا تھا دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ جہانگیر کا پہلا نشانہ خطا ہو گیا لیکن دوسرے نشانہ سے زخمی ہو کر شیر بھاگا۔ میر شکار پر حملہ کیا، اس کو زخمی کر کے اپنی پہلی جگہ چلا گیا۔ مشکل سے ابھی جہانگیر نے نشانہ باندھ کر تیسری بار گولی چلائی ہو گی کہ جنگلی جانور نے ایک خوفناک حملہ کیا شکاری گھبرا گئے ایک دوسرے پر گرنے لگے اور دو تین تو جہانگیر پر سے گزر گئے۔ جہانگیر کو اعتماد رائے اور کمال نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس اثنا میں شیر بائیں طرف مڑا اور اس نے دہشت ناک انداز میں انوپ رائے پر حملہ کر دیا۔ انوپ رائے نے اپنی چھڑی سے اسے مارا لیکن شیر کے بھاری وزن سے مغلوب ہو گیا۔ شیر نے اپنا جبڑا کھولا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اپنے تیز دانت ان میں چبھو دیے انوپ رائے گر پڑا اس کی جان خطرہ میں آ گئی مگر آنکھ جھپکانے کی دیر تھی کہ شہزادہ خرم نے تلوار کھینچ کر کمر پر ماری اپنی تیغ خونچکاں نیام میں رکھ لی۔ وہ جانور شدت تکلیف سے گر پڑا۔ کسی اور نے تو نہیں صرف حیات خاں نے شہزادے کے ہاتھ کی صفائی دیکھی۔ جب اس نے جہانگیر سے اس بات کا تذکرہ کیا تو جہانگیر نے اپنے بیٹے کے انکسار کی بڑی داد دی۔ بایں ہمہ شیر نے مزید انوپ رائے کے سینہ کو زخمی کیا اور ایک مشعل

بردار کی جان لی۔ اس کے بعد اسے مار اگیا۔[40]

سال نو کے جشن پر شہزادہ خرم کو دس ہزار ذات اور پانچ ہزار سواء کا منصب عطا ہوا۔

ارجمند بانو کے ساتھ خرم کی شادی

بالآخر جہانگیر اپنی محبت میں کامیاب ہوا پچیس مئی 1611ء[41] کو اس کی شادی مہرالنساء سے ہوگئی اس نے بیوی کو نور محل کا خطاب دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شہنشاہ کی آنکھوں کا نور ثابت ہوئی۔ حرم میں اس کا داخل ہونا دربار کی زندگی میں ایک نئی طاقت کا اضافہ تھا۔ آہستہ مگر مستقل طور پر اس نے اپنا اثر گوشہ گوشہ پر قائم کردیا۔ ابتدا ہی سے اس کی نظر شہزادہ خرم پر تھی لیکن اپنی بھتیجی کی خوشی وہ خرم کے ہاتھوں میں اس وقت سونپنا چاہتی تھی جب وہ یہ سمجھ لے کہ اس کا عروج ملکہ کی امداد پر منحصر ہے۔ اس لیے اس نے 27/ مارچ 1612ء کو خرم کو بارہ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار رکھنے کا منصب عطا کیا۔[42] تخمیناً چار ہفتہ بعد طویل مدت کی نسبت شادی میں تبدیل ہوگئی۔

جشن شادی

دولہا اور دُلہن کے دونوں والدین کے لیے واقعی بڑی خوشی کا دن تھا۔ چنانچہ یہ جشن بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ ماحول کی روشن اور خوشنما بنانے میں ذرا بھی اخراجات میں تکلف نہ کیا گیا۔ دن کو شاہانہ جلوس اور شب کو قیمتی آتش بازی نے جشن کی دلکشی بے پناہ بڑھادی۔ آگرہ کا پورا شہر جشن میں شامل تھا۔ یہ جشن شادی قریب قریب ایک مہینہ تک منایا گیا۔ ایک مہینے کے بعد جہانگیر اپنے لڑکے کے گھر شادی میں حصہ لینے کے لیے گیا۔ شہزادہ نے باپ کو نذریں گزاریں۔ بیگمات کو جواہرات دیے اور امراء[43] کو خلعت اعزاز عطا کیا۔

اس کی دوسری بیویاں

شہزادہ خرم کی تیسری بیوی شاہنواز خان ابن عبدالرحیم خان خاناں کی لڑکی

تھی۔ جب وہ دکن[44] میں تھا تو یہ شادی 23/اگست 1617ء کو ہوئی۔ یہ اتحاد بلاشبہ سیاسی نظریہ سے ہوا۔ شہزادہ میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کے مستقبل کی حرکات وسکنات کا مرکز دکن ہوگا۔ وہاں کے معاملات سے بے اصول خان خاناں سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا۔ اس کی بے دریغ امداد حاصل کرنے کے لیے ازدواجی رشتہ بہترین طریقہ معلوم ہوا۔ علاوہ بریں اس کا لڑکا شاہ نواز خاں غیر معمولی ذہن کا نوجوان تھا۔ خرم چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ذاتی مصاحبوں میں شامل کرلے لیکن وہ اپنے مصاحبوں کی تعداد سمجھ بوجھ کر ہی بڑھا رہا تھا۔

اولاد

پہلی بیوی سے شہزادہ خرم کے ایک لڑکی 12/اگست 1611ء میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام پرہیز بانو رکھا گیا اس کی پرورش رقیہ بیگم[45] نے کی اس کی دوسری بیوی سے چودہ اولادیں تھیں جن میں سے سات بچپن ہی میں مر گئیں، جو سات بچیں وہ حسب ذیل ہیں۔

جہاں آرا بیگم	ولادت	23/مارچ 1614ء	بمقام اجمیر
دارا شکوہ	ولادت	20/مارچ 1615ء	بمقام اجمیر
شاہ شجاع	ولادت	23/جون 1616ء	بمقام اجمیر
روشن آرا بیگم	ولادت	24/اگست 1617ء	بمقام برہان پور
اورنگ زیب	ولادت	24/اکتوبر 1618ء	بمقام ودھات
مراد بخش	ولادت	29/اگست 1624ء	بمقام روہتاس
گوہر آرا بیگم	ولادت	7/جون 1631ء	بمقام برہان پور

خرم کا کردار

جہانگیری حکومت کی تاریخ زیادہ تر شہزادے خرم کی درخشاں فتوحات کا ایک دفتر ہے دنیائے شہرت وعروج میں اس کے شہابی عروج نے ہمعصروں کو حیرت زدہ کردیا۔ اس کی عوامی زندگی کی ابتدا باپ کی نوازش اور سوتیلی ماں کی امداد سے

شروع ہوئی۔46 اگرچہ جوان سال تھا لیکن اس نے پختہ کاروں کی ذہانت کا ثبوت دیا اس کے دلکش طور طریقے، مضبوط چال چلن، اس کی فرض شناسی اور دلیرانہ ہمت کا امتزاج اس کے کامیاب کردار کے ضامن تھے۔ اس کے بھائیوں اور حریفوں کے کردار کے تقابل نے اس کو برتری عطا کی۔ اور ان کی ناکامیوں نے ایک سے زیادہ بار اس شہرت میں اضافہ کیا۔ اس کو موقعہ کا انتظار نہیں کرنا پڑا، وہ خود بخود اسے ملتے رہے اس کے جوہر کی پہلی آزمائش میواڑ کے تاریخی میدان میں ہوئی۔

خرم کی میواڑ کی جنگ

راجپوتانہ کی تمام حکومتوں میں میواڑ ایک ایسی حکومت تھی جس نے سب سے زیادہ دیر تک مغل سلطنت کی بے پناہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اکبر کی کوششوں نے اس کے وجود کو مجروح ضرور کیا لیکن ختم نہیں کر سکیں۔ جہانگیر نے باپ کی تقلید میں اپنی حکومت کے اولین عہد میں شہزادہ پرویز کو رانا کے خلاف میدان جنگ میں بھیجا لیکن خسرو کی بغاوت نے جہانگیر کو مجبور کیا کہ وہ اس کے لڑکے کو واپس بلا لے۔ بعد ازاں مہابت خان، عبداللہ خان، فیروز جنگ اور راجہ باسو، یکے بعد دیگرے میواڑ بھیجے گئے لیکن ان کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بعد ازاں 1613ء میں خان اعظم عزیز کوکہ یہاں کی جنگی کارروائیوں کا سرغنہ بنایا گیا لیکن وہ بھی اوروں کی طرح بہت کم کامیاب ہوا۔ اس کی تجویز سے جہانگیر خود اجمیر گیا اور وہاں 1613ء کی خزاں میں مقیم ہوا۔ 1614ء کی ابتدا میں اس نے شادمانی و کامیابی کے ساتھ شہزادہ خرم کو خان اعظم کو سہارا دینے کے لیے بھیجا۔ بارہ ہزار فوجی اس کے زیر حکم تھے۔ اور فدائی خان اس فوج کا افسر خزانہ مقرر ہوا۔ محاذ جنگ پر پہنچ کر شہزادے نے محسوس کیا کہ عزیز کوکہ کے ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہے۔ نوجوان جرنل کو اپنے بزرگ سپہ سالار کی تاخیری کارروائیوں نے برانگیختہ کر دیا۔ اس نے فوراً اپنے باپ سے شکایت کی، جہانگیر نے ابراہیم حسین کو بھیجا کہ خان اعظم کو وفا شعاری کی ضرورت سے متاثر کرے لیکن اس نے اپنا

راستہ نہ بدلا۔ شہزادہ خرم نے اس کو نظر بند کر دیا اور اپنی کارروائی کی اطلاع باپ کو دی۔ جہانگیر نے مہابت خاں کو بھیجا کہ قیدی کو اجمیر لائے۔

اس کا حوصلہ

یہ پہلا موقعہ تھا جہاں خرم کے جارحانہ حوصلہ کا اظہار ہوا۔ وہ اپنی شان و شوکت میں کسی اور کو حصہ دینا نہیں چاہتا تھا اس کی خواہش تھی کہ اپنے ذرائع اور طریقے سے کامیابی حاصل کرے۔ اس لیے بلا کسی پس و پیش کے وہ لڑائی میں منہمک ہو گیا۔ دشمن پر دائیں بائیں سے حملہ کرنے لگا۔ اپنی سرگرمی اور دماغی یکسوئی سے اس نے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کیا۔ ساتھیوں نے بڑے صدق دل سے اس کا ساتھ دیا وہ پہاڑی علاقہ میں داخل ہوا۔ باوجود اپنے چچا کی ممانعت کے راجہ سورج سنگھ آگ اور تلوار لے کر سسودیا س کے علاقے میں اتر پڑا اور دشمنوں کو اتنا زیر کیا کہ قریب قریب لوگوں کو فاقہ کی نوبت آگئی۔ جگہ بہ جگہ تھانوں کے قیام نے غنیم کے فوری حملوں کو روکا اُس نے جنگ جاری رکھی۔ مخالف فوجیوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اور بھوک نے ان کی ہمت توڑ دی۔ آخر کار جب زیادہ لوگ ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے تو رانا امر سنگھ نے اپنے ان دوستوں کے ذریعہ صلح کی بات چیت شروع کی جو خرم کی فوج مخالف میں تھے۔

رانا کا اطاعت قبول کرنا

قاصدوں کے آنے جانے کے بعد شرائط صلح جلد ہی طے ہو گئیں۔ رانا اپنی آزادی سے دستبردار ہونے پر رضامند ہو گیا جو ایک مدت سے اس کی تمنا کا مرکز تھی ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی راضی ہو گیا کہ وہ بذات خود شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہو۔ لیکن دربار کی حاضری سے اس کو معاف کر دیا گیا۔ دربار میں اس کا لڑکا کرن سنگھ اس کا نمائندہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ چتوڑ کو کبھی مستحکم قلعہ نہ بنائے گا۔ اس صلح نامہ کی توثیق جہانگیر نے کی اور ایک فرمان بھی جاری ہوا جس پر اس کی مبارک ہتھیلی کا نشان ثبت تھا۔ اپنے بہت

سے حمایتوں کے ساتھ شہزادہ خرم کے حضور میں امر سنگھ حاضر ہوا۔ اس کی واپسی پر اس کے لڑکے نے بھی یہی کیا۔ شہزادہ خرم نے کرن سنگھ کا شان دار استقبال کیا۔ اس کو ایک غیر معمولی خلعت اعزاز، جواہرات سے مرصع ایک تلوار، ایک خنجر ایک گھوڑا معہ طلائی زین اور ایک خاص ہاتھی سے سرفراز فرمایا۔ خرم کے اس فیاضانہ سلوک سے کرن سنگھ اس کا زندگی بھر دوست[47] رہا۔

خرم کا عروج بخت

میواڑ کی تسخیر سے مغل سلطنت کی شان و عظمت میں اضافہ ہوا۔ جہانگیر سے زیادہ کوئی مفتخر اور شہزادہ خرم سے زیادہ مسرور نہ تھا بحیثیت سپہ سالار اس کے باکمال اور اس کی صلاحیت کے مکمل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہ گیا۔ اس کو ایک ابھرتا ہوا استارہ سمجھا جانے لگا۔ جب وہ اجمیر کے قریب پہنچا جملہ درباری امراء کو حکم ہوا کہ جا کر اس کا استقبال کریں قیمتی تحائف نذر کریں۔ جب شہزادہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تو آخر الذکر مسرت و محبت کے جذبات سے مغلوب ہو گیا، بغلگیر ہوا سر و رخسار کے بوسے لیے اور مخصوص نوازش و تبریک سے اس کو سرفراز فرمایا۔ لیکن باپ کی تمام عزت افزائی اور درباریوں کی جملہ مدح سرائی سے بھی زیادہ خرم نے جو نعمت اس جنگ میں پائی وہ اس منتخب جماعت کی رفاقت تھی۔ جو اندھیرے اجالے ہر حال میں اس سے منسلک رہی۔ ایسے لوگوں میں سندرداس، ملا شکر اللہ، سیف خاں بارہہ، دلاور خاں، کشن سنگھ اور میر حسام الدین شامل ہیں۔ شہزادہ اب اپنی عظیم قسمت کی دہلیز پر کھڑا تھا جو پہلے ہی سے مقدر ہو چکی تھی۔

باب 2

شہرت کا ارتقا

خرم کے منصب میں اضافہ

میواڑ کی غیر مہماں نواز پہاڑیوں میں کافی سخت ایام گزارنے کے بعد ان خوشگوار سیر وشکار میں خرم کو آرام ملا جو اس کے باپ نے اجمیر کے ارد گرد خوبصورت علاقے میں فراہم کر دیا تھا۔ اپنی خدمات کے صلہ میں اس کے منصب میں اضافہ ہوا اب وہ پندرہ ہزار ذات اور آٹھ ہزار سوار کا منصب دار ہو گیا۔[1] اس کا وہی مرتبہ ہو گیا جو اس کے بڑے بھائی پرویز کا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ پُر اثر رتبہ پر پہنچ گیا۔ اس کو فتح نے عظمت دلائی اور نور جہاں کی قائم کردہ جماعت کی متفقہ کوشش نے صف اوّل میں کر دیا۔ اب وہ اپنے ہمعصروں اور حریفوں میں نمایاں حیثیت کا مالک ہو گیا۔

خرم شراب سے لب تر کرتا ہے

یکم فروری بروز جمعہ 1616ء کو اس کی شمسی سال گرہ اجمیر[2] میں منائی گئی۔ اب وہ چوبیس سال کا ہو گیا تھا لیکن کبھی اس نے شراب سے لب تر نہ کیا تھا۔ اس موقعہ پر اس کے باپ نے مے نوشی پر زور دیا۔ کہا "بابا اب تو صاحب اولاد ہو گیا اور بادشاہ اور بادشاہ کے لڑکے مے نوشی کرتے ہیں۔ آج سونے چاندی میں

تیرے تو لے جانے کا دن ہے۔ میں تجھ کو شراب دیتا ہوں اور ایسے موقعوں پر مثلاً سال نو اور دوسرے خاص اوقات پر پینے کی اجازت بھی دیتا ہوں لیکن تجھ کو راہِ اعتدال پر رہنا ہے کیونکہ عقلمند لوگ اس حد تک مے نوشی کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ عقل سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ ضروری ہے کہ شراب پینے پلانے سے صرف فائدہ اٹھایا جائے۔ شہزادہ کو مجبوراً باپ کا کہنا ماننا پڑا۔ اگرچہ بعدازاں ایک موقع پر اس نے توبہ کی اب کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ مگر یہ توبہ صرف توڑے جانے کے لیے تھی۔

دکن میں صورت حال

اگرچہ جہانگیر اجمیر میں مزے سے وقت گزار رہا تھا لیکن سلطنت کے سیاسی حالات سے بے خبر نہیں رہا۔ وہ دکن کے حالات کا غور سے مطالعہ کر رہا تھا اور اپنے افسروں کی ناکامی پر مایوس تھا اس نے خود وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اسی خیال سے عبدالکریم ماموری کو مانڈو روانہ کیا تاکہ وہ اس کے لیے ایک نیا مکان تعمیر کرے اور پرانے حکمرانوں کی تعمیرات کی مرمت کرادے[3] لیکن کچھ دنوں کے لیے اس نے اپنا جانا اس لیے ملتوی کیا کہ خانخاناں کی ان جدید کارگزاریوں کا نتیجہ دیکھ لے جو کھوئی ہوئی مغلیہ عظمت کے دوبارہ برقرار کرنے کے لیے وہ کر رہا ہے۔ خانخاناں کو حصول مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی لیکن افسروں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے اس کی ترقی کی رفتار سست ہوگئی علاوہ بریں اس کی رشوت ستانی کی اطلاعات اب تک دربار میں پہنچ رہی تھیں اس لیے جہانگیر کو یقین آگیا کہ اس منصوبہ کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے جو اس نے پہلے سوچا تھا[4]

خرم کا تقرر دکن کے لیے

منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے خرم کا منصب بڑھا دیا گیا اب وہ بیس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کا منصب دار بنادیا گیا۔ پرویز کو دکن سے ہٹا کر الہ آباد بھیج

دیا گیا اور اس کی جگہ شہزادہ خرم کو نامزد کیا گیا اس لیے کہ اس کی اصابت رائے اور حالات سمجھنے کی صلاحیت مسلم[5] تھی اولاد اکبر کے لیے جہانگیر کا یہ بڑا نا منصفانہ فیصلہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عملی اقدام میں اور ماتحتوں کو کام پر لگانے کی صلاحیت اس میں کم تھی لیکن یہ بڑی زیادتی تھی کہ دکن میں ناکامیابی کا سارا الزام اسی کے سر تھوپا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز کی مناسب امداد کبھی نہ کی گئی۔ وہ برائے نام سپہ سالار تھا۔ اصل اختیارات اس کے ماتحتوں کے ہاتھ میں تھے وہ اس کو خاطر میں نہ لاتے تھے جہانگیر کو چاہیے تھا کہ از روئے انصاف اس کو بھی وہی موقعہ دیتا جو اس نے اپنے چہیتے بیٹے کو دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرویز کی ترقی کے امکانات کی قربانی چھوٹے بھائی کو عروج دینے کے لیے کی گئی۔

خرم، عبداللہ خاں کی وکالت کرتا ہے

شہزادۂ خرم کو موقعہ دیا گیا کہ وہ دکن کے حالات کی تہ تک پہنچ سکے۔ جہانگیر نے وہاں کے سارے اختیارات اسی کو دے دیے۔[6] یہ وہ وقت تھا جب عبداللہ خاں فیروز جنگ پر بے اعتدالی کے الزامات لگائے گئے۔ وہ گجرات بلا لیا گیا۔ پراگندہ خاطر ہونے کی وجہ سے وہ اجمیر کے لیے پیدل چل پڑا۔ یہاں پہنچ کر اس نے خرم کی ہمدردی حاصل کی۔ خرم[7] نے باپ سے اس کی سفارش کی۔ اس کے قصور معاف ہوئے۔ حکم ہوا کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ دکن جائے۔ وہ ایک تجربہ کار افسر تھا اور خرم کی خوش قسمتی تھی، کہ اس موقعہ پر اس کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ وہ ایسے علاقے میں جارہا تھا جس سے اُسے واقفیت نہ تھی۔ وہاں کے افسر اس کے دشمن تو نہ تھے مگر بے گانگی ضرور تھی۔ سوال یہ ہے کہ عبداللہ خاں جیسے آدمی کی امداد ایسے حالات میں کارآمد نہ ہوتی؟

خرم کو شاہ کا خطاب ملا

روانہ ہونے سے پہلے شہزادہ نے اپنے چیدہ فوجیوں کی پریڈ شہنشاہ کے سامنے ایوان عام میں دکھائی۔ جہانگیر اتنا مطمئن ہوا کہ اس نے خرم کو شاہ کا خطاب دیا۔ یہ

ایک نادر اعزاز تھا۔ اس سے پہلے کبھی کوئی شہزادہ حکمراں بادشاہ کی زندگی میں شاہ نہیں کہا گیا[8] ہو سکتا ہے کہ اس اقدام میں جہانگیر کا جذبہ غرور کار فرما ہوا ہو۔ ایرانی سفیر[9] دربار میں موجود تھا۔ شاید اسی کو یہ دکھانا تھا کہ جہانگیر اس ایرانی سفیر کے آقا سے عظیم تھا۔ کیونکہ اس نے وہی خطاب اپنے ایک لڑکے کو دیا جو ایران کے بادشاہ کا ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ نفسیاتی عمل اس کے اس خطاب کا نتیجہ ہو جو الہ آباد[10] میں بحیثیت شہزادہ اس کے دماغ میں آیا تھا۔ بہر حال یہ خطاب، دینے والے اور پانے والے دونوں کے لیے باعثِ افتخار تھا۔

دکن جاتا ہے

فتح و شہرت کے لیے باپ کی پُر جوش دعاؤں[11] کے ساتھ 6/اکتوبر 1616ء کو شاہ خرم اجمیر سے روانہ ہوا۔ علاوہ دلیر فیروز جنگ کے اور بہت سے افسر ہمرکاب تھے ان میں سب سے زیادہ اہم راجہ سورج سنگھ اور دیانت خاں تھے۔ معتمد خان فوج کا افسر خزانہ[12] تھا۔ راستہ میں بمقام دود پور[13] رانا امر سنگھ سے ملاقات ہوئی جس نے پندرہ سو گھوڑوں کا رسالہ کرن سنگھ کی ماتحتی میں ساتھ کر دیا۔ چل کر وہ دریائے نربدا تک پہنچا۔ یہاں دکن کے افسروں بشمول خان خاناں خاں جہاں اور مہابت خاں نے اس کا استقبال کیا۔ سرحد پر بغیر زیادہ قیام کیے وہ سیدھے برہان پور[14] کوچ کر گیا اس مقام پر وہ 6/مارچ 1617ء کو پہنچا۔

دکن میں امن

اس کی آمد سے دکن کے سیاسی ماحول میں حسب خواہش تبدیلی ہوئی۔ عادل شاہ اور ملک عنبر نے دیکھا کہ ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک رہی ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے شہزادۂ خرم کے اشارۂ صلح کو لبیک کہا۔ اور پندرہ لاکھ روپیہ مالیت کے تحفے نذر کیے۔

ملک عنبر نے بالا گھاٹ واپس کیا اور احمد نگر اور دوسرے قلعے سپرد کر دینے پر رضا مند ہو گیا۔ اس طرح صلح و آشتی کے ساتھ فتح حاصل ہو گئی۔ اسلحہ سے جو

کچھ اب تک حاصل نہ ہو سکا تھا وہ تھوڑے وقفہ میں صرف حکمت عملی سے مل گیا۔ اس کامیابی کا سہرا شاہ خرم کے سر رہا۔ میواڑ میں وہ دانشمند سپہ سالار نمایاں ہوا اور دکن میں ہوشیار سیاست داں ثابت ہوا۔ نئے علاقوں کے نظم و نسق کا معقول انتظام کرنے کے بعد خانخاناں اور شاہ نواز خاں کو ذمہ دار بنا کر وہ شمال کی طرف باپ سے ملنے چلا گیا۔

جہانگیر کی مسرت

مانڈو میں جہانگیر اپنے لڑکے کی کارگزاری کے نتائج کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سید عبداللہ بارہہ انتظامات کی خبر لایا۔ فتح[17] جشن منانے کے لیے نقارے بجائے گئے۔ اس کے بعد شہزادے کا ایک خط ملا جس میں یہ خبر تھی کہ افضل خاں اور راجہ رامان، عادل شاہ کے سفیروں کے ساتھ حاضر خدمت ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ جواہرات ہاتھی اور گھوڑے اتنے لائے تھے کہ ایسے نذرانے کسی وقت کسی حکومت کو نہیں ملے تھے۔ شہزادہ خود 12/ اکتوبر 1617ء کو پہنچا۔ دربار عام میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس نے مناسب طور سے سلامی اور زمین بوسی کی رسوم ادا کیں۔ جہانگیر نے اسے جھروکہ میں بلایا بے پناہ عنایت و مسرت سے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ محبت کے ساتھ بغلگیر ہوا۔

شاہ خرم کا نیا خطاب

شاہ خرم کو تخت کے قریب جگہ ملی۔ تیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کا عدیم المثال منصب ملا۔ اور ساتھ ہی ساتھ شاہجہاں کا خطاب بھی عطا ہوا۔ اس پر باپ نے بے دریغ زر و جواہر نثار کیے۔ نور جہاں نے اس موقعہ پر شان دار دعوت کی۔[18]

شہزادہ کے بعد ایسے افسروں کی باری آئی جو دکن سے اس کے ساتھ اس لیے تھے کہ شہنشاہ کو نذریں گزاریں۔ سب سے پہلے خان جہاں لودی نے ایک ہزار روپیہ اور ایک ٹوکری بھر کے جواہرات بطور پیشکش نذر دی۔ اس کے بعد مہابت

خان راجہ بھاؤ سنگھ داراب خاں ولد خان خاناں سردار خان برادر عبداللہ خاں دیانت خان شہباز معتمد خاں بخشی اور اودے رام دکنی نے نذریں پیش کیں۔ تحفے قبول کیے گئے اور ان کی خدمات کی تعریف ہوئی۔

شاہجہاں کے تحفے باپ کے لیے

ڈیڑھ ماہ کے بعد شاہجہاں نے باپ کو وہ بیش بہا جواہرات اور قیمتی اشیاء دکھائیں جو وہ دکن سے بادشاہ کے لیے لایا تھا۔ 20/نومبر 1617ء یہ سب سامان ایوان خاص میں جھروکہ کے سامنے ترتیب سے آراستہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ طلائی و نقری ساز وزین کے ساتھ گھوڑے اور ہاتھی بھی کھڑے کیے گئے۔ بیٹے کی خوشنودی کے لیے جہانگیر نیچے آیا تاکہ چیزوں کو قریب سے بالتفصیل دیکھ سکے۔ قیمتی موتی آبدار ہیرے خوشنما لعل اور خوشرنگ و نازک زمرد سب ہی کچھ اس سامان میں نظر آیا لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ پانچ کوہِ پیکر اور متناسب اعضاء کے ہاتھی تھے۔ مجموعی حیثیت سے سارے سامان کی مالیت بائیس لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ تھی۔ اس میں سے دو لاکھ روپے شہزادے نے اپنی سوتیلی ماں نور[19] جہاں کو نذر کیے۔

گجرات کا سفر

دکن کے مسائل فی الحال حل ہو گئے تھے۔ جہانگیر کو ہاتھی کے شکار کے شوق نے گجرات کے سفر پر آمادہ کیا۔ مریم زمانی اور دوسری بیگمات اور حرم کے دوسرے اشخاص و سامان کو آگرہ روانہ کر دیا خود احمد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ نور جہاں اور شاہجہاں ساتھ تھے۔ سفر تفریحی مشغلہ تھا راستہ میں دھار اور کمبے کی سیر کی گئی۔ بالآخر بادشاہ منزل مقصود[20] پر 5/جنوری 1618ء کو پہنچا۔

جام پر فتح

دکن کی کامیابی کے صلہ میں گجرات کا صوبہ شاہجہاں[21] کو دیا گیا۔ اس کے جزیرے نما حصہ کے ایک طرف ایک جزیرہ ہے جس کو کچھ کہتے ہیں۔ اس کے

حکمراں کو بہارا کہتے تھے اس خاندان کا ایک دوسرا شخص ہے وہ جام کہلاتا تھا وہ کاٹھیاوار کے شمالی کنارے پر قابض تھا۔ ان دونوں نے عارضی طور پر اکبر کے دور میں اطاعت قبول کرلی تھی، لیکن بعد میں آزاد ہوگئے۔ شاہجہاں نے راجہ بکرماجیت کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ جام پہلے زیر ہوا۔ مارچ 1618ء کو جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور چار ماہ بعد دوسرا حاکم بھی حاضر ہوا۔[22]

شاہجہاں کی علالت

گجرات کا چندروزہ قیام جہانگیر کو پسند نہ آیا۔ وہاں کی حبس اور گرد سے وہ پریشان ہوگیا۔ شاہجہاں اور وہ دونوں مئی 1618ء میں بیمار ہوگئے۔ شاہجہاں اتنا کمزور ہوگیا کہ دس دن تک وہ اپنے باپ کو سلام کرنے کے لیے نہ حاضر ہوسکا۔[23] برسات کے زمانہ میں وہاں سے سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ برسات کے بعد جہانگیر 2/ستمبر 1618ء کو آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ مالوہ ہوتے ہوئے وہ 1619ء جنوری کی ابتدا میں دارالسلطنت کے قریب پہنچا۔ شہر میں طاعون تھا جہانگیر نے فتح پور میں رُک جانے کا فیصلہ کیا۔ 7 جنوری کو وہ فتح پور پہنچا اسی دن شاہجہاں کی اٹھائیسویں شمسی سالگرہ منائی گئی۔ 9 دن بعد جہانگیر نے اسے اُس محل کی سیر کرائی اور اکبر کی بنوائی ہوئی ساری عمارتوں کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

شاہجہاں کی ماں کا انتقال

آٹھ اپریل بروز جمعہ جب دربار کا قیام نور منزل میں تھا۔ شاہجہاں کی ماں کا انتقال ہوا۔ دوسرے دن جہانگیر، شاہجہاں کے گھر ماتم پرسی کے لیے گیا اور اسے اپنے ساتھ اپنے محل لے گیا۔ دوسرے دن شہنشاہ سرکاری طور پر دارالسلطنت میں داخل ہوا۔ یہاں چھ مہینہ قیام کیا۔ اکتوبر میں آگرہ سے کشمیر روانہ ہوا۔ حسب معمول سفر سست رفتار اور آسان تھا راستہ میں شکاری تفریح کا انتظام ہوا، دعوتیں ہوئیں۔ پالم پر جہانگیر نے دو ہرن اپنی بندوق سے مارے اس طرح تفریحی رفتار سے یہ لوگ 20/مارچ 1620ء کو سری نگر پہنچے۔ جہانگیر نے

ہندوستانی بہشت کا پورا لطف اٹھایا۔ اگرچہ کبھی کبھی دکن کی خبروں سے پراگندہ خاطر ہوا۔ دکن کے حالات کی وجہ سے اکتوبر میں کشمیر بالآخر چھوڑنا پڑا۔

کانگڑا کی فتح

اس اثنا میں ایک خبر نے اس کو حقیقی اطمینان دلایا 1615ء سے مسلسل حملے کانگڑا کے مشہور قلعہ پر[25] ہوتے رہے۔ کوئی نہ کوئی وجہ ایسی ہو جاتی تھی کہ شاہی فوجوں کا حملہ ناکامیاب ہو جاتا۔ اگست 1618ء میں شاہجہاں نے اس مہم کو ختم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس نے راجہ بکرماجیت کو قلعہ مسمار کرنے کے لیے بھیجا۔ آخرالذکر نے پہلے قلعہ کے راستے بند کیے اس کے بعد محاصرہ سخت تر کر دیا۔ یہاں تک کہ فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

دوبارہ دکن

لیکن سلطنت کے دوسرے حصہ میں حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ شاہجہاں کی دکن کی فتح جو لاف وگزاف کا بھی سبب تھی۔ ایک کھوکھلی صلح معلوم ہوئی، جو معاہدے نظام شاہ اور عادل شاہ نے کیے تھے ان میں رتی بھر ثبات نہ تھا۔ وہ حسب موقع وضرورت توڑ دینے کے لیے کیے گئے تھے اور اب وہ وقت آپہنچا تھا۔ شہنشاہ بہت دور کشمیر میں تھا اور اس کا بہادر لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ درجہ اول کے افسروں، سالاروں کی اچھی خاصی تعداد کانگڑا میں مصروف تھی۔ دکن میں مغل لوگوں کے سپہ سالار کو کمک پہنچنے کے بہت کم امکانات تھے۔ اس لیے احمد نگر کی کھوئی ہوئی حکومت وعظمت واپس لینے کے لیے ملک عنبر نے اپنی جدوجہد شروع کی۔

ایک مشترک دشمن کے خلاف ملک غیر کو دو اور سلطنتوں کی امداد حاصل ہو سکی۔ قطب شاہ نے روپیہ اور عادل شاہ نے اپنے آدمی کمک کے لیے دیے۔ ملک عنبر نے ۵۰ ہزار کی فوج سے مغلوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ اس نے حال ہی میں سبک رفتار مرہٹہ رسالہ کو منظم کیا تھا۔ اس رسالے نے گوریلا

طریقہ جنگ سے دشمن کو پریشان کر دیا۔ آمد و رفت کے ذرائع کٹ گئے۔ سامان خورد و نوش آنا بند ہو گیا۔ مغلوں کو بالا گھاٹ کے باہر کر دیا گیا۔ شاہی فوج ہسکر تک پسپا ہو گئی اور وہاں تین مہینے تک دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ لیکن غلہ کی کمی سے مجبور ہو کر وہ اور پیچھے ہٹی۔ اس پسپائی نے دکنی فوجوں کو ہمت دلائی انہوں نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ لیکن غلہ کی کمی سے مجبور ہو کر برہان پور آ گئی بالا گھاٹ اور بیسن گھاٹ ملک عنبر کے قبضے میں آ گئے۔ اب صرف برہان پور اور احمد نگر باقی رہ گئے۔ دکنی فوجیں ان پر بھی چڑھائی کیے ہوئے تھیں۔

برہان پور میں خانخاناں بے حد خستہ حال تھا۔ وہ بادشاہ کو درخواست پر مدد کے لیے بھیج رہا تھا اپنے آخری مراسلہ میں اس نے لکھا کہ اب مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس نے اپنے گھرنے کی مثال عزیز کو کوکہ سے دی جو اکبر کے عہد میں گجرات میں گھر گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بڑے دردناک انداز میں جہانگیر سے درخواست کی کہ آپ مجھے اسی طرح بچایئے جس طرح آپ کے باپ نے دودھ شریک بھائی کو بچایا تھا ورنہ اپنے لشکر کو قربان کرنے کے بعد میں بھی جوہر کی رسم ادا کروں گا۔ جب یہ درخواست جہانگیر کے سامنے پیش ہوئی۔ اس کا دل تڑپ اٹھا اس کو اپنے اتالیق کا بڑا احترام تھا، یاد آیا کہ اس کے باپ نے بڑی ناز برداری سے اس کو پروان چڑھایا تھا۔ اب تک تو کانگڑا کے جھگڑے نے اُسے معذور رکھا تھا وہ کوئی موثر مدد دکن نہیں بھیج سکا۔ لیکن اب وہ جھگڑے ختم ہو گئے تھے اور افسروں کو موقعہ تھا کہ وہ دکن جا سکیں۔

شاہجہاں دوبارہ بھیجا گیا

سوال یہ تھا کہ اس مہم کا رہنما کون ہو۔ جہانگیر کی نظر انتخاب میں بجز شاہجہاں کے کوئی اور نہ تھا وہ قابل اور محنتی تھا اور ضروری تجربات بھی رکھتا تھا۔ جب شہنشاہ نے اس کو خان خاناں کے مراسلات دکھائے تو وہ فوراً تیار ہو گیا لیکن

اس بار دربار میں اپنا مرتبہ بہت محفوظ نہ پاتا تھا۔ نور جہاں کے برتاؤ میں رشک کی لہر نظر آرہی تھی۔ باپ بھی متلون مزاج محسوس ہو رہا تھا وہ جماعت جس نے اب تک اس کی تائید کی تھی اس میں بھی خلل اندازی کے آثار نظر آئے حالانکہ وہ لوگ اب بھی اس کا پہلے کی طرح احترام کرتے تھے۔ خسرو کی طرف از سر نو نرم رویہ اور یہ افواہ کہ وہ نور جہاں سے قریب تر ہو رہا تھا اور اس کے باپ کی گرتی ہوئی صحت یہ سارے خیالات شاہجہاں کو محتاط بنانے کے لیے کافی تھے۔ اسی لیے اس نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ خسرو کو اس کے حوالے کر دیا جائے[27] اس کی درخواست منظور ہو گئی۔

مے نوشی ترک کرتا ہے

شاہجہاں کے ذہن میں یہ مہم عدیم الشال اہمیت کی حامل اور دشوار طلب تھی۔ اس کی طبیعت میں خود نمائی کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔ اس اہم صورتحال کو نمایاں کرنے اور عوامی ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی عمل کرنا کمزوری نظر آیا۔ شاہجہاں نے ہمیشہ بابر اور تیمور کو اپنے لیے مثالی نمونہ بنایا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے ان ہی بزرگوں کی طرح توبہ کی کہ وہ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا شراب کا سارا ذخیرہ دریائے چنبل میں پھینکوا دیا اور طلائی و نقری قیمتی جام تڑوا کر غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دیا۔

اجین پہنچتا ہے

مانڈو کے سپہ سالار محمد تقی نے اجین میں شاہجہاں کو خبر بھیجی کہ منصور کی قیادت میں آٹھ ہزار دکنی فوج نے نربدا پار کر لیا ہے۔ آس پاس کے اضلاع کو لوٹ کر اب قلعہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور قلعہ محفوظ نہیں ہے شاہجہاں نے محمد تقی کی امداد کے لیے ابوالحسن اور بیرم بیگ کو بھیجا۔ محمد تقی نے جب یہ سنا کہ کمک راستہ میں ہے تو قلعہ سے باہر نکل پڑا دشمن پر حملہ کر دیا۔ مار کر بھگا دیا۔ امدادی فوج کے آجانے پر محمد تقی نے جارحانہ حملے شروع کر دیے اور چار کروہ

تک اس کا پیچھا کیا۔ شہنشاہیت کے حامی واپس آئے اور اکبر پور میں خیمہ زن ہوئے۔[29]

مانڈو میں شاہجہاں کو خانخاناں کا ایک مراسلہ ملا جس میں یہ رائے دی گئی تھی کہ وہ جہاں ہے وہیں ٹھہر جائے، کیونکہ وہ خود برہان پور میں اس طرح گھر گیا ہے کہ آدمیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا اور دشمن کی تعداد ساٹھ ہزار ہے۔ شاہجہاں نے یہ تجویز نہ مانی۔ اس کی فتح کا راز تیزی اور اچانک حملہ میں تھا۔ اس کے خلاف وہ غنیم کی کثرت تعداد کی مخالفت بھی خاطر میں نہ لاتا۔ خوش قسمتی سے ٹھیک موقعہ پر عبداللہ خاں فیروز جنگ دو ہزار آدمیوں کا امدادی دستہ کالپی سے لے کر آگیا۔ شاہجہاں کے پاس اب کل ملا کر اٹھارہ ہزار آدمی تھے۔ 25/مارچ 1621ء کو وہ جنگی تیاریوں کے ساتھ مانڈو سے برہان پور کے محاذ جنگ کی طرف چل پڑا۔ عبداللہ خاں ہراول فوج کا سرغنہ تھا۔ راجہ وکرم جیت دست راست پر تھا اور ابوالحسن دست چپ پر شہزادہ خود قلب لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس طرح مجتمع و منظم طریقہ پر دریائے نربدا سے بغیر کسی حادثہ کے ساری فوج پار اتر گئی۔ جب شاہجہاں برہان پور کے قریب پہنچا تو خانخاناں تن تنہا اس سے ملنے آیا کیونکہ باقی لوگوں کو قلعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ آدمیوں کی قلت کی خبر پا کر دشمن قلعہ فتح کرنے کی کوشش کرے۔[30]

برہان پور میں داخل ہوتا ہے

شہزادہ 4/اپریل 1621ء کو برہان پور میں داخل ہوا۔ لیکن دکن کی سپاہ نے اس کی آمد کا کوئی خیال نہ کیا۔ شہر کے ارد گرد اپنی جگہ پر قدم جمائے رہی۔ یہاں مشورتی کونسل میں خانخاناں نے ایک بار پھر تاخیری رویہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی اس نے سمجھایا کہ فی الحال دشمن کو بھگا کر دریا پار کر دینا چاہیے اور بالا گھاٹ واپس لینے کے لیے برسات ختم ہونے تک مزید حملے ملتوی رکھے جائیں اس تجویز کی عبداللہ خاں اور داراب خاں نے مزید تائید کی کہ لیکن شہزادے نے

یہ تجویز رد کر دی بلکہ حکم دیا کہ دکن کی متحدہ حکومتوں کی فوجوں پر فوری اور موثر حملہ کرنے کی تیاری کی جائے۔[31]

دکن میں جنگ

شاہجہاں کے لیے اب فوجیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا سوال ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کے حل کرنے کے لیے اس نے بخشیوں کو حکم دیا کہ ان جاگیرداروں کو طلب کیا جائے جن کی زمینیں دشمن نے چھین لی ہیں۔ ان کو زر کثیر عطا کیا گیا۔ تاکہ جتنی جلد ممکن ہو اپنا حصہ پورا کریں۔ اس طرح کوئی تیس ہزار آدمی، تھوڑے وقفہ میں بھرتی کر لیے گئے۔ یہ لوگ پانچ رجمنٹ میں تقسیم کر دیے گئے ان میں دو دستے ایسے تھے جو خاص شہزادے کے آدمیوں پر مشتمل تھے۔ اور راجہ بھیم اور راجہ وکرم جیت ان میں سے ہر ایک کے کمانڈر تھے۔ بقیہ تین رجمنٹ میں سے ایک داراب خان کے اور ایک عبداللہ خان کے اور تیسری ابوالحسن کے سپرد ہوئی۔ نام کے لیے سپہ سالار داراب خاں تھا مگر حقیقتاً اصل اختیارات راجہ وکرما جیت کے ہاتھ میں تھے۔ افسروں کو مشورہ کرنا ہوتا، تو داراب خاں کے خیمہ میں باتیں کرتے۔[32]

چھاپہ مارون کی حرکات وسکنات کے پیش نظر ضروری تھا کہ ہر ممکن احتیاط برتی جائے۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ ہر رجمنٹ چار ٹکڑوں میں تقسیم کی جائے اور باری باری ہر دستہ فوج کے سامنے اور عقب کے حصوں کی حفاظت کرے۔ جس وقت مغلوں کی فوج آہستہ آہستہ دریا کی طرف بڑھ رہی تھی اسی وقت دکن سپاہ نے یاقوت خاں کی قیادت میں اس دستہ کی پشت پر حملہ کر دیا جس کا محافظ ابوالحسن تھا۔ ایک مختصر مگر اچھی خاصی جھڑپ کے بعد دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔ دریا پار للکاپور میں شاہی سپاہ پر پھر حملہ ہوا مگر پھر پسپا کر دیا گیا۔

ایسے دائیں بائیں آگے پیچھے حملے ہوتے رہے مغلیہ فوج بدقت تمام بالا گھاٹ میں داخل ہوئی۔ پار اُترنے میں گاہے گاہے دونوں فوجوں میں جھڑپ ہوتی

رہی۔ بالآخر شاہی فوج بمقام کھڑکی پہنچ گئی یہاں غار تگری کے جذبہ سے متاثر ہو کر انہوں نے وہ تمام عمارتیں مسمار کر دیں جو گزشتہ پندرہ سال میں تعمیر ہوئی تھی۔ 5/ مئی 1621ء میں شاہی فوج دولت آباد کی طرف اس مقصد کے لیے روانہ ہوئی کہ ملک عنبر پر دباؤ ڈال کر اس کو اطاعت پر مجبور کر دے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کا راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ دکن والوں نے ہر طرف سے اچانک حملہ کرنا شروع کر دیا۔ مغلوں کو انہوں نے سنگین سبق سکھایا اور دکھایا کہ انہوں نے جس مقصد کے پیش نظر قدم اٹھائے ہیں اس کا حاصل کرنا ناممکن ہے دولت آباد لینے کا ارادہ مغلوں کو ترک کرنا پڑا۔

شاہی فوج نے اب منصوبہ تیار کیا کہ احمد نگر کی امداد کے لیے روانہ ہو۔ شہر کو دکن والوں نے ہر طرف سے گھیر کر مشکل میں ڈال دیا تھا۔ مگر دکنی شاہی فوج کا راستہ روکتے تھے اور اس پر بار بار حملہ کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ راجہ وکرما جیت نے کوشش کی کہ کھلے میدان میں آکر وہ لڑیں لیکن حسب دستور سابق کچھ دیر تک وہ لڑ کر پھر اندر چلے گئے۔ شاہی فوج کے سامنے بڑی دشوار صورت تھی۔ وہ بہت دور تک دشمن کے ملک میں آگئی تھی۔ اس کے واپس جانے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ برسات قریب قریب آچکی تھی۔ گرمی شدت کی تھی۔

ان تفصیلات پر نظر رکھتے ہوئے شاہجہاں نے دوسری فوج محمد تقی کی قیادت میں برار اور خاندیش واپس لینے کے لیے اس موقعہ پر بھیجی جب دشمن بالا گھاٹ میں مصروف پیکار تھے۔ محمد تقی نے تیزی سے دکن والوں کو مار بھگایا اور دونوں صوبے اپنے قبضہ میں کر لیے۔ اس اثناء میں دشمن بالا گھاٹ میں پھر دکھائی پڑا۔ شاہجہاں نے محمد تقی کو بالا گھاٹ میں داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ اہم جنگی مقامات پر قبضہ کر لے اور ساتھ ہی ساتھ شاہی فوج تک پہنچنے کے راستے پھر سے قائم کر لے اس مقصد کو رد کرنے کے لیے ملک عنبر نے آٹھ ہزار آدمیوں کو آتش خان کی قیادت میں مقابلہ کے لیے بھیجا شاہجہاں نے راجہ بھیم کو حکم دیا کہ

محمد تقی کی امداد کی جائے ان دونوں نے مل کر "باسم" پر قبضہ کیا اور دشمن کو وہاں سے بھگادیا۔ ان سب باتوں کے باوجود احمد نگر پر دباؤ کم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے شہزادے نے سوچا کہ ناسک اور سنگم نیز کو فوج روانہ کی جائے اس منصوبہ پر عمل درآمد ہونا آسان نہ تھا لیکن ملک عنبر گھبرا گیا۔ اس نے صلح کی گفت وشنید شرع کردی۔

عنبر کی اطاعت

عنبر کے نمائندے نے پٹن میں راجہ وکرماجیت سے ملاقات کی۔ یہاں راجہ ایک بڑی فوج کے ساتھ مقیم تھا۔ ملک عنبر کی پیشکش یہ تھی کہ جو علاقہ کبھی مغلوں کے قبضہ میں تھا اس سے ہم لوگ دستبردار ہو جائیں اور دونوں حکومتیں تاوان جنگ ادا کریں راجہ نے کہا جب تک ملک عنبر احمد نگر سے چلا نہ جائے اور سامان رسد ہمارے سپاہیوں کو بلا مزاحمت نہ مل جائے ہم کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔

دکن میں امن

ملک عنبر کے وعدے کی صداقت پر بھروسہ کرکے راجہ وکرماجیت نے پھر صلح کی بات چیت کی اور صلح ہو بھی گئی۔ اس طرح ایک بار پھر طاقت اور شاہجہاں کی حکمت عملی سے امن قائم ہو گیا۔ دکن میں ہمیشہ کی طرح یہ فتح بھی دیرپا نہ تھی۔ دکن مغل سلطنت کے لیے سرطان ہو گیا اور اس کی طاقت کو اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ لیکن شاہجہاں کو دکن میں دوبارہ شان وشوکت نصیب ہوئی۔ اس کی دولت اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ جسب معمول اس نے اپنی فتح کی خبر باپ کو دھوم دھام کے ساتھ بھیجی۔ اس نے اپنی اس کامیابی کو اکبر کی گجرات کی فتح سے تشبیہ دی بلکہ جہانگیر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی کارگزاری اکبر کی فتح سے برتر ہے۔ طفلانہ دلائل جو اس نے اپنے دعوؤں کے ثبوت میں پیش کیے پڑھنے میں پرلطف ہیں۔ کچھ بھی ہو وہ اپنے اقتدار کے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔[33]

باب 3

گہن اور طلوع

شاہجہاں کا مرتبہ

اب شاہجہاں 30 سال کا ہو گیا تھا۔ بچپن سے اس کی پرورش حوصلہ مند خیالات میں ہوئی تھی۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ میرے تمام پوتوں میں خرم میرے مشابہ ہے۔[1] جہانگیر بھی اس پر ایسی جان چھڑکتا تھا۔ اس کو خوش کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔[2] جب وہ صرف سوا سال کا تھا تو حصار فیروز پور کی جاگیر جو بطور گزارہ معاش ولی عہد کو دی جاتی تھی وہ اس کو عطا کی گئی۔ یہ اس کی زندگی میں ایک موڑ تھا۔ اس کے بعد ہی سے اس کے ہر منصوبے اور اس کی زیر قیادت ہر جنگ میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اس تیزی و آسانی سے اس کو عظمت حاصل ہو گئی کہ وہ کسی قدر مغرور و ضدی بھی ہو گیا۔[3] لیکن بایں ہمہ اس کے دائرہ اثر میں کمی نہ آئی۔ بلکہ اس کے خلاف یہی خصوصیات اس کے ساتھیوں کو اس کے وقار کے لیے مناسب معلوم ہوئیں۔ وہ سلطنت کا اعلیٰ ترین منصب دار تھا، سب سے زیادہ زرخیز جاگیر کا مالک اور حکومت مغلیہ کی بہترین فوج کا سپہ سالار اس کی نظریں تخت شاہی پر تھیں۔

اس کے حوصلے مرجھا گئے

کچھ سال پہلے کوئی رکاوٹ اس کے اور حصول مقصد کے درمیان حائل نہ تھی لیکن بہت تھوڑے عرصہ میں صورت حال بدل گئی۔ اس کی امیدوں پر سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ وہی قوتیں جنہوں نے اب تک اس کی مدد کی تھی اب اس کے خلاف ہو گئیں۔ اس کے سرگرم دوست اس کے جانی دشمن ہو گئے وہ اس صورت حال کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے ان محرکات سے بچنے کی کوشش کی یا کم از کم خوفناک مصیبت کو بدلنے کی کوشش کی لیکن اس وقت بیدار ہوا پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس نے مخالف حالات کا سامنا زوروں سے کیا۔ مگر جو تصادم پیدا ہوا وہ سخت بھیانک تھا۔ اس کی بغاوت دو زبردست حوصلہ والوں کی جنگ تھی۔ جن میں سے ہر ایک اپنے مخالف کو دبانے کی فکر میں تھا۔

خطرے کے آثار

دکن میں دوسری فتح کے بعد شاہجہاں نے کچھ ناموافق حالات دیکھے۔ نور جہاں سے وہ پہلے ہی مشتبہ تھا لیکن اب یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کا باپ پہلے کی طرح اس پر مہربان نہ تھا۔ چنانچہ جب افضل خاں نے جہانگیر کو اس بار فتح کا مژدہ سنایا تو جہانگیر کے اظہار مسرت میں یک گونہ سرد مہری محسوس ہوئی۔ اپنے توزک میں تو اس نے واقعات دکن کو رقم کرتے ہوئے اظہار اطمینان کیا لیکن پہلے کی طرح تعریف و توصیف کا جوش مفقود ہے۔ نہ تو فاتح پر اس بار تازہ اعزاز کی بارش ہوئی، نہ نقارے بجائے گئے نہ جشن فتح پر شاہانہ دعوت ہوئی یہ باتیں خطرے کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ شاہجہاں کو اپنے حریفوں کے بارے میں سوچنا پڑا اور وہ کون تھے؟

شہریار

افق سیاست پر شہریار نمایاں ہو رہا تھا، اس کو آٹھ ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب دیا جا چکا تھا اس کی شادی ملکہ کی لڑکی کے ساتھ ہو چکی تھی[5] لیکن ابھی تک کوئی ایسی علامت نظر نہ آتی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ جہانگیر اس کو اپنا

جانشین نامزد کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے جب شجاع بیمار پڑا تو اس پر ایک خاص تردد طاری تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ اب کبھی بندوق سے شکار نہ کروں گا اس کے علاوہ اس کی شفایابی کی دعائیں بھی مانگی۔ جب شاہجہاں نے گھوڑوں کی رسد مانگی تو اس نے حکم دیا کہ فوراً ایک ہزار گھوڑے شاہی اصطبل سے بھیج دیے جائیں[7] بایں ہمہ معاملہ فہمی کے لیے صرف شہنشاہ کے ارادوں پر نظر نہ رکھنی چاہیے وہاں ایک ملکہ کا بھی غلبہ تھا۔ ملکہ کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے اعتمادالدولہ کا سارا جما جمایا کارخانہ اس کو دے دیا تھا اور یہ بھی حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے نقارے کے بعد اس کے نقارے و ساز بجائے جائیں[8] وہ اس فکر میں تھی کہ دوسرے امراء بھی اس کے قابو میں آجائیں۔ چنانچہ شہنشاہ کی قمری سال گرہ کے موقع پر اس نے چوالیس امراء کو خلعت سے سرفراز فرمایا۔[9]

پرویز

شاہجہاں کا دوسرا حریف پرویز تھا، جو سردست باپ کی خاص مراعات سے نوازا جا رہا تھا۔ چند مہینوں میں دو نامہ برپے درپے اس کے پاس بھیجے گئے۔ پہلے اعتمادالدولہ اس کے پاس ایک خلعت[10] خاص اعزاز لے کر گئے۔ اس کے بعد راجا سارنگ دیو[11] دوسرا خلعت، ایک کمربند مرصع جس میں ایک نیلم اور کئی ایک لعل تھے۔ اس کے لیے لے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے بہار کے تبادلے کا حکم لے کر گئے۔ پرویز الہ آباد میں تھا اب اس کا تبادلہ زیادہ زرخیز اور وسیع تر صوبہ میں کیا گیا۔ پرویز اس محبت اور شفقت کی تازہ عنایات کے اظہار تشکر میں آگرہ گیا اور اپنے بیمار باپ کے بستر کے اردگرد اس نے اصرار کر کے طواف کیا۔[12]

خسرو

تیسرا حریف خسرو تھا جس کی قسمت میں طوفانی کردار اور خونین قبر تھی اس وقت وہ قیدی کی حیثیت سے شاہجہاں کے قبضہ میں تھا۔ اپنے راستہ سے ہٹانے کے لیے شاہجہاں نے اس کو عمداً قتل کر دیا۔ انفنسن اور بیورج نے شاہجہاں کے

اس جرم میں ملوث ہونے کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن عہد جہانگیری کا مورخ بے شمار شہادت اس جرم کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔[14] یہ شہادتیں اگرچہ ضخامت کے لحاظ سے کافی ہیں لیکن نوعیت کے لحاظ سے براہ راست نہیں ہیں۔ کیونکہ ولایتی سیاحوں کے بیانات پر مبنی ہیں۔ بدقسمتی سے ایک عصری ذریعہ کو نظر انداز کیا گیا۔ محمد صالح کمبوح نے شاہجہاں کی زندگی میں لکھا اور وہ شہنشاہ کی مدح میں خسّت سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس صورت میں اس کا ثبوت بالکل قابل اعتماد ہے۔ اور اس کا بیان اس واقعہ کے سلسلے میں ایک تفصیلی اقتباس کا مستحق ہے۔

قتل کی شہادت

"اس فانی دنیا میں بالکل جائز ہے کہ عظیم حکمراں اپنے ان بھائیوں اور رشتہ داروں کے وجود سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ان کو ختم کردے جن کا ختم کرنا عوام کے لیے مفید ہو۔ دین اور دنیا کے رہنما جائز سمجھتے ہیں کہ تخت مبارک کے مخالف حریفوں کو نیست و نابود کردیا جائے بشرطیکہ یہ اقدام عوام کی فلاح و بہبود پر مبنی ہو اور ایسے ہی دانشمند مشیر کاروں کی رائے پر شہنشاہ جہانگیر نے مے نوشی کی حالت میں 22/ فروری 1621ء بروز دوشنبہ شاہ بلند اقبال (شاہجہاں) کے سپرد خسرو کو کیا تھا جسے دوشنبہ کے دن 22/ فروری 1621ء کو زندان کے گڑھے سے نکال کر نیستی کے میدان میں پہنچا دیا گیا۔ شک و شبہ دور کرنے کے لیے مرحوم شہزادہ کا جنازہ مناسب اعزاز و احترام کے ساتھ برہان پور میں گشت کرایا گیا۔ سربرآوردہ اشخاص اور افسران جنازے میں شامل تھے اور دعائیں مانگتے جاتے تھے۔ سہ شنبہ کی رات کو عالم گنج میں دفن کیا گیا۔[15]

اس اقتباس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ واقعات مسلم الثبوت ہیں۔ ان سے قتل کی نیت اور ساتھ ہی ساتھ قتل کا جواز بھی ملتا ہے یہ تحریر اس شخص کی ہے جو دربار شاہی سے قریب تھا۔ اس کی رسائی سرکاری

کاغذات تک تھی۔ علاوہ بریں وہ کسی طرح بغیر پر اثر ثبوت کے شاہجہاں کو اس بھیانک جرم کا مرتکب نہیں قرار دینا چاہتا۔ تعجب ہے کہ یہ خبر خسرو درد قولنج سے مرا کوئی وسوسہ جہانگیر کے ذہن میں پیدا نہ کر سکی۔[16] اس نے اس واقعہ کو خاموشی اور غیر جذباتی انداز کے ساتھ اپنے توزک میں لکھا ہے۔

شاہجہاں کی غلطی

عصری مورخ اس پر خاموش ہیں کہ دکن میں اس بے رحمانہ قتل کا اثر ایوان شاہی پر کیا پڑا۔ لیکن یقین ہے کہ اس سفاکانہ جرم کرنے والے کے خلاف جذبات سخت ہوئے ہوں گے۔ شاہجہاں کے بعض ہمدرد امراء جو خسرو کے طرف دار تھے اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے لیکن شاہجہاں نے ایسے جذبات کی پروانہ کی وہ خاموشی سے صورت حال کو دیکھتا رہا۔ واقعات تیزی سے حرکت میں آرہے تھے۔ شاہجہاں نے ضروری سمجھا کہ جلد کوئی فیصلہ کرے پھر بھی یہ کہنا غلط ہے کہ اپنے دشمنوں کی کارروائی کی وجہ سے وہ جلدی باغی ہو گیا۔ بلکہ جہانگیر کو ابھی اس پر شک بھی نہیں ہوا تھا نہ نور جہاں نے کوئی شکایت کا موقعہ دیا تھا۔ کہنا پڑتا ہے کہ جدوجہد کی ابتدا شاہجہاں کی طرف سے ہوئی۔

شاہ عباس اور قندھار

کچھ عرصہ سے یہ اطلاعات مغل دربار میں آرہی تھیں کہ عباس شاہ قندھار واپس لینا چاہتا ہے، لیکن جہانگیر کو انہیں باور کرنے میں تکلف تھا۔ وہ شاہ ایران کے ظاہری اخلاق اور خیر سگالی پر اعتماد کرتا تھا۔ سفیروں کے تبادلہ کا سلسلہ برابر قائم تھا اس وقت بھی زنبل بیگ دربار میں مقیم تھا۔ اگر شاہ ایران کو رشتہ منقطع کرنا تھا تو اس نے اپنے سفیر کو ہندوستان میں کیوں رہنے دیا؟ جہانگیر دل میں اسی طرح سوچتا تھا۔ چنانچہ بغیر وسوسہ کے وہ کشمیر کی سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راول پنڈی پہنچ کر اس نے رائے بدلی۔ اس نے زین العابدین بخشی الحدیث کو شاہجہاں کے بلانے کے لیے بھیجا کہ وہ تیز رفتاری سے آئے اور اپنے ساتھ فاتح فوج

لائے۔ یہ بھی حکم تھا کہ وہ کوہ پیکر ہاتھی اور متعدد توپیں جو صوبہ (دکن) کے لیے اسے دی گئیں تھیں اسے لیتا آئے۔[17]

شاہجہاں کو موقع

قبل اس کے کہ شاہی پیامبر شاہجہاں تک پہنچیں، شاہجہاں کو یہ خبر مل گئی تھی، کہ شاہ ایران قندھار کو محاصرہ میں لے چکے ہیں۔ زین العابدین کے پہنچنے پر شاہجہاں نے محسوس کیا کہ اس کی خدمت طلب کی گئی ہیں۔ یہ موقعہ بہت مناسب ہے کہ وہ فائدہ اٹھائے اور اپنے دشمنوں کو شکست دے لیکن اپنی نافرمانی پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ برہان پور چلا گیا، تاکہ اپنے باپ سے یہ کہہ سکے کہ وہ شاہی احکام سے بے خبر تھا۔ راہ میں افضل خان راجہ بکرماجیت اور راجہ بھیم ملے۔ ان لوگوں کے پاس وہ زر کثیر تھا جو دکن کے حکمرانوں اور گونڈوانہ کے زمینداروں سے حاصل ہوا تھا اس موقعہ پر یہ دولت بڑی خوش آئند معلوم ہوئی۔ اس کے شکوک مستقبل کا حشر معلوم نہ تھا۔

برہان پور اور مانڈو کے درمیان کسی مقام پر شاہجہاں نے زین العابدین کو دربار واپس جانے کی پروانگی عطا کی۔ جو خط شہزادہ نے پیامبر کو دیا اس میں بڑی صفائی سے ان شرائط کا ذکر کیا جن کا پورا کرنا اس مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ضروری تھا۔ اس نے درخواست کی تھی کہ مانڈو میں اسے برسات تک رہنے دیا جائے اس کو اپنے افسروں کی ترقی و تنزلی کا اختیار دیا جائے اس کو صوبہ پنجاب سپرد کیا جائے، کافی روپیہ دیا جائے، ان مطالبات کی جارحانہ نوعیت کم کرنے کے لیے شاہجہاں نے ہر مطالبہ کی بظاہر خوشنما تشریح کردی۔ اس کی فوج کی وہ خستگی جو دکن کی مہم میں پیدا ہوئی تھی پہلے مطالبہ کی تائید کرتی تھی۔ اپنے ماتحتوں پر پورا قابو رکھنے کا خیال دوسرے مطالبہ کا جواز تھا۔ رسد کی بہتات و فراہمی اس متوقع طولانی جنگ میں جو شاہ عباس جیسے حکمراں سے پیش آنے والی تھی۔ تیسری اور چوتھی درخواست کی تائید کرتی تھی، اپنی عدم موجودگی میں تحفظ کا خیال جب وہ

ایسے دور دراز ملک میں ہوگا آخری مطالبہ کا جواز تھا لیکن یہ پردہ سنگین حقیقت چھپانے کے لیے بہت باریک تھا۔ شہزادے نے اپنا پردہ اتار پھینکا تھا۔[18]

جہانگیر کو دھکا لگا

جب زین العابدین نے جسارت کی یہ تحریر جہانگیر کے سامنے پیش کی اس کے جذبات کو بری طرح دھکا لگا قندھار کے محصور ہونے کی خبر ہی اس کی پریشانی کے لیے کافی تھی لیکن اپنے ایسے لڑکے کی نافرمانی پر جو کبھی سر تاپا حکم بردار تھا اس کو زیادہ صدمہ ہوا۔ اس نے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا صرف یہ حکم دیا سراول دکن بھیجے جائیں تاکہ سادات بارہہ اور بخارا شیخ زادے، افغانی اور راجپوت جلد سے جلد آسکیں اس سے پہلے اس کا منصوبہ تھا کہ پرویز اور شاہجہاں کو شمال مغربی سرحد پر بھیجے اسی لیے اس کے پاس پیامبروں کو بھیجا تھا لیکن جب آخر الذکر نے فولادی پنجہ دکھایا تو پرویز کو بلانے کی عجلت اور زیادہ ہو گئی۔ جہانگیر نے مرزا رستم اور اعتقاد خاں کو لاہور جانے کا حکم دیا تاکہ لڑائی کی ابتدائی تیاریاں کریں۔[19]

شاہجہاں کی پہلی ضرب

اس اثناء میں شاہجہاں نے پہلی ضرب لگائی۔ نور جہاں کی درخواست پر دھول پور کی جاگیر شہریاد کو دی گئی تھی لیکن شاہجہاں نے بھی اس کے لیے درخواست کی تھی اور اس اعتماد پر کہ درخواست منظور ہو گئی، اس نے اپنے آدمی قبضے کے لیے بھیج دیے تھے۔ جب شاہجہاں کے آدمی وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہریار کے افسروں کا اس پر قبضہ ہے۔ شاہجہاں کے آدمی بھی اپنے آقا کی طرح مغرور وضدی تھے وہ شہریار کے آدمیوں سے لڑ گئے اور زبردستی ان کو اس مقبوضہ سے بے دخل کر دیا۔ جب اس کی خبر جہانگیر کو پہنچی تو وہ بہت برہم ہوا۔ شاہجہاں کو وہ جملہ مراعات وشفقت کا نااہل سمجھا۔ چونکہ وہ اس منحرف شہزادے کے خلاف ابھی تک ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے صرف یہ حکم دیا کہ وہ معقولیت اور

اخلاق کی شاہراہ سے قدم باہر نہ رکھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ جہاں ہے وہیں ٹھہرے جن افسروں کی خدمات قندھار کے سلسلے میں ضروری سمجھی گئی ہے ان کو روانہ کردے۔ حقیقتاً نافرمانی کی صورت میں اس کو سزا کی دھمکی دی گئی تھی۔[20]

شاہجہاں کی جگہ پر شہریار

گمان غالب ہے کہ شاہجہاں نے اپنے رویہ کا قابل اطمینان جواب بھیجنے میں تاخیر کی، جس سے وہ دشمنوں کے ہاتھ میں جا پڑا۔ نور جہاں ایک مدت سے اپنے داماد شہریار کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی یہ موقعہ اس سے کار برآوری کا اچھا ذریعہ مل گیا۔ اپنے شوہر پر اس کا بڑا اثر تھا اب شاہجہاں کو نقصان پہنچانے کے لیے اس نے موقعہ کو اپنی سیاسیات کا حربہ بنالیا۔ جہانگیر سے شاہجہاں کے بارے میں اس نے بڑی غلط بیانی سے کام لیا۔ جہانگیر نور جہاں کی صحیح[21] و نیم صحیح بات کو سن لیتا تھا۔ چنانچہ وہ شہریار کو قندھار کی سرداری دلانے میں کامیاب ہو گئی۔ شہریار کا مرتبہ بڑھا دیا گیا۔ 12 ہزار ذات اور 8 ہزار سوار کا اُسے منصب دیا گیا۔ عین اسی دن جب اس کے داماد کا تقرر ہوا تو شہریار کو خوش کرنے کے لیے اس نے دو قیمتی ترکی موتی نذر کیے۔ ان کی قیمت ساٹھ ہزار روپے تھی اس کا غلبہ اب مکمل ہو گیا تھا اسی کے اشارے پر جہانگیر نے شاہجہاں کے درباری نمائندہ کو حاضری سے محروم کر دیا اس طرح نور جہاں کی فتح مکمل ہوئی۔[22]

افضل خاں کا مقصد

برخلاف اس کے شاہجہاں کے ہاتھ سے بازی نکلی جا رہی تھی۔ دوآبہ کی جاگیر اور حصار فیروزہ کی جاگیریں ضبط ہو گئیں۔ یقیناً اس کا نشانہ خطا ہو گیا ایک آخری تدبیر اس نے یہ کی کہ اپنے دیوان افضل خاں کو باپ کے پاس اس لیے بھیجا کہ اس کے امن پسند ارادوں کا یقین دلا کر آمادہ کرے کہ عورت کے مشورے پر عمل نہ کرے۔ قاصد کو جہانگیر نے بلایا لیکن اس کی باتوں کا اثر نہ لیا۔ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ شاہ جہان اپنی بے اعتدال حرکات پر عفو تقصیہ کا پردہ ڈالنا چاہتا

ہے اس لیے افضل خاں کا مقصد ناکامیاب رہا۔ ایک اعزازی خلعت دے کر اس کو رخصت کر دیا گیا اس کے فوراً بعد ہی احکام جاری ہوئے کہ صوبہ جات، گجرات، مالوہ، دکن اور خاندیش شاہجہاں کو عطا کیے گئے اور فرمائش کی گئی تھی کہ وہ انہیں مقامات میں کسی جگہ جہاں چاہے مستقل سکونت اختیار کرے۔[23]

شاہجہاں بغاوت کرتا ہے

افضل خاں کی واپسی اور اس کے حریفوں کی دربار میں کارگزاری نے شاہجہاں کو یقین دلا دیا کہ بات دور تک پہنچ گئی۔ اب وقت پیچھے ہٹنے کا نہیں ہے۔ اس طرح کسی اور کی وجہ سے نہیں خود اپنے غلط اقدام سے اس کو ایسا راستہ اختیار کرنا پڑا جو سلطنت اور اس کے دونوں کے لیے تباہ کن تھا۔ ایک طرف عزت شہرت کو زوال اور اس کے ان حوصلوں کی پامالی جو عرصہ دراز سے اس کے ذہن میں تھے اور دوسری طرف اعلانیہ بغاوت تھی۔ اس نے بغاوت پسند کی، تاکہ اس کے سہارے اپنے پہلے وقار کو پھر سے قائم کرے۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ دشمن کو ملک کے اہم حصوں میں بہ یک وقت گھیرے اس منصوبہ کے لحاظ سے اس نے جگت سنگھ ولد راجہ باسو کو اپنے ہی علاقہ میں بھیجا کہ پنجاب کے پہاڑوں میں انتشار پیدا کرے اور خود آگرہ چلا گیا۔[25]

ایک عجیب اتفاق

یہ ایک عجیب اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ جب سلیم نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی تو اس کی بھی کوشش آگرہ فتح کرنے کی تھی اور اب جب شہزادہ شاہجہاں نے بغاوت کی تو اس کو بھی یہی کوشش کرنی پڑی۔ وجہ تلاش کرنے میں دور نہیں جانا پڑا۔ آگرہ، شاہی حکومت کا دارالسلطنت تھا اور مغلوں کا خزانہ بھی وہیں تھا۔ اس لیے جو آدمی اس پر قبضہ کر لے اس کا پلہ بھاری ہو جائے لیکن دونوں موقعوں پر کوششیں ناکامیاب رہیں۔ پہلے موقعہ پر قولنج خان ناظم باغی شہزادے کے لیے بھاری پتھر ثابت ہوا اور موجوہ حال میں خواجہ سرا اعتبار خاں مد

مقابل ثابت ہوا۔ اس نے باغیوں[26] کے ہاتھ سے دارالسلطنت بچالیا جب شاہجہاں اپنی فوج کے ساتھ فتح پور سیکری کے قریب آیا اور اس نے آگرہ کی طرف قدم اٹھائے تو معلوم ہوا کہ دروازے اس کے لیے بند ہیں اس پر اس نے وکرماجیت کو بھیجا کہ شہر لوٹ لے وہ کامیاب ہوا۔ بہت سے امرا کو ان کی دولت سے محروم کر دیا۔[27]

جہانگیر کی قلبی تکلیف

شاہجہاں کا شمال کی طرف آنا جہانگیر کی دل آزادی کا باعث تھا عنایات، مراعات خطابات و مراتب، جو شاہجہاں کو اس نے دیئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے آگئے۔ ناامیدی کا یہ جھٹکا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا بڑے درد سے اپنے دماغی انتشار کا بیان کرتا ہے۔ درد وضعف کے عالم میں اور گرمی کے موسم میں میری جو صحت کے لیے نہایت نامناسب ہے۔ مجھ کو سواری کرنی پڑتی ہے سرگرم رہنا اور ایک نافرمان لڑکے کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور بھی ہونا پڑتا ہے۔ بہت سے ملازمین جن کو عرصہ دراز تک میں نے پروان چڑھایا اور امراء کے درجہ تک پہنچایا جن کو میں آج ازبک اور ایرانیوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا انہیں کو آج اپنے ہاتھوں سے بدمعاشی کی سزا دے کر تباہ کر دینا ہے۔

موسوی خان کا مقصد

اس اہم موقع پر اس کو غم وغصہ کا اظہار کرنا نامناسب تھا۔ شاہجہاں نے حکومت کو للکارا تھا۔ اس کو سزا ملنی چاہیے تھی۔ جب اس کو یہ خبر ملی کہ شاہجہاں آگرہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے موسوی خاں کو بھیجا کہ اسے اس حماقت سے باز رکھے۔ یہ قاصد شہزادہ کو فتح پور میں ملا۔ آخر الذکر نے عبدالعزیز کو اپنی تجویزات لکھ کر روانہ کیا۔ لیکن جہانگیر اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ حکم دیا کہ اس کو گرفتار[30] کر لیا جائے۔ موسوی خان کے بھیجے جانے کا مقصد وقت گزاری تھا۔ شہنشاہ کو شہزادہ پرویز کا انتظار تھا جس کے بلانے کے لیے تیز رفتار قاصد بھیجے گئے

تھے تاکہ جلد سے جلد وہ آ جائے۔

مہابت خاں کی آمد

اس اثناء میں مہابت خاں بھی دربار میں آ گیا، جس کو فوری طلب پر بلایا گیا تھا۔ فطرتاً شاہی معاملات کی نگرانی اس کے سپرد ہو گئی۔ اس نے فوراً شہنشاہ کو اطلاع دی کہ یہاں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو مفسدانہ انداز میں باغی شہزادے سے خط و کتابت کر رہا ہے اس گروہ کے سرغنہ محترم خان خلیل بیگ ذوالقدر اور فدائی خان ہیں ان سب کو گرفتار کرنے کا حکم ہو گیا ان کی حرکات کی تحقیق ہونے لگی۔ مرزا رستم نے خلیل بیگ کی بیوفائی کا حلف اٹھایا اس کے بیان کی تائید نور الدین قلی نے کی۔ اسی طرح ابو سعید نے محترم خان کی دغا بازی کا حلف اٹھایا۔ جہانگیر نے مہابت خان کو حکم دیا کہ دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ فدائی خان کے خلاف الزامات ثابت نہ ہو سکے اس کو آزاد اور بحال کر دیا گیا۔

شاہجہاں کا ہمدرد آصف خاں

اس میں شک نہیں کہ دربار میں کچھ لوگوں کی ایک ایسی جماعت تھی جن کو شاہجہاں سے ہمدردی تھی اس فہرست میں شہزادہ کا خسر آصف خاں سب سے زیادہ[33] اہم تھا اپنی دانشمندی اور چالاکی سے اس نے اپنے جذبات کو ایسا دبائے رکھا کہ جہانگیر کو آخر وقت تک اس کی وفاداری میں شک نہ ہوا اگرچہ وہ خاموش اور بظاہر غیر متعلق تھا لیکن شاہجہاں کی قوت کا وہ ایک بڑا مخزن تھا۔ بغاوت میں اس کی اصلی سرگرمی درباری مورخوں نے قلمبند نہیں کی لیکن وہ ضرور کار فرما رہی ہو گی یہ سوچنا حقیقتاً بیجا نہ ہو گا کہ جب وہ آگرہ سے خزانہ لینے بھیجا گیا تو اس نے اس کا اشارہ اپنے داماد کو کر دیا تھا اور ہمت دلائی تھی کہ وہ فوجی دستہ پر حملہ کر دے اس لیے شاہجہاں شمال کی طرف بڑھتا رہا۔ لیکن سپہ سالار اعتبار خاں بڑا ہوشیار تھا اس نے اس ساز باز کی تہہ تک نظر کی اور آصف خاں کو روک دیا کہ شہزادے کی خطرناک حرکات کے پیش نظر وہ خزانہ یہاں سے لے جائے۔[36]

معتمد خاں

اس مخالف طبقہ میں شاہجہاں کا ایک دوسرا باا ثر حلیف معتمد خاں تھا وہ شہنشاہ کا مشیر خاص تھا۔ ایسی بلند و مخصوص جگہ پر رہ کر اس کو دربار کی دم بدم کی خبریں ملتی تھیں اور وہ خفیہ طور پر شاہجہاں کو پہنچا دیتا تھا یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے اس نے محترم خاں اور خلیل بیگ کو اس کام کے لیے مامور کیا ہو لیکن کسی معمولی فائدے کے لیے بھی جان کا خطرہ تھا۔ معتمد خاں نے لکھا ہے کہ مہابت خاں نے اس کی بھی شکایت بادشاہ سے کی اور یہ بھی تجویز کیا تھا کہ اس کو کابل بھیج دیا جائے لیکن شہنشاہ نے منظور نہیں کی۔[38]

شاہجہاں دہلی کی طرف آرہا ہے

شاہجہاں کا خزانہ جب اچھی طرح بھر گیا تو اس نے کوچ کیا۔ معہ فوج کے جمنا کے کنارے کنارے چلا۔ اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے جا رہا ہے۔ لیکن یہ بہانہ اتنا سطحی تھا جتنا جہانگیر کا وہ بہانہ جب اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی جیسے ہی خبر پہنچی کہ شاہجہاں دہلی کی طرف تیزی سے آرہا ہے۔ جہانگیر نے فوراً اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ شاہجہاں کا مقابلہ کرے اب اتنا وقت نہ تھا کہ وہ شہزادہ پرویز کا انتظار کرتا اس لیے فوج کی سرکردگی مہابت خاں اور عبداللہ خاں کو دی گئی۔ فیروز جنگ کو ہراول دستہ کی ذمہ داری دی گئی تاکہ وہ راستوں کی اور خبر رسانی کے محکمہ کو قابو میں رکھے۔ شاہجہاں نے داراب خاں کو اپنا سپہ سالار بنایا اور راجہ بھیم، رستم خاں اور بیرم خاں کو اس کی کمک پر متعین کیا۔

بلوچ پور کی جنگ

قبول پور اور بلوچ پور متصل دہلی کے درمیان مخالف فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی دونوں طرف سے آتشبازی ہونے لگی، لڑائی تیز ہوتی گئی پہلے ہی سے جو منصوبہ بن چکا تھا اس کے مطابق عبداللہ خاں معہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوج مخالف میں چلا گیا۔ لیکن شاہجہاں کے طرف آنے سے بڑی گڑبڑ ہوئی بجز راجہ بکرما

جیت کے اس ارادہ سے کوئی اور آگاہ نہ تھا، جب وہ داراب خاں کو باخبر کرنے کے لیے جارہا تھا تو اتفاق سے راستہ میں مارا گیا۔ اس سے صورت حال بدتر ہو گئی شاہی فوجوں نے بہادرانہ انداز میں بے ترتیب فوج مخالف پر حملہ کر دیا۔ ان کو بھگا دیا راجہ وکرماجیت کی لاش میدان جنگ میں چھوڑ دی گئی۔ گاؤں کے مقدم نے اس کا سر کاٹ کے خان اعظم کے پاس بھیجا، جس نے دربار میں بھجوا دیا۔[40]

جہانگیر کی تگ ودو

جہانگیر آگرہ کی طرف بڑھتا رہا 10/اپریل 1623ء کو فتح پور پہنچا۔ دارالسلطنت میں گئے بغیر وہ اجمیر چل پڑا کیونکہ شاہجہاں اسی راستہ سے دکن کے لیے چلا گیا تھا۔ شہزادہ پرویز کی آمد کی خبر شہنشاہ کو ہندوان میں ملی۔ اس نے حکم دیا کہ صاحب اقتدار شہزادے اور بلند پایہ امراء اس کے استقبال کے لیے جائیں، بعد ازاں اس کا باقاعدہ استقبال دربار میں ہوا اس کو چالیس ہزار ذات اور تیس ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا۔ حکم ہوا کہ وہ مہابت خاں اور دوسرے افسروں کے ساتھ باغی شہزادے کا پیچھا کرے۔ صادق خاں بخشی خاص پنجاب کا گورنر مقرر ہوا۔ حکم دیا گیا کہ وہ جگت سنگھ[42] کا فتنہ فرو کرے۔

شاہجہاں کی پسپائی

بلوچ پور کی ہمت شکن شکست پر شاہجہاں راجپوتانہ چلا گیا۔ وہاں کا راجہ جے سنگھ دربار[43] میں طلب کیا گیا تھا اس کی عدم موجودگی میں امیر لوٹ لیا گیا۔ شاہجہاں 17/اگست 1623ء کو مانڈو پہنچا لیکن یہ سن کر کہ شہزادہ پرویز اور مہابت خاں بڑی سرگرمی سے اس کا پیچھا کر رہے ہیں اس نے دوسرے ہی دن یہاں سے برہان پور کوچ کر دیا۔ سوچا تھا کہ یہاں کچھ اس کو آرام ملے گا لیکن شاہی فوج نے راستہ ہی میں اس کو روک لیا۔ جھڑپ شروع ہونے سے پہلے ہی مہابت خاں نے شاہجہاں کے بہت سے ساتھیوں کو ترغیب دے کر اپنا لیا۔ برق انداز خان نے پورے توپ خانے کے ساتھ شاہجہاں سے علاحدگی اختیار کی اس کی

تقلید محمد مراد بدخشانی، رستم خاں اور دوسرے بہت سے لوگوں نے کی۔ یہ واقعہ شاہجہاں کی ہمت شکنی کے لیے کافی تھا۔ وہ نربدا پار چلا گیا۔

خانخاناں کی دغابازی

اس کو آخری تدبیر یہ سوجھی کہ نربدا کا راستہ محفوظ کرلے۔ دوسری طرف سے ساری کشتیاں ہٹادے۔ بیرم بیگ کو مقرر کیا کہ گھاٹ اور کنارے کی سختی سے نگرانی کرے اس موقعہ پر اس کو خان خاناں کی فریب کاری کا علم ہوا۔ مہابت خان کے پاس محمد تقی کو شاہجہاں نے قاصد بنا کر بھیجا تھا۔ محمد تقی نے وہ خطوط دیے جو اس کے نام تھے۔ان میں ایک شعر لکھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"سیکڑوں آدمی میری تاک میں ہیں ورنہ میں اڑ کر چھٹکارا حاصل کرتا"۔

جب شاہجہاں نے یہ خط خانخاناں اور داراب خاں کو دکھایا تو انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن ثبوت پورا تھا دونوں کو معہ اپنے اہل و[45] عیال کے گرفتار کرلیا۔

شاہجہاں اسیر گڑھ کی طرف بڑھا حسام الدین ابن سید جمال الدین حسین آنجو نے شہر دروازہ کھول دیا۔ اور باغیوں کو داخل[46] کرلیا۔ بعض مستورات اور بھاری سامان چھوڑ کر شہزادہ برہان پور چلا خانخاناں کو ساتھ ہی لے چلا۔ راستہ میں اس نے راؤ رتن مادا کو مہابت خان کے پاس صلح کی بات چیت کے لیے بھیجا۔ مہابت خان نے گفت وشنید سے پہلے خانخاناں کی رہائی لازمی کردی۔ زبردست مایوسی اور بیکسی میں شاہجہاں نے گھٹنے ٹیک کر بوڑھے آدمی سے درخواست کی کہ وہ شہنشاہ پرستوں سے معافی دلادے۔ اگرچہ خانخاناں کسی کی دلیل نہ سننے والا احتیاط پسند[47] تھا۔ اس نے سائل سے وعدہ کرلیا لیکن اس کے پہلے کہ وہ نربدا کے جنوبی ساحل تک پہنچے شاہی فوجوں نے دریا پار کرلیا تھا اس لیے باغیوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ فائدہ تھا۔ خانخاناں شش و پنج میں پڑ گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے جائے یا پیچھے ہٹے۔ بالآخر اس نے طے کیا کہ وہ شہزادہ پرویز کے پاس جائے وہ گیا اور اپنی اطاعت پذیری کا اُسے یقین دلایا۔[48]

شاہجہاں نرغہ میں

عبور دریا اور خانخاناں کی بے وفائی نے شاہجہاں کے رہے سہے حواس کھو دیے۔ 10/ ستمبر 1633ء کو اس نے انتہائی انتشار میں دریائے تاپتی پار کیا۔ ملک عنبر اور عادل شاہ سے اس کی بات چیت پہلے ہی ناکامیاب ہو چکی تھی اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ گولکنڈہ کے راستہ سے وہ اڑیسہ جائے اور بنگال میں قسمت آزمائی کرے۔ شاہی فوجوں نے چالیس کردہ تک پیچھا کیا پھر برہان پور واپس[49] آ گئی۔ یہاں پہنچ کر شہزادہ پرویز نے وہ آرام پایا جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن شاہجہاں کو ایک لمحہ آرام نہ ملا۔ اس کے ستارہ پر پورا گہن چھایا تھا۔ دوستوں سے جدائی ہمراہیوں کی غداری عہد گزشتہ کی شان و شوکت سے محرومی، دربدری، غرضیکہ اس کی زندگی بڑی مشکل میں گزر رہی تھی۔ بایں ہمہ اس کے سینے میں کامیابی کی جو امیدیں لہر لے رہی تھیں اُن کے زیر اثر اس نے نئے محاذ کے لیے قدم اٹھایا۔

قطب شاہ نے اس کا استقبال کیا

جب وہ گولکنڈہ کی سرحد کے قریب پہنچا تو اس نے میر عبدالسلام کو محمد قطب شاہ کے پاس بھیجا کہ حالات کی ابتری بیان کر کے اس کی امداد حاصل کرے۔ آخر الذکر نے قاصد کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اس کے آقا کی امداد کا وعدہ کیا۔ قطب شاہ نے اجازت دی کہ وہ اس کے علاقہ سے گزر سکتا ہے بشر طیکہ کسی ایک جگہ زیادہ قیام نہ کرے۔ اس کے علاوہ قطب شاہ نے اپنی سرحد کے افسروں کو کہلا بھیجا کہ شہزادے کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آئیں۔ اس نے کچھ روپیہ بھی بھیجا یہ فراخ دلی کا نمونہ تھا جس کا صلہ شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد اچھا نہ دیا۔[50]

اڑیسہ پر قبضہ

تلنگانہ پار کر کے شاہجہاں مسولی پٹم کی بندرگاہ پر پہنچا یہاں سے اڑیسہ کی

طرف بڑھا سرحد پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہی فوجیں بالکل تیار نہیں۔ اگرچہ گورنر احمد بیگ خاں کو اس کے چچا ابراہیم خاں گورنر بنگال نے شہزادے کی تگ و دو سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن اُسے اندیشہ نہ تھا کہ اتنی سرعت سے وہ نقل و حرکت کرے گا اس لیے کسی حفظ ماتقدم یا سرحد کی حفاظت کے بغیر وہ ایک مقامی سردار سے لڑنے چلا گیا تھا۔ جب اس نے شاہجہاں کی آمد کی خبر سنی تو لڑائی چھوڑ کر پپلی واپس آیا اس کی ہمت نے جواب دے دیا اور وہ انتشار کے عالم میں کٹک واپس ہوا، وہاں سے بردوان آیا جہاں وہ جعفر بیگ کے بھتیجے صالح سے ملا۔ شاہجہاں کو راستہ صاف ملا۔ اڑیسہ میں کوئی مزاحمت نہ ہوئی وہاں سے بنگال روانہ ہو گیا۔ بردوان میں محمد صالح کو ملانے کی کوشش کی گئی لیکن باغیوں سے ملنے پر وہ مائل نہ ہوا ان کا راستہ روک دیا۔ لیکن ایک مختصر لڑائی کے بعد اس کو شکست ہوئی اور فاتح نے اپنا راستہ اختیار کیا۔

بنگال

صالح پر فتح حاصل کر کے شاہجہاں نے ابراہیم خاں گورنر بنگال کو ایک خط بھیجا کہ وہ دربار واپس چلا جائے تو اس کی کوئی مزاحمت نہ ہو گی یا اپنے کو سپرد کر دے[54] لیکن آخر الذکر نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ وہ اپنی آخری سانس تک جنگ کرے گا یہ کہہ کر وہ ڈھاکہ سے راج محل چلا گیا۔ قلعہ کو مستحکم کیا۔ شاہجہاں بھی یہاں پہنچ گیا۔ وہ خود تو شہر میں رک گیا۔ سید جعفر، شجاعت خاں، سید قاسم کو قلعہ کا محاصرہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابراہیم خاں نے بڑی دانشمندی و دلیری سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب باغیوں نے بعض ایسے اہل شہر کے خاندانوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی جو اندرون قلعہ تھے وہ اپنا لشکر لے کر باہر آ گیا۔ مقابلہ کی جنگ کی اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے بعد قلعہ کی محافظ فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ قلعہ پر شاہجہاں کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے وہ ڈھاکہ کی طرف بڑھا۔ یہاں احمد بیگ خاں نے اطاعت کی اور چالیس لاکھ

روپیہ بھی نذر کیا۔ پورا بنگال شہزادے کے زیر قدم تھا مال غنیمت کے تیس لاکھ روپیہ نے اس خزانہ میں پھر سے جان ڈال دی۔ پانچ سو ہاتھی اور کشتیوں کے ایک بیڑے نے اس کے وسائل میں بہت اضافے کر دیے۔ اس کی مردہ ولی میں روح پھر سے رواں کر دی۔ اس نے آگے بڑھ کر جدوجہد کے لیے اپنے کو مائل کیا۔

بہار کی طرف کوچ

بنگال کو داراب خاں کے زیر نگرانی چھوڑ کر شاہجہاں پورب کی طرف چلا گیا۔ راجہ بھیم نے پٹنہ پر قبضہ کر لیا اب سارا بہار آسانی سے باغیوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ روہتاس کا ناقابل فتح قلعہ سید[58] مبارک نے اس کے سپرد کر دیا۔ یہاں سے عبداللہ خاں الہ آباد بھیجا گیا اور دریا خاں اودھ، اول الذکر جھونسی پہنچا۔ گنگا پار کیا شہر میں خیمہ زن ہوا۔ الہ آباد کا قلعہ محاصرہ میں لے لیا اور اس کی امداد کے لیے کشتیوں کا ایک بیڑا لے کر شاہجہاں جون پور آ گیا۔

مہابت خاں نے بھگا دیا

اس اثناء میں مہابت خان اور شہزادہ پرویز[59] دربار کے فوری حکم کی تعمیل میں دکن سے کوچ کرتے ہوئے باغیوں کی سرکوبی کے لیے آلہ آباد آئے۔ عبداللہ خاں وغیرہ جو قلعہ کا محاصرہ کیے تھے اُن کو ڈھکیل کر جون پور بھگا دیا۔ شاہجہاں کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ تین طرف سے شاہی فوج نے گھیر لیا۔ غلہ اور جانوروں کے چارہ آنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے بنگال کے حلیف یعنی کشتی بان بھی کھسک گئے۔ ناامیدی کے عالم میں اس نے ایک لڑائی کی ٹھانی اُسے شکست ہوئی اس کے بہت سے سپاہی قتل ہوئے یا منتشر ہو گئے وہ روہتاس چلا گیا[60] جہاں شہزادہ مراد پیدا ہوا۔

دکن کی واپسی

پورب میں اس کی فتح چند روزہ تھی شاہی فوجوں نے بہار پر قبضہ کر لیا۔ شاہجہاں کے لیے روہتاس تین دن سے زیادہ ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ اس کی

مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لیے داراب اسے[61] چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ مجبور ہوا کہ پسپا ہو کر اکبر نگر جائے یہاں سے اس نے دکن کا رستہ لیا۔ شہزادہ دارا اور اورنگ زیب کے علاوہ کچھ وفادار ہمراہی اس کی ناامیدی کا غم دور کرنے کے لیے ہم سفر تھے وہ اڑیسہ اور تلنگانہ سے ہو کر گزر انظام الملک کے علاقہ میں داخل ہوا ملک عنبر نے اس کا استقبال اس بار خوش دلی سے کیا اور ایک باہمی اتحاد دونوں میں ہو گیا۔ رشتہ اتحاد شاہی حکومت سے دشمنی تھا۔

برہان پور کا محاصرہ

نئے حلیف کی مدد سے شاہجہاں مغلیہ دکن میں داخل ہوا اور برہان پور کا محاصرہ کر لیا لیکن راؤرتن کی قیادت میں شاہی فوج نے زبردست مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں نے متعدد حملے کیے لیکن ناکامیاب رہے جب یہ واقعات ہو رہے تھے اسی وقت مہابت خاں اور شہزادہ پرویز دوسری بار دکن آئے اب شاہجہاں محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوا۔ پسپا ہو کر روہان[62] کھید چلا گیا۔ راستے میں بہت بیمار ہو گیا اور اس کی آزردگی میں اضافہ کرنے کے لیے عبداللہ خاں نے بھی ایسے نازک وقت پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔[63]

سپردگی

اس کا حوصلہ بالکل ٹوٹ گیا غرور ختم ہو گیا اب وہ اس لائق نہ رہ گیا کہ اپنی جدوجہد اور قائم رکھ سکے اس کی امداد کے لیے نہ آدمی تھے نہ روپیہ اس نے شہنشاہ سے معافی کی درخواست کی۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ وہ اپنے افسروں کو اسیر گڑھ اور روہتاس سے دستبردار کرا دے اور شہزادے دارا اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال اپنی نیک چلنی کی ضمانت میں پیش کرے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور نذر میں تین لاکھ روپیہ بھی بھیجے باوجود اس کے وہ شاہی علاقہ میں داخل ہونے سے ڈرتا تھا۔ اس نے ناسک میں سکونت اختیار کی۔

ناکامی کے اسباب

اس طرح وہ بغاوت ختم ہوئی جس نے سلطنت کو تین سال سے زیادہ عالم انتشار میں رکھا اس کی وجہ سے آدمی اور روپیہ کی بڑی قربانی ہوئی اور شاہجہاں کے تخت پانے کے امکانات میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ پہلی غلطی محاذ کا انتخاب تھا۔ شمال تک کا کوچ اس کو سمندر تک لے گیا جس کی وجہ سے وہ کہیں جم کر اپنی پسپائی کے زمانہ میں مقابلہ نہ کر سکا۔ دوسری وجہ اس کی یہ تھی کہ اس کے افسر نیم ولی سے ساتھ دے رہے تھے۔ خانخاناں اور داراب خاں صرف موقعہ پرست تھے انہوں نے اس کا ساتھ اس لیے دیا کہ اس عمل کے لیے مجبور تھے۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ تھے جن کا لڑنے کو جی نہ چاہتا تھا اس لیے مہابت خان کو موقعہ ملا کہ اس کے بہت سے آدمیوں کو اپنی طرف توڑے۔ تیسری وجہ وفادار سر بر آوردہ افسروں کا مرنا تھا۔ راجہ وکرم جیت لڑائی کی ابتدا میں مارا گیا۔ راجہ بھیم جونپور کے قریب مارا گیا۔ چوتھی وجہ اس کے محدود ذرائع تھے۔ شاہجہاں کی فتح مندی کی بنیاد صرف شاہی سرکاری امداد پر تھی اور اب جب اس نے اپنے کو اس کے خلاف کر لیا، تو اس کی ہمت شکن شکست طے شدہ تھی لیکن اس کی ابتدائی کامیابی نے اپنے محدود ذرائع پر نظر نہ جانے دی۔

<u>نور جہاں کے منصوبے</u>

شاہجہاں کی ذلت اور زوال نور جہاں کو اس کے مقصد میں قریب تر نہ پہنچا سکے۔ ایک حریف کے زیر کرنے کے بعد دوسرا میدان میں آ گیا۔ مہابت خان اور شہزادہ پرویز کے قریبی اتحاد میں اس کو ایک دوسرے خطرے کی جھلک نظر آئی اوّل الذکر اس سے بہتر کوئی اور شخص نہ تھا۔ اب بغاوت ختم ہو چکی تھی اس کی ضرورت نہ رہ گئی تھی کہ اس کو اس مرتبہ پر برقرار رکھا جائے علاوہ اس کے پرویز سے اس کی علیحدگی خود بخود اس کی بنیادی طاقت کو ہلا دے گی یہ سب سوچ کر مہابت خان کو بنگال کے دور دراز صوبہ میں بھیج دیا گیا۔ جہانگیر کا ایک دوسرا جان نثار ساتھی خان جہاں لودی تھا مہابت خان کی جگہ شہزادہ پرویز کی

اتالیقی[65] اس کے سپرد کی گئی۔

نور جہاں کی مہابت خان کو تباہ کرنے کی کوشش

نور جہاں نے اتنے ہی پر قناعت نہ کی وہ اس تجربہ کار سپہ سالار کو بالکل تباہ کرنا چاہتی تھی۔ حوصلہ مند منصوبہ کو پورا کرنے کے لیے اُسے ایک ہوشیار آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بیک وقت اس کا بھائی آصف خاں اور وہ ایک ہی ذہن کے ہو گئے دونوں نے مل کر مہابت خان کے خلاف سازش کی۔ اس پر غبن و نافرمانبرداری کا الزام لگایا۔ اس سے جواب طلب کیا گیا لیکن اس نے اپنے مخالفوں کے ارادوں کو تہ تک جھانک لیا تھا۔ لہٰذا اپنے جان نثار راجپوت ہمراہیوں کے ساتھ دشمنوں کو سبق دینے کے لیے پرتگال سے روانہ ہوا۔ جب شاہی دستہ جہلم پار کر رہا تھا یہ موقعہ پر پہنچا اور شہنشاہ و نور جہاں دونوں کو حراست میں لے لیا۔ آصف خاں بچ کر اٹک چلا گیا لیکن وہ بھی سر تسلیم خم کرنے پر جلدی ہی مجبور ہوا۔[66] دشمنوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر وہ شہنشاہ کے ساتھ کابل گیا جہاں چند روز قیام میں اس کے خلاف منصوبے نے اس کی طاقت کو کمزور کر دیا واپس ہوتے ہوئے راستہ ہی میں نور جہاں اپنے شوہر کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ مہابت خان آمر کے مرتبہ سے گر کر باغی سمجھا گیا۔ ایک شاہی فوج نے بڑی سرگرمی سے اس کا پیچھا کیا اس نے بھاگ کر میواڑ کے جنگلوں میں پناہ لی۔

شاہجہاں کا کوچ سندھ کو

حکومت کے خلاف ناگہانی بغاوت پر شاہجہاں کو سوچنا پڑا۔ شہنشاہ کابل میں تھا۔ پرویز اور خان جہان کو دکن میں کافی مصروفیت تھی وہ دکنی حکمرانوں[67] کا عرصہ تک مہمان رہا۔ ملک عنبر کا انتقال ہو گیا تھا۔ نظام شاہی دربار کی صورت حال غیر اطمینانی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ کیوں نہ وہ دکن چھوڑ دے اور شاہ ایران کی مدد سے سندھ پر قبضہ کر لے، علاوہ بریں ناسک کی آب ہوا بھی اس کو موافق نہ آئی۔

دکنیوں اور خاص کر حبشیوں کی دغا بازی نے اسے پریشان کر[68] دیا تھا۔ اس لیے 8/ جون 1626ء کو اس نے اپنی پناہ گاہ چھوڑی، ایک مہینہ بعد اجمیر پہنچا۔ یہاں شیخ معین الدین چشتی کے مزار پر گیا اس کے بعد ناگوار اور جھیلم کے راستے سے ٹھٹھ کی طرف گیا اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو اُس کے جدامجد ہمایوں نے اپنے سفر ایران میں راجپوتانہ پار کرتے ہوئے کیا تھا۔ اکتوبر کے اوائل میں وہ ٹھٹھ پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

اس کی پسپائی کے اسباب

لیکن مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ سندھ سے پسپا ہو کر دکن واپس آنے پر مجبور ہوا۔ اس فیصلہ کے کئی اسباب تھے۔ پہلا قلعہ میں اس کی ناکامی اور اس کے دو جاں نثار افسر راجہ گوپال گوڑ اور علی خان ترین کی موت تھی۔ دوسرے پرویز کی سخت علالت کی خبر۔ تیسرے مہابت خاں کے اقتدار کا خاتمہ اور آخری وجہ شاہ ایران کا مایوس کن رویہ۔

شاہجہاں کے تعلقات شاہ ایران سے

کئی سال سے شاہجہاں اور شاہ ایران میں نامہ وپیام کا سلسلہ جاری تھا۔ شاہ کی خدمت میں اس کا پہلا قاصد[69] زاہد بیگ تھا یہ قاصد ایران اس وقت پہنچا جب شاہ عباس قندھار کا محاصرہ کر رہا تھا اس لیے اس کو شرف حضوری اس وقت تک نہیں ملا جب تک کہ آخر الذکر جنگ سے واپس نہیں آیا۔ واپسی پر زاہد بیگ اپنے آقا سے فتح پور میں ملا۔ دوسرا قاصد خواجہ حاجی تھا جس کو شاہجہاں نے اس وقت ایران بھیجا تھا جب خود اس کو پسپا ہو کر دکن[70] جانا پڑا تھا۔ شاہ ایران کے خط میں شہزادے نے ان حالات کا ذکر کیا تھا جن سے مجبور ہو کر اس کو شمال جانا پڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس لڑائی کا بھی گول مول الفاظ میں ذکر ہے جو دہلی کے نزدیک اس کو شاہی فوج سے لڑنی پڑی تھی۔ خط کا خاتمہ ان الفاظ پر ہے۔ اپنے بزرگوں کی طرح میں نے بھی امداد کے لیے آپ کی طرف رخ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ

مجھے بروقت و بر محل رائے سے مستفیض فرمائیں گے۔[71] لیکن اس درخواست پر ایک رسمی جواب ملا۔ شاہ ایران نے شہزادہ کو باپ کی وفاداری اور اطاعت گزاری کے لیے نصیحت کی جواب میں یہ بھی لکھا کہ وہ جہانگیر کے پاس ایک سفیر بھیج رہا ہے کہ وہ اس سے شاہجہاں کی سفارش کرے۔[72] شاہجہاں کا تیسرا خط شاہِ ایران کو اس وقت گیا جب اس نے باپ کی اطاقت قبول کرلی اس میں ان شرائط کا ذکر تھا جن کی روشنی میں اس نے شاہی حکومت[73] سے مصالحت کی شاید اپنے قاصد اسحاق بیگ سے اس نے زبانی کہا کہ وہ شاہ ایران کو میری مدد پر مائل کرے۔ شاہجہاں کے سندھ جانے کی سب سے بڑی وجہ اسی امداد کی امید تھی۔ اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ ایران جائے اور ہمایوں کی طرح واپسی پر تخت حاصل کرے لیکن بادشاہ نے بجز خیر سگالی کے اور کچھ نہ کیا البتہ شہزادے سے امور متعلق پر خیر اندیشی کا اظہار کیا اور اپنے خط میں پھر اسی نصیحت کو دہرایا جو پہلے موقعہ[74] پر کرچکا تھا۔

پرویز کا انتقال

اس طرح اس کے مانے ہوئے دوستوں کی سرد مہری اور ٹھٹھ میں اس کی ہمت شکن شکست نے شاہجہاں کے لیے کوئی اور راستہ بجز دکن جانے کے نہ رکھا۔ راہِ سفر میں اُس نے شہزادہ پرویز کے مرنے کی خوشخبری سنی اس کے دل میں نئی امنگیں مچلنے لگیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کی دوران سفر اس کو مہابت خان کے دوستانہ مراسلات ملے جس کا جواب اس نے حسب خواہش دیا۔ نومبر 1626ء میں وہ ناسک پہنچا جہاں اس کو خدمت پرست خان اور سید مظفر بارہہ ملے اس جگہ کی آب وہوا اس کے موافق نہ تھی لہذا نظام الملک کی اجازت سے مارچ میں وہ جنار چلا گیا یہاں ملک عنبر نے ایک خوبصورت گھر بنوایا تھا۔ 22/اکتوبر 1627ء کو دوہزار سواروں[75] کے ساتھ مہابت خان بھی آگیا ایسا معلوم ہوا کہ شاہجہاں کی قسمت دوسری بار جاگ اٹھی۔

جہانگیر کا انتقال

اس درمیان میں دربار کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ مہابت خان کے نیچے سے رہا ہونے کے بعد جہانگیر کشمیر چلا گیا اس کی صحت لاہور کی گرمی اب زیادہ نہ برداشت کر سکتی تھی لیکن یہاں اس کی ضیق النفس کی بیماری شدید ہو گئی۔ شہزادہ شہریار بھی جوع البقر میں مبتلا ہو گیا۔ لاہور واپس جانا قرار پایا۔ شہزادے کو حکم ہوا کہ وہ دربار کے لیے روانہ ہونے سے پہلے روانہ ہو جائے اور وہاں علاج کا انتظار کرے۔ راستے میں جہانگیر کی حالت مایوس کن ہو گئی۔ چنانچہ 29/اکتوبر بروز اتوار 1628ء کو اس کا انتقال بمقام راجوڑی ہوا۔

بادشاہ کی موت پر جانشینی کا سوال سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نورجہاں کو پہلے ہی سے اس نازک وقت کا اندیشہ تھا چنانچہ عرصہ سے وہ جان توڑ کوشش کر رہی تھی کہ اس کا اقتدار قائم رہے۔ اس نے شاہجہاں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ اس نے سمجھ لیا کہ وہ مزاج کا اتنا سخت ہے کہ اس کا غلبہ نہ برداشت کرے گا۔ اسی لیے اس نے شہریار کو تخت کا امیدوار بنایا تھا کیونکہ وہ لچک دار اور نکما آدمی تھا اس لیے اس کو حقدار ثابت کرنے اور بلند کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے اس نازک موقعہ پر وہ جائے وقوع سے بہت دور تھا۔ اس کی عدم موجودگی نے اس کی امیدوں پر برا اثر ڈالا کیونکہ بہت سے دوسرے ایسے کچے ارادہ کے امراء جو شاید اس کا ساتھ دیتے آسانی سے دوسرے امیدوار کے طرفداروں سے مل گئے۔

نورجہاں کی آخری کوشش

نورجہاں نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ایک آخری کوشش کی۔ اس نے فوراً ایک قاصد اپنے داماد شہریار کے پاس بھیجا تاکہ وہ لڑائی کی تیاری کرے ساتھ ہی ساتھ اپنے بھائی[76] کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن آصف خاں اچھی طرح ہوشیار تھا وہ اس کے جال میں نہ آیا چنانچہ اس نے نورجہاں سے ملنے سے بھی انکار کر دیا اور اپنے طرفداروں کی مدد سے شاہجہاں کی تخت نشینی کا منصوبہ

مکمل کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے میر بخشی ارادت خاں کو اپنا ہم خیال بنایا پھر اسی کے مشورہ سے ایک ایسی تدبیر سوچی کہ قانونی دقت بھی ختم ہو جائے اور ایک ایسا موقعہ پیدا ہو جائے جو اس کی موافقت میں ہو۔

آصف خان کا منصوبہ

شاہجہاں یہاں سے دور دکن میں تھا اور عدم موجودگی میں اس کی موافقت میں عوام کی حمایت حاصل کرنا مشکل تھا۔ اس زمانے کے لوگوں کا معمول تھا کہ سبب کے لیے نہیں بلکہ ایک شخص کے لیے لڑنا چاہیے۔ نفسیاتی طور پر گوشت پوست کا آدمی ان کے لیے بہ نسبت غیر مرئی خیال کے زیادہ قابل توجہ تھا۔ علاوہ بریں وہ شخص ان کی وفاداری کا پہلے مستحق ہوتا جو موقع پر موجود ہوتا۔ موجودہ صورت حال میں شاہجہاں سے زیادہ شہریار نزدیک تھا اس لیے آصف خان کے سامنے یہ سوال تھا کہ شہریار سے عنقریب ہونے والے جھگڑے کے لیے کیسے عوام کی ہمدردی حاصل کرے۔ اب ایسا نازک موقعہ آگیا کہ شاہجہاں کے بادشاہ ہونے کا بھی اعلان وہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا بہت کم اثر ہوتا اور شہریار سے وہ لڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ایسی جنگ بغاوت کے مترادف ہوتی رسم و رواج کے لحاظ سے ایک ایسے دستور کے جواز کی ضرورت تھی جو اس کی نقل و حرکت کو قانونی رنگ دے دے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ تدبیر سوچی کہ داور بخش کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دے[77] اس سے لوگوں کا خیالی خلا پُر ہو جائے گا بلاشبہ یہ ایک بالکل سیاسی حکمت عملی کی تحریک تھی جہانگیر کچھ دنوں تک اس شہزادے کی موافقت میں بھی تھا اور مرحوم خسرو کے بیٹا ہونے کے لحاظ سے تخت پر اس کے حقوق بہ نسبت شہریار کے زیادہ تھے۔ شہریار ایک لونڈی کا لڑکا تھا یہ اور بات ہے کہ وہ ملکہ کا داماد بھی تھا۔

داور بخش کو سرغنہ بنا کر آصف خاں اور اس کے رفیق کار کوچ کر کے بھمبھار تک آئے۔ نور جہاں کو اپنے دشمنوں کی اس غیر متوقعہ نقل و حرکت پر سکتہ

ہو گیا۔ اس نے مرحوم شہنشاہ کی لاش لے کر ان سکھوں کا پیچھا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دارا، شجاع اور اورنگ زیب تھے۔ بھمبھار میں آصف خان نے شاہجہاں کی موافقت میں اور آدمی توڑے اور خواجہ ابوالحسن کی امداد سے نور جہاں کے قبضے سے ان تینوں شہزادوں کو اپنی ہمشیرہ کے قبضہ سے الگ کرنے اور بادشاہ کی لاش لاہور میں دفن کے لیے بھیجنے کے لیے کامیاب ہوا اس کے بعد اس نے صادق خاں کو ہموار کیا۔ صادق خان کا رجحان شاہجہاں کی موافقت میں نہ تھا اس واسطے اس پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم پر زبردست اعتماد ہے۔ آصف خان نے تینوں شہزادوں کو اس کی سپردگی میں دے دیا۔[78] اب نور جہاں سے وہ نپٹ سکتا تھا۔ فوراً اس کی نگرانی ہونے لگی۔ اس کو کسی سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت بھی نہ رہی۔

شہریار کی تیاریاں

جب شہریار نے اپنے باپ کے مرنے کی خبر اور دشمن کی تیاریوں کا ذکر سنا تو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرا دیا۔ لاہور کا سارا خزانہ اپنے قبضے میں کر لیا اور پورا توپ خانہ جو کشمیر جاتے وقت جہانگیر نے وہاں چھوڑا تھا وہ بھی لے لیا۔ اس کے علاوہ امراء کی جاداد یں ضبط کر لیں اور ان کے اہل و عیال کو قید کر دیا۔ فضول خرچی سے روپیہ بانٹ کر اس نے ایک بڑی فوج بائسفر ابن دانیال کی قیادت میں جمع کر دی۔ بائسفر خواجہ ابوالحسن کے قبضہ سے نکل کر لاہور بھاگ آیا تھا۔ آصف خاں نے بھی جنگی لحاظ سے اپنی فوج مرتب کی۔ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔

شہریار کی شکست

مخالف فوجیں لاہور سے تین میل کے فاصلے پر لڑیں۔ آصف خاں ہاتھی پر سوار تھا تاکہ اس کے آدمی اسے دیکھ بھی سکیں اور وہ ہمت افزائی بھی کر سکے اگرچہ اس کی فوج پوری طرح مسلح نہ تھی لیکن اس میں ایسے لوگ تھے جن کو بہت

سی لڑائیوں کا تجربہ تھا برخلاف اس کے شہریار کی فوج جس میں بے جانے بوجھے لوگ بھر لیے گئے تھے ایک گنوردل سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اس میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے کبھی بندوق کی آواز بھی نہ سنی تھی پہلے ہی حملہ میں وہ منتشر ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شہریار اپنے سپہ سالار کے اشارے کا منتظر تھا کہ اگر وہ کہے تو یہ امداد کے لیے آگے بڑھے افضل خاں نے ہتھکنڈوں سے اسے روک رکھا تھا وہ ابھی اپنے خیمہ میں تھا اپنے کو شہریار کا دوست ظاہر کرتا تھا۔ جب شہریار نے بائسفر کی شکست کی خبر سنی تو وہ پسپا ہو کر قلعہ میں داخل ہوا دروازے بند کرالیے مگر اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

گرفتاری

میدان جنگ سے آگے بڑھ کر آصف خاں قلعہ کے قریب آیا اور مہدی قاسم خان کے باغ میں اپنے قدم جمالیے اس مقام پر افضل خان اس سے ملنے آیا اس کے ساتھ بہت سے ایسے لوگ تھے جو شہریار کے طرفدار تھے مگر اب اس سے الگ ہو گئے تھے۔ قلعہ میں داخلہ اب آسان ہو گیا تھا۔ ارادت خان اور شائستہ خان رات کو قلعہ میں داخل ہو گئے اور اپنا خیمہ شاہی صحن میں گاڑ دیا۔ صبح کو انہوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور شہریار کی تلاش کرنے لگے۔ محل سرا لطانی میں شہریار چھپا تھا لیکن خواجہ سرا فیروز خاں اور خدمت خاں آصف خاں سے ملے ہوئے تھے انہوں نے شہزادہ کو دھوکا دیا اور اللہ وردی خان کے سپرد کر دیا وہ اسے داور بخش کے پاس لایا اور مجبور کیا کہ کورنش بجالائے۔ حکم ہوا کہ اسے قید کر دیا جائے۔ دو دن بعد اسے اندھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی تیمور شاہ اور ہوشنگ پسران دانیال قید خانہ بھیج دیے گئے۔[79]

داور بخش قربانی کی بھیڑ

اس طرح آصف خان نے ہوشیاری سے شاہجہاں کے حریفوں کو ایک ایک کر کے ہٹا دیا سب ہی جانتے تھے کہ داور بخش قربانی کی بھیڑ ہے چنانچہ جب اس کو

یہ خبر ملی کہ اس کو بادشاہ بنادیا گیا ہے تو اس کو اس وقت تک یقین نہ ہوا[80] جب تک آصف خان اور ارادت خان نے قسم کھا کر اس خبر کی تصدیق نہ کی۔ لیکن ان دونوں امراء میں سے کوئی ایک بھی نہ جانتا تھا کہ اس کے اس اقدام سے ایک ایسی نظیر قائم ہو رہی ہے جو مستقبل میں بہت سے بے خطا شہزادوں کے خون بہانے کا سبب بن جائے گی۔ سر دست صرف شاہجہاں ان کے پیش نظر تھا اس کی تخت نشینی کے لیے وہ ہر بات کرنے کو تیار تھے۔

شاہجہاں کو اطلاع بھیجی گئی

جس دن آصف خان نے داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کیا اسی دن اس نے بنارسی ہندو کو مع اپنی مہر کے شاہجہاں کے پاس بھیجا۔ چونکہ خط لکھنے کا وقت نہ تھا اس نے قاصد کو زبانی پیغام دے کر حکم دیا کہ جتنی جلد وہ جا سکے پہنچ جائے۔[81] بنارس نے بیس دن میں مسافت طے کی۔ 18/نومبر 1627ء کو بروز اتوار وہ جُنّار پہنچا۔ راستے میں اُسے مہابت خان ملا دونوں مل کر شہزادے کو مبارک باد دیتے گئے۔ لیکن شاہجہاں نے ظاہری طور پر باپ کے انتقال پر افسوس کیا اور کہا کہ دکن میں اس وقت رکنا ہے جب تک کہ سوگ کی مدت پوری نہ ہو۔ اس کے مصاحبوں نے رائے دی کہ جتنی جلد ممکن ہو وہاں پہنچا جائے۔ جوتشی بلائے گئے کہ شمال کے سفر کے لیے نیک ساعت دیکھیں انہوں نے اگلی جمعرات کا دن مقرر کیا۔ شاہجہاں جنار سے وقت مقررہ پر روانہ ہوا اس نے امان اللہ اور بایزید کو آصف خان کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیجا کہ وہ احمد آباد کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔

شاہجہاں نے جاں نثار خان کو خان جہاں کے پاس روانہ کیا

اگرچہ شاہجہاں کی بادشاہت کا اعلان باضابطہ نہیں ہوا تھا لیکن اب وہ مغل سلطنت کا واقعی حکمراں تھا اس پر جو ذمہ داریاں عاید ہوئیں ان کا پورا اسے احساس تھا وہ دکن کے لیے زیادہ فکر مند تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب وہاں کوئی اور پیچیدگی

پیدا ہوا اس لیے جس دن اس نے جنار چھوڑا اسی دن جاں نثار خاں کو جہاں لودی کے پاس بھیجا۔ آخر الذکر کو اس کی جگہ نہ صرف بحال کیا بلکہ دوسری بہت سی دوسری مراعات سے بھی سرفراز فرمایا۔ لیکن خاں جہاں نے قاصد کا سرد مہری سے استقبال کیا اور بغیر کسی جواب کے اُسے واپس کر دیا۔ اس کے بعد اس نے نظام شاہ سے اتحاد کر لیا۔ تاکہ مغلیہ اثرات سے دکن محفوظ رہے۔[83]

شاہجہاں کا شمال جانا

شاہجہاں کا شمال روانہ ہونا ایک فتح مند جلوس کا نمونہ تھا۔ اس کے ایام مصیبت ختم ہو گئے اس کی عظمت کی دوسری صبح نمودار ہوئی۔ گجرات کی سرحد پر اسے نہر خان (شیر خاں) سے سیف خان کے مشکوک رویہ[84] کی خبر ملی۔ شاہجہاں نے اس کو ناظم بنا دیا اور حکم دیا کہ سیف خان کو قیدی کی طرح دربار میں پیش کریں۔ سیف خاں کی شادی ارجمند بیگم کی بہن سے ہو گئی تھی۔ آخر الذکر اپنی بہن کی بڑی دلدادہ تھی سیف خان کی سلامتی کے خیال سے اس نے پرستار خان کو احمد آباد بھیجا تھا تاکہ وہ اس کے معزول بہنوئی پر کوئی آنچ نہ آنے دے۔[85]

قمری سالگرہ کا جشن

بابا پیارے کے گھاٹ پر نربدا پار کیا گیا اور شاہی فوجی سواروں کا دستہ تقریباً نومبر کے آخر میں سینور پہنچا۔ یہاں مہینہ کی 28/ تاریخ کو شاہجہاں نے اپنی قمری سال گرہ منائی۔ ہنوز دعوت وغیرہ کا سلسلہ جاری تھا کہ شیر خان کا خط ملا۔ جس میں آصف خاں کو جنگ اور شہریار کی شکست کا تذکرہ تھا۔ اس خبر سے شاہجہاں کی مسرت اور زیادہ ہو گئی، حکم دیا کہ جشن فتح منانے کے نقارے بجائے جائیں۔

گجرات میں

شاہجہاں کو مبارک باد دینے کے لیے شیر خاں، محمود آباد تک آیا۔ یہ مقام احمد آباد سے بارہ کردہ کے فاصلہ پر تھا۔ کنکریا تالاب پر شاہی خیمہ نصب کیا گیا۔

ایک ہفتہ تک شاہجہاں انتظامی معاملات اور آرام کے لیے یہاں پر ٹھہرا رہا۔ شیر خان کو پنج ہزاری ذات اور آٹھ ہزار سوار کا منصب دیا گیا۔ مرزا عیسیٰ کو چار ہزاری ذات ڈھائی ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔ خدمت پرست خان کو آصف خان کے پاس ایک فرمان دے کر بھیجا گیا۔ جس کا منشاء تھا کہ عوامی اور سیاسی حالات کے پیش نظر شہریار کی آنکھیں نکلوائی جائیں۔ داور بخش اور اس کے بھائی طہمورث اور ہوشنگ کو ممکن ہو تو دربار بھیجا جائے۔ ورنہ ان کو صحیح مقام پر پہنچا دیا جائے۔ ان کے قتل کر دینے کا یہ پوشیدہ اشارہ تھا۔

راجپوتانہ میں

یکم جنوری 1628ء کو شاہجہاں گولکنڈہ پہنچا یہاں میواڑ کے رانا کرن سنگھ نے قیمتی نذریں گزاریں شاہجہاں نے اس کے عوض ایک اعزازی خلعت، ایک مرصع تلوار ایک خنجر لعل و جواہر سے مرصع ایک ہار جس میں بدخشانی لعل قیمتی تیس ہزار روپیہ ایک ہاتھی جس پر چاندی کی عماری تھی اور ایک گھوڑا معہ نقری زین کے عطا کیے 6/ تاریخ کو شاہجہاں نے اپنے وزن کیے جانے کی رسم شمسی مہینہ کے لحاظ سے منڈل تالاب کے کنارے منائی 14/ تاریخ کو وہ اجمیر کے اناساگ پر خیمہ زن ہوا۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح شیخ معین الدین چشتی کے مزار تک پا پیادہ گیا۔ حکم دیا کہ یہاں سنگ مرمر کی ایک مسجد تعمیر کی جائے یہ کارگزاری اس منت پوری ہونے کے تحت تھی جو میواڑ کی جنگ کو جاتے وقت اس نے مانی تھی۔ اجمیر کی نظامت پر مہابت خان کا تقرر کرنے کے بعد وہ آگرہ روانہ ہوا۔ راستے میں بہت سے امراء مثلاً خان عالم، مظفر خان، ماموری، بہادر خان ازبک، راجہ جے سنگھ، راجہ بھارت، سید بارہہ وغیرہ نے مختلف مقامات پر احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

شاہجہاں کے نام سے خطبہ پڑھا گیا

امان اللہ اور بایزید کے واپس آنے پر آصف خان نے دوسرے امرا کے

مشورہ سے شاہجہاں کے نام 19/جنوری 1628ء کو خطبہ پڑھا گیا۔ اسی دن اس نے داور بخش کو قید خانہ بھیج دیا اور اس کے بھائی گرشاسپ شہریار اور دانیال کے دونوں لڑکے طہمورث اور ہوشنگ کو تہ تیغ کیا گیا۔ اس طرح پانچ بے گناہ شہزادوں کا بلاوجہ خون بہایا گیا۔ اگرچہ شاہجہاں کی قسمت کا ستارہ اس وقت اوج پر تھا لیکن آخر میں قدرت نے اس سے ان غلط کاریوں کا انتقام لیا۔ اس کو اپنی آنکھوں سے اپنے دو لڑکوں کا قتل اور تیسرے کا غائب ہونا دیکھنا پڑا۔

تاجپوشی

تاریخ 28/جنوری بہ روز پنج شنبہ 1628ء کو شاہجہاں آگرے کے قریب پہنچا دھارا باغ میں اٹھارہ دن ٹھہرا رہا۔ دارالسلطنت میں داخل ہونے کے لیے نیک ساعت کا انتظار تھا۔ 4/فروری بروز دوشنبہ حسب منشاء منجمان درباری نئے بادشاہ کی تاجپوشی ہوئی۔ اس کے نام سے خطبہ پڑھا گیا اور اس نے پروقار لقب ابو المظفر شہاب الدین محمد، صاحب قِران ثانی اپنے لیے پسند کیا۔ تیز رفتار ہرکارے دور دراز کے صوبہ جات میں تخت نشینی کی خبر لے کر بھیجے گئے۔ شیوخ اور سادات، شعراء منجمان، علماء وپرہیزگار سب کو بادشاہ کی سخاوت کا فائدہ پہنچا۔ حکیم رکنائے کاشی سعیدائے گیلانی اور میر صالح نے مدحیہ قصائد پڑھے۔ ان سب کو دل کھول کر انعامات دیے گئے۔

دعوتیں

ایوٰان خاص سے اُٹھ کر بادشاہ حرم میں داخل ہوا۔ وہاں ارجمند بانو بیگم، جہاں آرا اور دوسری مستورات نے مبارکباد کے لیے اُسے گھیر لیا۔ بیگمات نے سونے چاندی کی بارش کردی بے تحاشہ خیرات کی، یہ جوش مسرت کا اظہار شاہجہاں کو پسند آیا اس نے جواب میں فیاضانہ انداز میں مستورات کو تحائف دیے۔ اپنی بیوی ملکہ ممتاز محل کو اس نے دولاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپیہ تحفہ میں دیا اور اس کے لیے دس لاکھ روپے کا سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ جہاں آرا بیگم کو

ایک لاکھ اشرفیاں اور چار لاکھ روپے دیے اور چھ لاکھ روپیہ سالانہ بطور وظیفہ مقرر کر دیا اس کا نصف شاہی خزانہ سے نقد ملے اور دوسرے نصف کے لیے مساوی جاگیریں عطا کی گئیں۔ وظائف وتحائف دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ شہنشاہ نے آٹھ لاکھ روپے اپنی بیوی کو دیے جس میں سے ساڑھے چار لاکھ روپے دارا، شجاع اور اورنگ زیب کے لیے مخصوص تھے۔ بقیہ روپیہ مراد، لطف اللہ، روشن آرا بیگم اور ثریا میں تقسیم کرنا تھا۔

ترقیات

ایسے مواقع پر درباریوں اور افسروں کو اعزاز ودرجات کی ترقی سے سرفراز کرنا رسمی دستور تھا۔ شاہجہاں نے اپنے بزرگوں سے زیادہ دل کھول کر تاج پوشی کے وقت اس رسم کو بحال رکھا۔ ان افسروں میں سب سے زیادہ پہلا مشرف ہونے والا شخص آصف خان تھا اس کو ہشت ہزاری ذات اور ہشت ہزاری سوار دو اسپہ وسہ اسپہ کے منصب کے علاوہ سلطنت میں اس کو چچا کا خطاب اور سلطنت کا اعلیٰ ترین منصب دار بنایا گیا۔ اس کے بعد مہابت خان کا نمبر تھا جس کو سات ہزار ذات اور سات ہزار دو سوار دو اسپہ وسہ اسپہ کا منصب دار بنایا گیا نیز خان خاناں کے خطاب سے نوازا گیا۔ ایسے منصب پانے والوں کی فہرست میں حسب ذیل اشخاص قابل ذکر لوگ ہیں۔

1۔ وزیر خان
2۔ سید مظفر بارہہ
3۔ دلاور خان
4۔ بہادر خان
5۔ سردار خان
6۔ راجہ وٹھل داس

7۔ خدمت پرست خان

آخرالذکر کو میر توزک کا عہدہ دیا گیا۔

نظم و نسق میں تبدیلیاں

لوگوں کو ترقی دینے کے بعد انتظامیہ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ وفادار حکام اپنے عہدوں پر بحال کیے گئے۔ مشکوک اور نافرمان عہدیداروں کو برخاست کر کے اہل وفا کو مامور کیا گیا۔ پہلی نوعیت میں حسب ذیل اشخاص آتے ہیں:۔

آصف خان۔ اعتقاد خاں، خان جہان اور باقر خاں نجم ثانی

دوسری نوعیت میں یہ عہدیدار آتے ہیں:۔

بہار میں مرزا رستم کی جگہ پر خان عالم

کابل میں خواجہ ابوالحسن کی جگہ پر لشکر خان

بنگال میں فدائی خان کی جگہ پر قاسم خاں جوامینی

گجرات میں سیف خان کی جگہ پر شیر خاں

مالوہ میں مظفر خان کی جگہ پر خان زماں ولد مہابت خاں

الہ آباد میں جہانگیر قلی کی جگہ جان سپار خان

دلی میں مخلص خان کی جگہ پر قلیچ خاں

آصف خان کی آمد

تاج پوشی کا جشن اس وقت تک نہ ختم ہوا جب تک آصف خان نہیں آ گیا۔ وہ آگرہ کے حدود میں 26/ فروری 1628ء کو داخل ہوا۔ پہلے وہ سکندرہ میں ٹھہرا۔ جہاں ممتاز محل اور جہاں آرا بیگم اس سے ملاقات کو گئیں۔ اتنے دنوں کی مفارقت کے بعد اپنے بچوں سے مل کر ملکہ کو بڑی مسرت ہوئی۔ دوسرے دن شہنشاہ نے حکم دیا کہ آصف خان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ درجہ اول کے جملہ امراء کو اس کے خیر مقدم کرتے ہوئے دربار تک آنے کا حکم ہوا۔ شہزادوں کے ساتھ اسے جھروکہ تک لایا گیا شہزادوں نے باری باری نذریں پیش کیں۔

شاہجہاں نیچے آیا اپنے بیٹوں کو گلے لگایا۔ آصف خاں کو قدمبوسی کی اجازت عطا کی گئی۔ اس زمانے میں یہ کمیاب اعزاز تھا۔ ملکہ کی درخواست پر اس کو شاہی مہر بھی سپرد کی گئی۔ شاہجہاں نے اس کو وکیل کا بھی درجہ عطا کیا۔

آصف خان کے بعد وہ امراء پیش کیے گئے جو اس کے ساتھ لاہور سے آئے تھے اور شاہجہاں کے لیے دلیری سے دادِ شجاعت دی تھی۔ شائستہ خان، صادق خان، شیر خواجہ، میر حسام الدین انجو، شاہ نواز خان، میر جملہ معتمد خان اور بہت سے لوگ شہنشاہ کے حضور میں پیش کیے گئے۔ شہنشاہ نے ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ دیا۔ ان کی وفاداری کی تعریف کی۔ اس طرح اس عہد حکومت کا آغاز ہوا۔ جس کو مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار عہد سمجھا ہے۔

باب 4

بغاوتیں

تین اہم بغاوتیں جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئیں ان تینوں میں سے ہر ایک کی رہنمائی جہانگیر کے کسی منظور نظر نے کی یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ اکبر نے جاگیردارانہ نظام ختم کرکے بادشاہ اور امراء کے درمیان نئی نوعیت کا رشتہ قائم کیا۔ اس نظریہ کے مطابق حکومت نے زیادہ اطاعت وفرمانبرداری کا ان لوگوں سے مطالبہ کیا جن کی بادشاہ سے عقیدت مندی و وفاشعاری ان فرائض کا جزو تھیں جو ان کے لیے واجب الادا تھیں۔ اس کے عوض ان کو کوئی خاص حق بھی حاصل نہ تھا، بجز اس کے جو آقا کی خوشنودی سے ان کو نصیب ہو جاتا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کبھی امرا کا زیر بار احسان نہ ہو سکتا تھا۔ یہ پُر زور اصول جو شخصی حکومت کے لیے ضروری تھا جہانگیر کے عہد حکومت میں کمزور ہو گیا بلکہ متروک ہو گیا اگرچہ نتائج مغلیہ حکومت کے لیے فوری تباہ کن نہیں ثابت ہوئے لیکن ایک بُرے نظام کو زبردست سرگرمی عطا کر گئے جس نے بالآخر حکومت تباہ کر دی۔ حسب ذیل مثالوں میں یہ نظر آئے گا کہ جاگیریں خواہ کسی کو خواہ اس کے وطن میں دی گئیں یا غیر مناسب مراعات یا دونوں کے امتزاج کے مرکب کا نمونہ تھیں سلطنت کی شکست وریخت کی ذمہ دار ثابت

ہوئیں۔

خان جہاں

مردانہ شکل ودل پسند صورت کا آدمی تھا، وہ نازو نعم کا پروردہ تھا لیکن خوش قسمتی کا منظور نظر تھا۔

اس نے اپنا وقت، تن آسانی اور خوشحالی میں گزارا۔ افغانی ہونے کے لحاظ سے وہ گستاخی نہیں برداشت کر سکتا تھا اس کے طور وطریق ناہموار تھے مزاج کے لحاظ سے وہ خود بین تھا۔ قدرت نے اسے زبردست ذاتی ہمت کا مالک بنایا تھا لیکن نہ تو وہ دانشمند سپہ سالار تھا نہ ہوشیار سیاست داں وہ جذباتی اور پُر جوش انسان تھا۔ لیکن قوتِ برداشت نہ تھی وہ ہندوؤں سے بری طرح نفرت کرتا تھا حالانکہ اپنے اعتقادات میں سخت گیر بھی نہ تھا اپنے کو سنی بتاتا تھا لیکن زیادہ تر ایرانیوں کا دوست رہا اس کا ایک مقولہ یہ تھا کہ بغیر علی سے وابستگی کے کوئی بہادر نہیں ہو سکتا۔ شیخ فضل اللہ برہان پوری کے زیر اثر تصوف سے بھی لذت آشنا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت سی راتیں درویشوں اور علماء کے ساتھ گزاریں اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شہنشاہ جہانگیر کی اکثر خصوصیات اس میں ملتی ہیں، جو عہد جہانگیر میں اس کے فوری عروج کی نشان دہی کرتی ہیں۔[1]

دکن کا ناظم

گزشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہجہاں کی بغاوت کیسے زیر کی گئی اور شہزادہ کو کس طریقہ سے دربدری نے اس وقت تک کے لیے بے ضرر بنا دیا تھا جب تک کہ نظام شاہ کی پناہ نہیں ملی۔ اس کی منضبط جاگیروں میں سے گجرات کا علاقہ داور بخش کو دے دیا گیا تھا۔ آخر الذکر کے نانا خان اعظم کو اس کا نگراں[2] بنایا گیا، لیکن تقرر کے بعد[3] ہی اس کا انتقال ہو گیا اور داور بخش ایوان شاہی میں بلا لیا گیا۔ خان جہاں کو اس صوبہ کا ذمہ دار افسر بنا کر بھیجا گیا[4] بعد ازاں نور جہاں کی تجویز پر مہابت خان کی جگہ شہزادہ پرویز[5] کا اتالیق بنا کر اسے بھیجا گیا۔ شہزادہ

پرویز کی موت کے بعد وہ دکن[6] کا مستقل ناظم بنایا گیا۔ یہاں نظام شاہ سے اس کا یارانہ ہو گیا۔ تین لاکھ روپیہ[7] لے کر بالا گھاٹ اس کو سپرد کر دیا۔

سیاسی امور پر اس کی غلط نظری

اس لحاظ سے جہانگیر کی موت تک وہ حکومت کی نظر میں غدار کی حیثیت سے سامنے آیا اس درمیان میں دربار کی تیز رفتار تبدیلی کا وہ غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی نظر میں شہریار اور داور بخش میں رسہ کشی تھی۔ چونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہ تھا اس لیے اس نے اطمینان کر لیا کہ نور جہاں کی فتح ہو گی اور وہ اس کو آسانی سے خوش کر[8] لے گا۔ بد قسمتی سے شاہ جہاں کے حصول تخت کے امکانات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ امکانات کا وجود بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہوشیار سیاستدان نہ تھا اور پھر آصف خاں کے رازہائے سربستہ چند نفوس کو معلوم تھے۔ ان حالات میں تعجب نہیں کہ وہ اپنے احباب دریا خان رہیلا اور فاضل خان دیوان دکن کی غلط رائے سے بہک گیا ہو ان لوگوں نے اس کو مشورہ دیا ہو کہ مد مقابل دعویداروں کے جھگڑوں کے اختتام تک وہ خاموش رہے۔

شاہجہاں سے گفت و شنید پر انکار

حقیقتاً ان ہی دونوں نے اس کو شاہجہاں سے منحرف کر دیا، ان لوگوں نے یہ بات سمجھائی کہ شاہ جہاں نے سپہ سالار کا لقب مہابت خان کو دیا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں یہ اس کا حق تھا۔[9] اسی لیے جب شاہ جہاں کا ایک پیغام لے کر جان نثار خاں برہان پور پہنچا تو خان جہاں کا ذہن متضاد خیالات سے پراگندہ تھا۔ اس نے پیامبر کا سرد مہری سے خیر مقدم کیا۔ بلا جواب دیے ہوئے، بغیر کسی رسم و اخلاق کے اس کو چلتا کر دیا۔ زبانی یہ کہلا بھیجا کہ وہ شاہجہاں کی خدمت کرنے سے معذور ہے۔[10]

اس کی اطاعت

جان نثار خاں کی واپسی پر خان جہاں برہان پور سے مالوہ اس لیے گیا کہ اس کے گورنر عبدالرزاق ماموری[11] سے مانڈو چھین لے۔ اس کے ہمراہ راجہ جے سنگھ اور گج سنگھ بھی تھے لیکن یہ خبر سن کر کہ شاہجہاں اجمیر[12] تک آگیا ہے، خان جہاں سے ان لوگوں نے علاحدگی اختیار کرلی۔ اب خان جہاں کو ہوش آیا۔ خطرناک صورت کا اندازہ ہوا اس کے سامنے صرف ایک ہی ذریعہ جان بخشی کا رہ گیا تھا کہ وہ بادشاہ کی اطاعت میں سر جھکادے۔ اس خیال سے اُس نے معافی نامہ لکھ کر شاہجہاں کے پاس ایک پیامبر سے آگرہ بھیجا۔ تحریر میں اپنی وفاداری اور فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ شہنشاہ نے از راہ عنایت اس کی درخواست منظور کرلی اس کو برار اور خاندیش کی گورنری عطا کر کے دکن[13] کے کھوئے ہوئے مقبوضات واپس لینے کی ہدایت کی۔

دکن سے تبادلہ

لیکن خان جہاں اپنی بے دلی کی وجہ سے دکن میں ہاتھ پیر نہ مارنا چاہتا تھا جب شہنشاہ نے یہ محسوس کیا تو اس کو مالوہ بدل دیا دربار سے ججھار سنگھ کے فرار ہونے پر خاں جہاں کو حکم ہوا کہ مہابت خان کے ساتھ مل کر عذار کو زیر کرے۔ اس نے فوراً اطاعت قبول کرلی۔ بعد ازاں مہابت خان دربار میں طلب کیا گیا۔ یہاں آنے پر جس طرح سے اس کا استقبال کیا گیا، اس پر اس کو بڑی مایوسی ہوئی نہ کوئی درباری اس کے خیر مقدم کو آیا اور نہ کوئی علامت اس کے استقبال کی نظر آئی۔ گزشتہ عہد حکومت میں اس کو جو اعزاز حاصل تھا اس کے پیش نظر شاہجہاں نے مہابت خاں کو دہلی بلا لیا کیونکہ فوجی اعزاز کی برتری اور خان خاناں کے خطاب کے لحاظ سے وہ خان جہاں کے آگے سر جھکائے گا۔[15]

اس کی افسردگی

لیکن یہ نوازش بھی ان غیر معمولی مراعات اور امتیازات کے آگے ہیچ تھی جس کا وہ عادی ہو چکا تھا اس کا خیال تھا کہ ایسے اعزاز کا وہ مستحق ہے۔ ذلت

وندامت کے نتیجہ خیز احساس نے اس کو غمزدہ اور وہمی بنا دیا جب اس کے ہمراہیوں کی برطرفی اور جاگیروں کی ضبطی کا حکم ہوا تو وہ چوکنا ہو گیا۔[16] طرہ یہ کہ جیسے یہ باتیں اس کے لیے کم تھیں ایک اور حادثہ ہوا جس نے اس کو بہت زیادہ ڈرا دیا۔ ایک رات مرزا لشکری ولد مخلص خاں نے مذاق میں خاں جہاں کے لڑکوں سے کہا کہ ان کے اور ان کے باپ کو جلد ہی قید خانے بھیج دیا جائے گا اس مذاق سے خان جہاں کا دل ٹوٹ گیا چپ چاپ اپنے گھر چلا گیا اپنے دو ہزار افغانیوں کو اُس نے اپنی حفاظت کے لیے متعین کر دیا دربار کا جانا چھوڑ دیا۔

مصالحت

شاہجہاں نے اس کی غیر حاضری جلد ہی محسوس کر لی۔ آصف خان سے سبب دریافت کیا، جب سرکاری اطلاع سے اس کو اطمینان نہ ہوا تو اس نے اسلام خان کو حکم دیا کہ وہ براہِ راست خاں جہاں سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کرے، خان جہاں نے بیباکی سے اپنے خوف کا اعتراف کیا اور کہا کہ مجھے سکون قلب اسی وقت حاصل ہو گا جب ایک شفقت آمیز فرمان شہنشاہ سے مل جائے گا۔ آصف خاں کی سفارش پر شاہ جہاں نے خان جہان کو ایک تسکین بخش خط لکھ دیا۔ آخر الذکر وقتی طور پر مطمئن ہو گیا۔[17] لیکن یہ ناممکن تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لیے یہ اطمینان دلا دے کہ شہنشاہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

اس کے خوف کے اسباب

برخلاف اس کے وہ جتنا نئے انتظامات پر غور کرتا اتنا ہی اس کا ہراس بڑھتا جاتا تھا اس نے محسوس کیا نظام حکومت سخت ہوتا جا رہا ہے۔ بے ایمان نادھندوں سے محاسبہ کیا جا رہا ہے جن لوگوں نے انتشار کے زمانے میں کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا ہے ان سے جواب طلب کیا جا رہا ہے۔ جہانگیر کے منظور نظر ایک ایک کر کے ہٹائے جا رہے ہیں ان کی جگہ نئے بادشاہ کے مصاحبوں کو دی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ججھار سنگھ کا واقعہ ایک مثال تھا۔ دوسری نظیر شاہی افسروں کی اس روپیہ

کی وصولی تھی جو شہریار نے لاہور میں بے دریغ اڑا دیے[18] تھے۔ ان دو واقعات نے اس کو حواس باختہ کر دیا اس کے احساس جرم نے اس کو قطعی مایوسی سے ہمکنار کر دیا۔

اس نے نظام شاہ سے رشوت میں کثیر رقم لی تھی۔ مغلیہ حکومت سے نکلے ہوئے علاقوں کی واپسی کے لیے بھی اس نے کوئی عملی کوشش نہ کی تھی۔ ایک زمانے میں اس نے شاہجہاں کے پیامبر کو بڑی رواروی میں چلتا کر دیا تھا ان باتوں کو یاد کر کے وہ خود اپنی نظر میں مجرم اور دغاباز نظر آتا تھا۔ یہ خیال کہ اعزاز واثر کی بلندی سے گر کر وہ قعر مذلت میں گر پڑا ہے اس کے لیے عذاب جان بن گیا۔ عنقریب سزا پانے کی افواہوں نے ضرور اس کی مصیبت و مایوسی میں اضافہ کیا ہوگا زیادہ دیر تک ظاہر داری کا نباہنا اس کے مزاج میں نہ تھا اس لیے اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

فرار کا ارادہ

5/اکتوبر 1629ء کی رات کو جب آصف خاں گھوڑے پر سوار ہو کر نگرانی کے لیے نکلا تو اس کے بعض ان ہمراہیوں نے جن کا مکان خان جہاں کے مکان کے قریب تھا آصف خاں کو اطلاع دی کہ خان جہاں آگرہ سے بھاگنا چاہتا ہے۔ آصف خان نے وزیر خان کو شہنشاہ کی خدمت میں اطلاع کرنے کے لیے روانہ کیا، ساتھ ہی ساتھ یہ اجازت حاصل کی کہ خان جہاں کے گھر کا محاصرہ کیا جائے اور اس کو سزا دی جائے لیکن تازہ عفو تقصیر کے پیش نظر شاہجہاں نے اجازت نہ دی۔ آصف خاں سے کہلا بھیجا کہ وہ انتظار کرے جب تک کہ فرار ہونے کی خبر مکمل حقیقت نہ ہو جائے۔

تعاقب

جب تخمیناً رات کا چوتھائی حصہ گزر گیا۔ آصف خاں شہنشاہ کے پاس یہ اطلاع دینے دوڑا گیا کہ خان جہاں معہ اعزا و اقربا کے فرار ہو گیا۔[19] شاہجہاں نے

خواجہ ابوالحسن، سید مظفر خان، ناصری خان، راجہ جے سنگھ، خان زماں، صفدر خاں، اللہ وردی خان، فدائی خان، معتمد خاں اور بہت سے دوسرے افسروں کو بھیجا، ان میں سے سید مظفر خاں، راجہ وٹھل داس، خواص خان، خدمت پرست خان، پرتھوی راج راٹھور نے نہ رات کے غیر مناسب وقت کا خیال کیا اور نہ قلت تعداد کا۔ علی الصباح نکل پڑے۔ دھول پور کے قریب خان جہاں اور اس کے ساتھیوں کو جالیا۔

خان جہاں کا محاصرہ

باغیوں کے آگے دریائے چنبل اور پیچھے تیغ انتقام تھی۔ انہوں نے اپنا محاذ قرب وجوار کی پہاڑیوں اور متحرک لہروں میں قائم کیا۔ اس انتظار میں تھے کہ شاہی افواج پہل کرے۔ جنگ بہت مختصر لیکن خوفناک تھی۔ شاہی فوج وفاداری کے جوش میں لڑی اور بہادر افغانوں نے اپنی پوری طاقت سے اپنی روک تھام کی۔ اس لڑائی کے درمیان میں ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ پرتھوی راج راٹھور اور خان جہاں ایک دوسرے کے مقابل نظر آئے۔ خاں جہاں سوار تھا لیکن پرتھوی راج پیدل تھا اس کا گھوڑا مارا گیا تھا۔ بہر حال انہوں نے ایک دوسرے پر بڑے زوروں کا حملہ کیا دونوں بُری طرح زخمی ہوئے اسی طرح کا انفرادی مقابلہ شاہی فوج اور باغیوں میں کئی جگہ ہوا۔ شاہی فوج کے تخمیناً سو آدمی مارے گئے، جس میں خدمت پرست خاں، میر آتش، خواص خاں بھٹی، مرحمت خاں اور محمد شفیع نبیرہ سید مظفر، راجہ وٹھل داس، پرتھوی راج راٹھور اور سید مظفر بری طرح زخمی ہوئے۔ باغیوں کے تخمیناً ساٹھ آدمی مارے گئے اس میں خان جہاں کے دو لڑکے عظمت اور حسین اور اس کا داماد شمس خاں بھی تھے، یہ حادثہ خان جہان کی ہمت توڑنے کے لیے کافی تھا۔ وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔

دھول پور میں شاہی فوج کا قیام

شاہی فوج تعاقب کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکی اُس کے سر برآوردہ افسر زخمی

ہو گئے تھے اس لیے بیماروں کو آرام پہنچانے کے خیال سے دھول پور میں رُک گئی اس کے فوراً بعد معتمد خان، رانی رائے، جے سنگھ، خان زباں تیزی سے یکے بعد دیگرے پہنچے انہوں نے چاہا کہ باغیوں کا پیچھا کریں لیکن دریائے چنبل طغیانی پر تھا اس کا پار کرنا مشکل تھا۔ دو پہر میں خواجہ ابوالحسن بھی اپنی بقیہ فوجوں کے ساتھ یہاں پہنچ آیا چونکہ کوچ کی تیز رفتاری نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے طے کیا گیا کہ روانہ ہونے سے قبل تھوڑا سا آرام کر لیا جائے۔ زخمیوں کو آگرہ واپس کیا گیا جہاں شاہجہاں نے اُن کو انعامات اور درجات کی ترقی سے سر فراز فرمایا۔

خاں جہاں بچ کر دکن پہنچتا ہے

شکست کے بعد خان جہاں دریائے چنبل پار کرنے کی تدبیریں کرنے لگا اس کا خاندان بھی بڑا تھا اور سامان بھی بہت تھا یہ ناقابل عمل معلوم ہوا کہ سب کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اس نے اپنا سارا سامان و خزانہ اور زیادہ بیگمات کو چھوڑ دیا اور اپنے دو لڑکوں اور پانچ افغانیوں کو ساتھ لے کر ہاتھی پر دریا پار کر گیا۔ دھول پور میں شاہی فوج کے رک جانے سے اس کو جان بچانے کا وقت مل گیا۔ وہ بندیل کھنڈ میں داخل ہوا وکرماجیت کی مدد سے کسی سنسان راستے گونڈوانہ پہنچا تو یہاں اس نے تھوڑا سا آرام کیا اس کے بعد برار ہو کر سلطنت احمد نگر میں داخل ہوا۔ اسے امید تھی کہ یہاں اُسے پناہ مل جائے گی۔

اس کے تعاقب کی تجدید

دو دن کے آرام کے بعد جب خواجہ ابوالحسن نے اس کے تعاقب کے لیے دریائے چنبل پار کیا تو اس کا سراغ نہ ملا۔ اس لیے اس نے گوالیار اور انتری سڑک پر چلنا شروع کیا امید یہ تھی کہ اس کو کہیں پائے گا اگر چہ وہ بڑی تیزی سے چلا مگر دشمن کی کوئی جھلک نظر نہ آئی۔ وکرم جیت سے بھی کوئی سراغ نہ ملا اس نے بندیل کھنڈ چھوڑ دیا۔ چندیری کی طرف گزرا اس کے بعد اودے پور گیا آخر میں سالونا اس لیے ٹھہر گیا کہ دربار سے مزید ہدایت مل جائیں۔[20]

خان جہاں کو اس کے کچھ دوست مل گئے

جب خان جہاں نظام شاہی ملک میں پہنچا۔ یہاں چالنا پور کا جاگیردار نظام سکندر رو ثانی اور بالا پور کا جاگیردار بہلول میانی ملے وہ سب دولت آباد کی طرف بڑھے جب شہر کی حدود میں پہنچے۔ مرتضیٰ ثانی اپنے پرانے دوست کے استقبال کے لیے قلعہ کے باہر آیا اور خان جہاں کو اپنے خیمہ میں لے گیا خود مسند کے کنارے بیٹھا اور خان جہاں کو صدر نشین بنایا اپنے نیک ارادوں کے مزید ثبوت میں اُس نے خان جہاں کو بڈ(Bid) کا پرگنہ دیا کچھ روپیہ بھی اخراجات کے لیے دیے۔ خاں جہاں کے ساتھیوں کو بھی اس نے بے امداد نہیں چھوڑا۔ ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا اور جاگیریں عطا کیں۔[21]

مرتضیٰ کی امیدیں

خاں جہاں کی آمد نے مرتضیٰ ثانی کے دل میں نئی امیدیں پیدا کیں۔ اس نے سوچا کہ اس کی امداد سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنے وہ مقبوضات واپس لے لے جو اب تک مغلوں کی حکومت میں ہیں۔ دکن کے شاہی افسروں میں بہت سے خان جہاں کے دوست یا ملازم تھے۔ نظام شاہ کو امید ہوئی کہ خان جہاں کے اشارے پر وہ مقبوضات واپس کر دیں گے۔ بعض حالات میں واقعی ایسا ہوا بھی۔ اپنی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لیے مرتضیٰ ثانی نے ایک عجیب طریقے پر مغلوں پر حملہ کی ابتدا کی۔

دکن میں مغلوں کے نقصانات

اس نے اپنے ماننے والوں کو وہ مقبوضات دے دیے جو مغلوں کے قبضے میں تھے۔ اس کی اجازت دی کہ وہ ساری جائداد اپنے قبضہ میں کر لیں اور ان کی آمدنی خود لے لیں۔ اس طرح مرتضیٰ ثانی نے اپنے آدمیوں میں آزادانہ حرارت کی اک تازہ لہر پیدا کر دی۔ شاہ پرستوں کا قبضہ دکن میں کچھ یوں ہی سا تھا۔ اب ہمیشہ سے زیادہ حالت نازک ہو گئی ان کی بیرونی چوکیاں منتشر تھیں اور ان کے ذرائع

محدود تھے فی الحال وہ اس قابل نہ تھے کہ دکنیوں کا مقابلہ کر سکیں اس لیے مرتضٰی ثانی کو بالادستی حاصل ہوئی۔ اس نے باہر سے آنے والوں کو اپنی سلطنت سے نکال باہر کیا۔ اسے اس کی خبر نہ تھی کہ اس کی یہ فتح چند روزہ ہے اور وہ اپنے لیے ایک خطرناک مہم کا سامان کر رہا ہے۔ اگرچہ کسی بہانے کی ضرورت نہ تھی مگر اس نے مغلیہ شہنشاہ کو ایک موقعہ دے دیا کہ وہ اپنی شاہانہ پالیسی دکن میں بھی شروع کرے۔ آخر الذکر سر دست حق بجانب تھا۔

شاہجہاں کے منصوبے

دکن کی نازک صورت حال سمجھنے میں شاہجہاں کو دیر نہیں لگی اس نے طے کیا کہ فوری اور موثر اقدامات سے کام لیا جائے اس نے اپنے باپ و دادا کے عہد حکومت میں اپنی زیر قیادت محاربات سے ذاتی تجربہ حاصل کیا تھا اس نے ناکامی کا راز یہ معلوم کیا تھا کہ افسروں کی کسی ایک گروہ کی ذمہ داری سپرد کرنا فضول ہے خواہ اس گروہ کا ہر افسر کارآمد اور سرگرم ہو۔ اپنی حکومت کی پہلی جنگ کو وہ دیر تک چلتے ہوئے نہیں برداشت کر سکتا تھا اس لیے تمام ناکامیوں کے جملہ خطرات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور افسروں کے مجموعی عمل سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے طے کیا کہ وہ خود جنگ کی نگرانی کے لیے جائے جیسا اس نے شہزادگی کے عالم میں کیا تھا۔ اس لیے 3/دسمبر 1629ء کو اس نے آگرہ چھوڑ دیا۔ مالوہ میں داخل ہوا اور بغیر مانڈو میں قیام کیے ہوئے وہ آگے بڑھتا ہوا سیدھے نربدا پہنچا جسے اس نے اکبر پور میں پار کیا۔ 12/فروری 1630ء کو اس نے اپنی پوری فوج کا جائزہ خاندیش کی سرحد پر لیا۔ دوسرے دن دکن کے گورنر ارادت خان نے اپنے صوبہ میں اس کا استقبال کیا۔

دکن میں لڑائیاں

دکن میں پہنچتے ہی شہنشاہ نے فوراً جنگ شروع کر دی اپنی ٹڈی دل سپاہیوں سے اس نے بالا گھاٹ بھر دیا۔ تین بڑے دستے ارادت خاں کی سرکردگی میں

دیے گئے ارادت خاں کا اب خطاب خان اعظم تھا۔ اس نے نظام شاہی ملک کے وسط میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اس میں اس کے پیش نظر دو مصلحتیں تھیں ایک تو کھوئی ہوئی مملکت کا واپس لینا دوسرے خاں جہاں کو شکست دینا۔ خاں جہاں اب بھی بڈ میں تھا۔ بالا گھاٹ کی مہم برسات تک برابر جاری رہی اس کے بعد نقل وحرکت معطل کرنی پڑی۔ جون 1630ء میں ایک موقعہ پر شاہی فوجوں اور دکنیوں میں جم کر لڑائی ہوئی۔ آخر الذکر کو شکست ہوئی اور لوگ بھاگ گئے۔ لیکن فتح کی خوشی میں شاہی فوج منتشر ہوگئی اور ایک دستہ اپنی مرکزی فوج سے علاحدہ ہوگیا۔ خاں جہاں بارہ ہزار آدمی لے کر ان پر ٹوٹ پڑا اور شاہی فوج کی بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔[22]

برسات میں دونوں حریف اپنی مختلف فوجی چوکیوں پر چلے گئے۔ اعظم خاں اور اس کے سپاہی دیول گاؤں چلے گئے اور خاں جہاں نے بڈ کے قریب پناہ لی۔ دکنیوں کا منصوبہ تھا کہ برسات بعد کسی ایک مرکزی جگہ پر اکٹھا ہو کر مغلوں سے جنگ کی جائے اعظم خان نے ان کی شطرنجی چالوں کو مات دینے اور ان کے اجتماع کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا وہ دیول گاؤں سے خاں جہاں پر حملہ کرنے کے لیے چلا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ راجوری میں بہت تھوڑی سی فوج کے ساتھ پڑا ہے اور مال غنیمت جو اُسے قرب وجوار کے گاؤں سے ملا تھا تقسیم کر رہا ہے۔[23]

چونکہ اعظم خاں باغیوں پر اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا اس لیے صف شکن خاں سپہ سالار پاتھری کو اس نے قلعہ کے باہر آنے اور خان جہاں کو مصروف پیکار رکھنے کا حکم دیا۔ یہ اس لیے کیا کہ اسے اندیشہ تھا کہ شاہی فوجوں کی آمد پر وہ بھاگ کھڑا نہ ہو۔ یہ منصوبہ قابل تعریف کامیابی سے ہمکنار ہوا کیونکہ جب صف شکن خان باغیوں سے لڑ رہا تھا۔ اعظم خان ان کی پشت پر آگیا۔ خان جہاں گھبرا گیا اپنا کیمپ چھوڑ دیا کوشش کی کہ پہاڑیوں پر چڑھ کر اس پار چلا جائے۔ شاہی فوج کے لوگ اس کے چھوڑے ہوئے کیمپ کی لوٹ مار میں مصروف ہونے کی وجہ سے

تھوڑی دیر کے لیے منتشر ہوگئے لیکن باہمت افسران مثلاً بہادر خان روہیلا،
اہتمام خان اور نرہرداس جھالا نے باوجود قلت سپاہ کے جلدی سے پہاڑ کی چوٹی پر
تیزی سے پہنچ گئے اور باغیوں کا پیچھا کرنے لگے۔ باغی گھوم پڑے۔ شاہی فوج سے
لڑنے کے لیے رک گئے۔ بڈ کی ناہموار پہاڑیوں میں کچھ دیر تک بڑی خوفناک
لڑائی ہوئی۔ مغل شکست سے بال بال بچے کیونکہ ان کو کمک بروقت مل گئی لیکن
نرہرداس جھالا لڑتے ہوئے مارا گیا اور بہادر خان روہیلا دوبار زخمی ہوا۔ خان
جہاں اور اس کے سپاہی گولیوں کی بوچھار میں شیوگاؤں کی طرف بھاگے۔ ان کے
تعاقب کا سلسلہ تقریباً دو میل تک قائم رہا۔ راجہ پہاڑ سنگھ نے بہادر خان کو قتل
کیا آخر الذکر خان جہاں کے بھروسے کا آدمی تھا۔[24]

باغیوں کو بڈ سے بھگانے کے بعد اعظم خان مچھلی گاؤں واپس پہنچا کیونکہ اس
کو اپنی فوج کے کچھ دکنی امراء کی وفاداری پر شک[25] تھا۔ خان جہاں شیوگاؤں پہنچا
یہاں دریا خان اس کا شریک کار ہوا، چونکہ اس کو اب تک تعاقب کا احتمال تھا اس
لیے وہ دولت آباد چلا گیا۔ جہاں سے دریا خاں پابن گھاٹ کوچ کر گیا۔ چالیس
گاؤں اور دھارن گاؤں کو پوری طرح برباد کرنے کے بعد وہ بالا گھاٹ واپس گیا۔

مرتضیٰ کی سرد مہری

برخلاف اس کے شاہی افواج نظام شاہی مملکت کو ہر چہار طرف سے غارت
کررہی تھیں۔ دوسری طرف دولت آباد کے اردگرد قحط سالی کا دور دورہ تھا۔
جس نے لوگوں کی مصیبت کو خوفناک حد تک پہنچادیا تھا۔ اب مرتضیٰ ثانی یہ سوچ
کر خجل تھا کہ ناحق اس نے اپنے سر بے سود مقصد لے لیا۔ علاوہ اس احساس کے
اس کو یہ بھی خیال ہوا کہ خان جہاں اس کی امیدوں کو پورا نہ کرسکا۔ اس کے
ہر کام میں افسوسناک نیم دلی و تذبذب کارفرما ہیں۔ مرتضیٰ ثانی کو یہ رجحان پسند نہ
آیا اس نے مہمان سے اپنا رویہ بدل دیا اب وہ خان جہاں کا دوست نہ رہ گیا۔ بلکہ
اشارتاً یہ بھی بتادیا کہ اب اس کا میرے علاقہ میں زیادہ قیام کرنا مناسب ہے۔

خان جہاں، دکن چھوڑتا ہے

اس اشارہ کی روشنی میں خان جہاں نے دریا خان اور اپنے باقی ماندہ لڑکوں کو ساتھ لے کر دولت آباد چھوڑ دیا۔ وہ مالوہ کی طرف روانہ ہوا خیال یہ تھا وہاں سے پنجاب پہنچ کر اپنے قبیلہ یعنی افغانیوں کے مشورہ سے شورش برپا کرے گا۔ شہنشاہ نے پہلے ہی عبداللہ خان کو اس غرض سے روانہ کر دیا تھا کہ پاپن گھاٹ میں اسے روک دے۔ مگر خان جہاں مغل افسر کی آنکھ میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ دھرم پوری میں دریائے نربدا پار کر کے وہ دیپال پور پہنچا۔ یہاں اسے علم ہوا کہ اُجین کے مفتی کو خان جہاں کے ساتھیوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا ہے دیپال پور سے سید مظفر تال گاؤں گیا یہاں اسے عبداللہ خان ملا۔ دونوں خلجی پور روانہ ہوئے وہاں سے سرونج گئے جہاں پتہ چلا کہ باغی اس سے دو دن پہلے آئے تھے۔

تعاقب کا سلسلہ

سرونج سے خان جہاں داہنے طرف مڑ کر بندیل کھنڈ میں داخل ہوا۔ لیکن اس بار وکرم جیت کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اس نے دور اندیشی سے محسوس کر لیا تھا کہ باغیوں سے نپٹنے میں اگر کوئی بھی کوتاہی ہوئی تو انجام برا ہوگا۔ 11/ جنوری 1631ء کو اس نے خان جہاں کے اس لشکر کے پشت پر حملہ کیا جس کا افسر دریا خان تھا۔ لڑائی میں آخر الذکر بری طرح گھائل ہوا۔ بندیلوں نے غلط فہمی سے سمجھا کہ یہی خان جہاں ہے اس کی گردن کاٹ دی۔ اس کا سر دربار شاہجہاں میں بھیجا۔ اس طرح خان جہاں کو جان بچانے کا موقعہ مل گیا وہ شمال و مشرق کی طرف چلا اور بمقام نیمی بندھو[28] میں داخل ہوا۔

خان جہاں شہنشاہ پرستوں سے لڑتا ہے

شہنشاہ پرستوں نے بڑی سرگرمی سے اس کا پیچھا کیا۔ سید مظفر نے اچانک ایسے وقت پر حملہ کیا کہ جب ایک طولانی اور تھکا دینے والے سفر کے بعد خان

جہاں آرام کر رہا تھا۔ زرہ بکتر پہن کر جان پر کھیل گیا۔ اپنے پانچ چھ ہزار سپاہیوں سے اس نے سید کا مقابلہ کیا۔ دوران جنگ خاں جہاں کا لڑکا محمود اور صدر روہیلا مارے گئے صدر روہیلا اس کا بڑا معتبر مشیر کار تھا۔ خان جہاں اپنے ہاتھی چھوڑ کر کالبخار کی طرف فرار ہوا۔ مگر یہاں کمانڈر سید احمد نے اس کا راستہ بند کر دیا۔ اس کے بائیس ہاتھی اور لڑکے حسن بھی گرفتار ہو گئے، جس کو شہنشاہ کے حکم سے تہ تیغ کر دیا گیا۔

اس کی آخری جنگ اور موت

خان جہاں دریائے سنیدہ تک بڑی خستہ حالی و مایوسی کے عالم میں پہنچا۔ یہاں اس کے بعض ہمراہیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سید مظفر اور مادھو سنگھ اپنے آدمیوں کے ساتھ آپہنچے۔ میدان جنگ کی موت کو پھانسی کے تختہ کی موت پر ترجیح دیتے ہوئے خان جہاں نے ایک بہادر افغان کی طرح شاہ پرستوں پر حملہ کیا۔ فوراً ہی وہ اپنے گھوڑے سے محروم ہو گیا۔ لیکن وہ پاپیادہ لڑتا رہا۔ اس نے مادھو سنگھ کے گرز بردار پر حملہ کیا لیکن راجپوتوں نے اسے مغلوب کر دیا۔ مادھو سنگھ نے اپنے خنجر سے اسے زخمی کیا اور اس کے ماتحتوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ تھوڑی دیر میں عبداللہ خاں موقع پر آگیا اس نے خان جہاں کا سر بادشاہ کی خدمت میں بھجوا دیا۔ سر لے جانے والا خواجہ کامگار کو غیرت خان کا خطاب دیا گیا۔[29]

تبصرہ

اس طرح خان جہاں کی بغاوت تخمیناً 6 ماہ کے اندر ہی ختم ہو گئی۔ اس میں دو رائے نہیں کہ وہ غلطی پر تھا۔ اس کو اپنی اہمیت کا احساس مریضانہ ذہنیت کا نتیجہ تھا۔ جہانگیر کی غیر معمولی عنایات نے اس احساس کو اور ہوا دی۔ پناہ کے لیے دکن بھاگ جانا بھی غلط ثابت ہوا۔ اس کی بجائے وہ پنجاب جا سکتا تھا۔ افغانوں کی امداد سے وہاں زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا اگر ناکامیابی ہوتی تو موقع ملتا کہ وہ سرزمین ایران

میں پناہ لے۔ اپنی بغاوت کی ساری مدت میں اس نے جم کر کہیں مقابلہ نہ کیا اس رویہ سے اپنے ساتھیوں کی ہمدردی سے محروم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مرتضیٰ ثانی نے بھی کنارہ کشی کر لی۔ اس ناعاقبت اندیشی نے نہ صرف اس کو تباہ کیا بلکہ احمد نگر کی زوال امادہ بلکہ جان بلب سلطنت کا خاتمہ تیز تر کر دیا۔

جہانگیر کی عنایت بیر سنگھ پر

دوسری بغاوت جس کا سرغنہ جھجار سنگھ تھا۔ بہت سی باتوں میں خان جہاں کی سرکشی سے ملتی جلتی ہے۔ بعض اسباب بغاوت دونوں کے مشترک ہیں۔ جھجار سنگھ کا باپ بیر سنگھ دیو[30]، خان جہاں کی طرح جہانگیر کا بڑا دوست تھا۔ جہانگیر کے برتاؤ اور رجحان نے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ بادشاہ اس کی نمایاں خدمات کی بنا پر اس کا ممنون احسان ہے۔ مغل دربار میں بیر سنگھ کی وہ عزت تھی کہ کوئی شخص اس کی زیادتی کی برائی کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ یہ مراعات شاہی جو شہنشاہ کی خوشنودی سے ملا کرتے اور شہنشاہ کسی وقت بھی انہیں اپنی مرضی کے مطابق بغیر سبب یا وجہ کے واپس لے سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان مراعات سے سرفراز ہونے والے ذہنی طور پر انہیں اپنا حق سمجھنے لگے۔

جھجار سنگھ اور اس کا بیٹا

1627ء میں بیر سنگھ کا انتقال ہوا اس کی جگہ اس کا بڑا لڑکا جھجار سنگھ گدی نشین ہوا۔ جب وہ نئے شہنشاہ کو مبارک باد دینے گیا تو بندیل کھنڈ کا انتظام اپنے لڑکے وکرم جیت کے سپرد کر گیا۔ جوان ہونے کے علاوہ وہ لڑاکا ظالم بھی تھا۔ اس نے تھوڑے ہی دن میں اپنی ریاست کے پرانے افسروں سے جھگڑا کر لیا۔ بلاوجہ کسی کو سزا دی کسی کو قید بھیج دیا۔ قید خانے والوں میں کرپارام گوڑ بھی تھا۔ وہ اس کے باپ کا وکیل اور مشیر خاص تھا۔ وکرم جیت نے اسے اُوچھار کے قلعہ میں قید کر کے اذیت دینا شروع کیا۔ پہرہ داروں کو رشوت دے کر کرپارام قید خانے سے بھاگ گیا۔ وہ دکن کی طرف بھاگا جس کا پیچھا وکرم جیت نے دھمونی

تک کیا مگر کرپارام برہان پور پہنچ گیا وہاں سے شاہی دربار پہنچا اور ملازم ہو گیا۔[31]

جھجار سنگھ کا آگرہ آنا اور بھاگنا

10/ اپریل 1628ء کو جھجار سنگھ آگرے پہنچا اور اس نے شہنشاہ کو ایک ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی نذر کیا اس کو چار ہزاری ذات اور چار ہزار آدمی سوار کا منصب ملا بادشاہ نے اسے جواہرات سے مرصع ایک خنجر مع طبل و علم عنایت کیا اس طرح گویا اس کا استقبال دربار میں بہت قابل اطمینان ہوا۔[32] لیکن کچھ عرصہ بعد ہی شاہجہاں نے اس کے باپ کی غیر مستند آمدنی کی تحقیقات شروع کر دی۔ جھجار سنگھ نے سوچا تحقیقات کا اطمینان بخش جواب دینا بالکل غیر ممکن ہے۔ شہنشاہ کو وہ مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس کھلی ہوئی ذلت کے احساس نے اسے چونکا دیا وہ ۱۱/ جون کو خفیہ طور پر آگرہ سے بھاگ کھڑا ہوا اس کا تعاقب فی الحال[34] نہیں کیا گیا اس لیے کہ کابل پر نظر محمد نے حملہ کر دیا تھا لیکن جب فتنہ فرو ہو گیا تو شاہجہاں نے پھر جھجار سنگھ کی طرف توجہ کی۔

مہابت خان اور جھجار سنگھ کا مقابلہ

مہابت خان کی سرکردگی میں آگرہ سے ایک زبردست فوج بھیجی گئی جس میں 10 ہزار سوار، دو ہزار بندوقچی اور پانچ سو سفر مینا کے سپاہی شامل تھے۔ مہابت خان کی تند مزاجی کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے اس کے ساتھ اسلام خاں بھی لگا دیا گیا۔ علاوہ بریں، خان جہاں کو حکم دیا گیا کہ وہ مالوہ سے کوچ کر کے اورچھا کی طرف 8000 فوج لے کر جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہا گیا کہ راجہ بھرت بندیلا کو بھی ساتھ لے لے۔ آخر الذکر بندیلا کی گدی کا حریف بھی تھا۔ ایک تیسری فوج کو حکم ہوا کہ زیر قیادت عبداللہ خان و بہادر خان روہیلا پورب[36] سے روانہ ہو کر اورچھا میں جمع ہو جائے۔

فوجوں کے اتحاد عمل اور حملہ کی تیز رفتاری کو سرگرم رکھنے کے لیے شاہجہاں خود بھی اکتوبر 1628ء کو آگرہ سے روانہ ہوا۔ راستے میں تقریباً جابجا

خاص کر باری میں شکار کے لیے رکا بھی یہ سب کرتا ہوا وہ 3ر جنوری 1629ء کو گوالیار پہنچا۔ اس اثناء میں مہابت خاں جو شہنشاہ سے آگے چل رہا تھا گوالیار سے گزر کر بندیل کھنڈ میں داخل ہو گیا۔ اور چھا سے 32 میل پچھم اس نے پڑاؤ ڈالا۔ جنوب سے خان جہاں نسبتاً بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ پاس پڑوس کے علاقوں کو تباہ کرتا رہا۔ عبداللہ نے بندیل کھنڈ کی مشرقی سرحد پار کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ باقر خان وغیرہ کے ساتھ اس نے قلعہ پر پورب کی جانب سے اور بہادر خان روہیلا نے شمال کی طرف سے حملہ کیا۔ راجہ پہاڑ سنگھ نے اپنے ہاتھیوں سے باہر کی دیوار ڈھادی لیکن بہادر خان صدر دروازے سے اندر آگیا۔ مقابلہ کرنے والوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن تین ہزار ہندو مارے گئے۔

جھجار سنگھ کی سپردگی

ایرج کی تسخیر اور شاہی سپہ سالاروں کی یک جہتی نے جھجار سنگھ کو بدحواس کر دیا۔ علاوہ بریں اس کی رعایا بھی اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بھائی ہردیو سنگھ کو زہر دے دیا تھا۔ اسے صرف شک تھا کہ اس کی بیوی[39] سے اس کا ناجائز تعلق تھا۔ ایسی صورت حال میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا اس کے لیے بیکار تھا۔ اُس نے راہ دے دی اور مہابت[40] خان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس کی سفارش کر دے۔ شہنشاہ نے جھجار سنگھ کی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا۔

شاہجہاں کے حضور میں اس کا پیش ہونا اور معافی

معاملات کے کامیاب خاتمہ پر شاہجہاں 7ر فروری 1629ء کو گوالیار سے چل پڑا۔ ایک ہفتہ بعد آگرہ پہنچا۔ یہاں مہابت خان نے باغی جھجار سنگھ کو حضور شاہ پیش کیا۔ مجرم نے شہنشاہ کو بطور تاوان پندرہ لاکھ روپیہ اور چالیس ہاتھی نذر کیے۔ اس کے عوض شاہ جہاں نے اس کا اصل منصب برقرار رکھا لیکن بعض جاگیریں ضبط کر کے خان جہاں، عبداللہ خاں، رشید خان، سید مظفر خان اور پہاڑ سنگھ کو تقسیم کر دی گئیں۔ جھجار سنگھ کو حکم ہوا کہ وہ دکن میں دو ہزار سوار اور

دو ہزار پیدل کے حاضر ہو۔[41]

دکن میں اس کا کارنامہ

خان جہاں کے خلاف لڑائی میں جھجار سنگھ اعظم خان کی قیادت میں مغل پرچم کے نیچے بڑی بہادری سے لڑا۔ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے جنوری 1630ء میں وہ پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب دار بنا دیا گیا۔ اُسی سال کے ماہ مئی میں وہ اور اس کے بھائی پہاڑ سنگھ دونوں کو راجہ[42] کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ اعظم خان اس کی تدبیر اور ہمت سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ جھجار سنگھ کو وہ اکثر کونسل کی میٹنگ میں بلاتا اور اس کی تجویزات پر خاص طور پر غور کرتا۔ دھارور کے محاصرہ میں اس کی فوج نے دکن کی سرحدی چوکیوں پر دوبارہ حملہ کیا بہت سے ہاتھی، گھوڑے، خچر اور بیل اپنے قبضے میں کیے، قلعہ کی تسخیر پر اس کی خدمات کا مناسب انعام دیا گیا۔ جب اعظم خان کو معزولی کا حکم ہوا تو آصف خان کو اس کی جگہ دی گئی تو جھجار سنگھ کو اس کے ساتھ[43] رہنے کا حکم ہوا۔ 1634ء تک وہ دکن میں رہا۔ مہابت خان نے جو محاصرہ دولت آباد کی تسخیر کے لیے کیا اس نے اس میں بھی حصہ لیا اور بعد ازاں مہابت خان کی اجازت سے اپنے لڑکے جگ راج کو دکن میں اپنے عوض دے کر وہ وطن چلا آیا۔[44]

اس کی اورچھا کی واپسی اور زیادتی

اورچھا آنے کے بعد اس نے حوصلہ مند سرگرمی شروع کر دی اپنی توجہ ریاست کی توسیع پر کی۔ اپنے علاقہ کا کچھ حصہ پہلی عذاری میں کھو چکا تھا اب مناسب وقت تھا کہ اس کی تلافی کرے۔ شہنشاہ آگرہ سے دور تھا۔ اور دکن میں ہنوز خاموشی نہ تھی، اس کے پیش نظر اس نے بغیر کسی اشتعال کے راجہ پریم نرائن کے خلاف حملہ کر دیا۔ چوراگڑھ کی گڑھی گھیر لی۔ پریشان ہو کر راجہ نے حملہ آور سے مصالحت کی کوشش کی، لیکن جھجار سنگھ کسی گفت وشنید کے لیے تیار نہ تھا پریم نرائن نے امداد کے لیے ایک قاصد شاہجہاں کے پاس بھیجا۔ آخر الذکر

نے صرف ایک آدمی بھیجا کہ جھجار سنگھ کو سمجھا بجھا کر محاصرہ اٹھا لینے کے لیے کہے لیکن اس نے اس تجویز کو بھی حقارت کے ساتھ رد کر دیا۔ اب پریم نرائن کو روک تھام کی طاقت نہ تھی جس شرط پر بھی ممکن ہوا صلح کر لی۔ جب وہ قلعہ سے باہر آیا تو اس کے پیمان وفاداری کا خیال کیے بغیر بندیلیوں نے نہ لڑنے والے راجہ کو گھیر لیا۔ راجہ نے قطع اُمید کے بعد اپنی عورتوں کو مار ڈالا اور اپنے دو تین سو بہادر سپاہیوں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ چوراگڑھ کے قلعہ پر جھجار سنگھ نے قبضہ کر لیا۔

اس کے خلاف شکایت

اس درمیان میں راجہ پریم نرائن کا لڑکا، خان دوران سے مالوہ میں ملا۔ وہاں سے وہ جھجار سنگھ کے بلا وجہ جارحانہ اقدام کی اور باپ کے قتل کی شکایت کرنے شاہ جہاں کی خدمت میں گیا۔ جھجار سنگھ سے ناراض ہونے کی اب وجہ شاہجہاں کے پاس تھی۔ اس نے اپنے ایک ساتھی خراج گزار سردار پر بغیر شاہی اجازت کے حملہ کر دیا تھا اور اس سے بھی خراب بات یہ ہوئی کہ اس نے شاہی احکام کی سبکی کی۔ علاوہ بریں یہ بالکل سیاست کے خلاف تھا کہ دکن کی سرحد پر ایک طاقتور راجہ کو بغیر سزا کے چھوڑ دیا جائے لیکن اس پر حملہ کرنے سے پہلے شاہجہاں نے جھجار سنگھ کو اپنی شرائط سے آگاہ کیا۔ جن کے مان لینے پر خطا معاف کر دی جائے گی۔

کوی شاعر رائے کا مشن

بادشاہ نے جھجار سنگھ کے نام ایک خط لکھ کر سندر کوی رائے سے بھیجا۔ خط حسب ذیل ہے:۔

"پریم نرائن پر حملہ کرنا بغیر ہماری اجازت کے نامناسب حرکت تھی اور اس سے بھی خراب بات یہ ہوئی کہ تم اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ اب تک جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب تمہارے جرموں کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ جو حصہ تم

نے زبردستی لے لیا ہے اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ تم کو دس لاکھ روپیہ جو پریم نرائن سے ملا ہے اسے شاہی خزانہ میں بھیج دو۔ لیکن اگر تم ان مقبوضات کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے ہو تو اپنے علاقہ سے اسی کے برابر حصہ چھوڑ دو[45]

شاہجہاں کے رویہ پر تنقید

اس خط سے شاہجہاں کے خسیس ارادے کا اندازہ ہوتا ہے۔ بجائے ایک کمزور فریق اور اپنے خراج گزار کو بچانے کے بادشاہ خود ہی وہ فائدے لینا چاہتا تھا جو جھجار سنگھ نے اپنی کوششوں سے حاصل کیے تھے۔ جھجار سنگھ نے شاہانہ اعزاز کو صدمہ پہنچایا، اخلاق کے روایتی آداب توڑے۔ لیکن روپیہ سے سب کی تلافی ہو سکتی تھی۔ حصول زر کے بعد اس کے بھیانک کرتوت بھی مقدس ہو جاتے۔ پریم نرائن کے وارثوں کو معاوضہ دلانے کے لیے شہنشاہ نے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ صرف اپنے لیے روپیہ چاہتا تھا جیسے ایک رہزن دوسرے ہم پیشہ رہزن سے مال غنیمت میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ بادشاہ کی طرح اپنی رعایا کے تحفظ کا اسے خیال نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حریص نظر میں جھجار سنگھ کی ناجائز دولت پر تھیں اس سے وہ آخر الذکر کو محروم کرنے کے لیے، کوئی بہانہ چاہتا تھا۔

جھجار کو تعمیل حکم سے انکار

ان مطالبات کا صرف ایک جواب تھا۔ جھجار سنگھ نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اپنی سب دولت اور زمین جو آٹھ مہینے کی محنت شاقہ سے حاصل کی ہے وہ سب شاہی خزانہ میں جمع کر دیتا ہے تو اتنی تکلیف اٹھانے سے فائدہ کیا ہوا۔ یہ سوچ کر اس نے شاہی قاصد کو بڑی بے توجہی سے واپس کر دیا۔ اس نے اپنے لڑکے جگ راج کو کہلا بھیجا کہ وہ چھپ کر دکن سے آجائے۔ جگ راج دولت آباد سے اس بہانے فرار ہوا کہ شکار کھیلنے جا رہا ہے۔ خان جہاں، ناظم بالا گھاٹ نے اس کا پیچھا نہ کیا۔ لیکن خان دروان جو پایان گھاٹ کا ذمہ دار افسر تھا اس کی نظر بڑی تیز تھی اس نے مفرور کا سرگرمی سے پیچھا کیا۔ اس کو جا لیا اور مالوہ میں بہ مقام

اشتھااس کو شکست دی۔ اللہ وردی خان اگر خان دوراں سے ترک موالات نہ کرتا تو جگ راج گرفتار کرلیا گیا ہوتا۔[47] وہ بچ کر دھار مونی پہنچ گیا۔

اس کو زیر کرنے کی تیاریاں

پیش کردہ شرائط کی نامنظوری اور جگ راج کا دکن سے بھاگ کھڑے ہونے سے شاہجہاں کی سخت گیری کا ایک موقعہ مل گیا۔ حکم ہوا کہ بیس ہزار زبردست فوج تین مشہور سپہ سالاروں کی قیادت میں بندیل کھنڈ جائے اور باغیوں کو نیست ونابود کردے، ساتھ ہی ساتھ خان دوراں کو بھی حکم ملا کہ چھ ہزار فوج لے کر وہ چندیری کے راستے سے بجور جائے اور برسات وہیں گزارے۔ اس کے ساتھ دیبی سنگھ کو بھی جانے کا حکم ہوا۔ آخر الذکر بندیلہ کی گدی کا دعوادار تھا اس کو راجہ کا خطاب تین ہزار ذات اور تین ہزار سوار کا منصب بھی حاصل تھا۔ عبداللہ خان کو حکم ہوا کہ وہ ایراج پر قبضہ کر کے بھان دیر میں ٹھہرے۔ سید خان جہاں سے کہا گیا کہ وہ برسات تک بدایوں میں ٹھہرے۔ برسات ختم ہونے کے بعد تینوں سپہ سالار مل جل کر اور چھا پر حملہ کریں۔

جھجار کی کوشش مصالحت کے لیے

اس بڑے پیمانے کی فوجی تیاریوں نے جھجار سنگھ کو بدحواس کردیا۔ اس نے آصف خان سے استدعا کی کہ اس کی سفارش شہنشاہ سے کردے۔ شاہجہاں اس بات پر راضی ہوا کہ وہ سندر کوی رائے کو دوسری بار اور چھا بھیجے لیکن اس بار اس نے اپنے مطالبات اور بڑھا دیے۔ جھجار سنگھ سے بتیس لاکھ روپیہ تاوان طلب کیا۔ چوراگڑھ کے عوض بیان[49] وان سرکار سے دستبردار ہونا اور نیز یہ کہ جے راج کو خان زماں کی ماتحتی میں دکن بھیجنا ضروری قرار پایا۔ آخری شرط یہ تھی کہ وہ اپنے پوتے کو دربار میں بھیج دے جہاں وہ اس کی نیک چلنی کا یرغمال ہو کر رہے۔ سپہ سالاروں کو حکم ہوا کہ فی الحال وہ اپنے مجوزہ حملے اس وقت تک کے لیے ملتوی کردیں جب تک قاصد واپس نہ آجائے۔[50]

پہلے کی طرح یہ شرائط بھی جھجار سنگھ کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ شاید اس کا اظہار خوف صرف تصنع تھا۔ وہ ابتدائی گفت وشنید کے وقت پر خلوص نہ تھا اپنی جنگی تیاریوں کی تکمیل کے لیے وہ ایام گزاری کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے جھجار سنگھ نے سندر کوی رائے کو پھر اسی طرح واپس کر دیا بلکہ اس بار اس نے شرائط بھی نہیں سنیں۔ یہ تو نہیں تھا کہ وہ شاہی مطالبات پورا نہیں کر سکتا تھا اس کے پاس روپیہ بہت تھا لیکن وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے باغیوں کی طرح شاہی طاقت اور دشمنوں کے خلاف شاہجہاں کے ارادے کی پختگی سے وہ بھی بے خبر تھا۔

جنگ کی ابتدا

جھجار سنگھ کے جارحانہ برتاؤ کی اطلاع پر اس نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ مجوزہ منصوبہ کے تحت لڑائی شروع کی جائے۔ چونکہ تینوں فوجی سردار برابر[52] مرتبہ کے تھے۔ شاہجہاں نے شہزادے اورنگ زیب کو اعلیٰ سپہ سالار مقرر کیا اور شائستہ خان کو اس کا اتالیق اور مشیر بنا دیا۔ شہزادے کا منصب پندرہ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا ہوا۔ شاہی افسروں کو حکم ہوا کہ عمل میں لانے سے پہلے اپنی کارروائیوں کی توثیق اس سے حاصل کریں۔

اورنگ زیب کا حصہ

کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کا تقرر اس ذمہ دار عہدے پر اس کی خواہش کے پیش نظر ہوا تھا کہ اس کو دکن کا نائب سلطان بنا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مغلیہ خاندان میں دستور تھا کہ شہزادوں کو عملی انتظام سے جلد از جلد واقف کار بنایا جائے لیکن اورنگ زیب کے اس وقت کا یہ تقرر حقیقت سے زیادہ نام نہادی تھا۔ اس کا مقابلہ شاہ جہاں کے اس سپہ سالاری سے نہیں کیا جا سکتا جو رانا کے خلاف یا دکن کی مخالفت میں اس کو حاصل ہوئی۔ ان دونوں معرکوں میں شاہجہاں کی آواز موثر تھی اور مہم کی ابتدا اس کے ہاتھ میں تھی لیکن بندیلہ کی لڑائی میں اورنگ زیب نے اس طرح کوئی بات نہیں کی جو کچھ تجربہ اس نے حاصل کیا وہ

ایک تماشائی کی حیثیت سے عملی کارروائی سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔

جھجار سنگھ کا گھیراؤ جانوروں کی طرح کا

شاہی فوجوں نے فوراً جھجار سنگھ کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ لیکن شہنشاہ کو تسکین نہ ہوئی وہ جھجار سنگھ کے قتل کا خواہاں تھا ایسے باغیوں کی سزا صرف موت تھی اس لیے موجودہ کامیابیوں سے جوش میں آکر فوجی افسر چوراگڑھ کی طرف بڑھے۔ جھجار سنگھ کی ہمت ٹوٹ چکی تھی اب اس میں طاقت نہ تھی کہ چوراگڑھ میں ٹھہر کر مردانہ وار مقابلہ کرے، شاہ پرستوں کی آمد پر اس نے اپنی بندوقیں اور توپیں برباد کردیں، عمارتیں مسمار کردیں اور شاہ پور بھاگ گیا۔ وہاں سے لانجی ہوتے ہوئے دکن گیا۔ یہ سن کر شاہی فوج تیز رفتاری سے چوراگڑھ پہنچی خان دوراں قلعہ میں داخل ہوگیا۔ خاص مندر کی چوٹی پر چڑھ گیا اذان دی اور شاہجہاں کے نام سے خطبہ پڑھا۔ قلعہ کی دیکھ بھال کا ذمہ دار احداد خان وغیرہ کو بنا کر وہ عبداللہ خان کے پاس آیا تاکہ جھجار سنگھ کا تعاقب شروع کیا جائے۔

پکڑا جانا اور مارا جانا

شاہ پور میں راگھو چودھری نے خان دوراں کو باغی کی نقل وحرکت کی خبر دی۔ عبداللہ خان کے ساتھ اس کے پکڑنے کے لیے وہ فوراً چل پڑا۔ شہزادہ اورنگ زیب ان کے پیچھے تھا۔ اطمینان سے فوج کے پچھلے حصے کو دیکھتا رہا جو خبریں افسروں سے ملتی رہیں وہ دربار بھیجتا رہا۔ شاہجہاں نے شہزادہ کو حکم دیا کہ وہ دھمونی واپس آئے لیکن خان دوران اور عبداللہ خان نے چانداتک باغیوں کا پیچھا کیا اور قریب قریب ان کو جالیا۔ خان دوراں نے تجویز رکھی کہ رات کے سناٹے میں ان پر ٹوٹ پڑا جائے۔ لیکن عبداللہ خاں نے اسے روک دیا۔ جھجار سنگھ کو بروقت خبر مل گئی جان بچا کر گولکنڈہ پہنچا۔ لیکن بہت جلد خان دوران اس کے قریب پہنچ گیا۔ انتہائی ناامیدی کے عالم میں بندیلیوں نے بیر سنگھ دیو، کی خاص رانی پاربتی کو بُری طرح زخمی کیا۔ اپنی عورتوں کی شکلیں بگاڑدیں تاکہ وہ مغل

کے حرم میں داخل نہ کی جائیں۔ لیکن درگ بھان ولد جج ہر سنگھ اور اس کا پوتا درجن سال زندہ پکڑ لیے گئے۔ جھجار سنگھ اور جگ راج کسی طرح بچ کر قریب کے جنگلوں میں پہنچ گئے یہاں گونڈوں نے ان کو مار ڈالا، ان کے مردہ جسم خان دوراں کو ملے جس نے ان کے سر کاٹ کے دربار میں بھیج دیے۔[53]

مغلوں کے فائدے

اس درمیان میں شہنشاہ نے سید خان جہاں کو حکم دیا کہ جھجار سنگھ کے چھوڑے ہوئے خزانوں کو وہ جنگل اور کنویں کھود کر بر آمد کرے۔ اسحاق بیگ یزدی، باقی بیگ، قلماق اور مکرمت خان، خان جہاں کی امداد کے لیے بھیجے گئے۔ مقامی باشندوں کے بتائے ہوئے نشانات پر انہوں نے دھامونی اور دیتا کے درمیان کی زمین کھودی بہت کم وقفہ میں اٹھائیس لاکھ روپیہ بر آمد ہوا۔ فی الجملہ ایک کروڑ روپیہ شاہی خزانے میں داخل کیا گیا۔ جو کچھ شاہی افسروں کو نہ مل سکا وہ وہاں کے باشندوں یا سپاہیوں اور احادیوں کو ملا۔

شاہجہاں کی مذہبی ناروا داری

اس طرح بندیلہ خان کی سب سے زیادہ خوشحال شاخ جس کو جہانگیر کی سرپرستی حاصل تھی اسی کے لڑکے شاہجہاں کے ہاتھوں بڑے دردناک انجام کو پہنچے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باغی ہونے کی حیثیت سے جھجار سنگھ سخت سزا کا مستحق تھا۔ لیکن اس کے زندہ گرفتار کیے ہوئے لڑکوں کا مذہب بہ جبر تبدیل کرانا۔ اس کی مستورات کو کنیز بنا کر شاہی حرم، یا دوسرے امراء کے گھروں میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا اور بالآخر مندروں کا باقاعدہ منہدم کرانا بغیر جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہ بالکل طے ہے کہ ان اقدامات کے پس پشت، اورنگ زیب کا ہاتھ نہ تھا۔ اس قسم کی پالیسی کو وجود میں لانے کے لیے وہ بہت کم عمر تھا۔

اس رویہ کی تہ میں یہ حقیقت نہاں ہے کہ خود شاہجہاں نے مسلمان افسروں

کے مذہبی جوش کو مشتعل کیا، اور اسی نے اور چھا کے شاندار مندر کے مسمار کرنے کا حکم دیا۔ اپنے دادا کی مصالحت پسندی بدلنے میں اس لیے کامیاب ہوا کہ اس کو مخالفت کا اندیشہ نہ تھا۔ یہ تو نہیں تھا کہ شاہجہاں کے پورے ہندو افسروں میں ہمت کی کمی تھی ہاں ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی وہ لوگ مرتبہ میں بھی کم تھے اور ان کے کردار بھی بہت پست ہوگئے تھے۔ راجہ جے سنگھ، راجہ جگت سنگھ، وٹھل داس گوڑ۔ نرہر داس جھالا، کشن سنگھ بھادریا وغیرہ صاحب اقتدار تھے۔ لیکن مذہب سے زیادہ ان کو اپنی طاقت و منزلت عزیز تھی۔ راجہ دیبی سنگھ ان سبھوں میں بدتر تھا جو بغیر کسی تاسف و پشیمانی کے حالات دیکھتا رہا، بلکہ بعض باتوں میں اس نے حصہ بھی لیا۔ وہ بندیلہ گدی حاصل کرنے کی فکر میں تھا وہ اس کو مل گئی حالانکہ گدی اُس کے عزیزوں کے خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کو بندیل کھنڈ کی حکومت مل گئی بیر سنگھ دیو اور جھجار سنگھ کی سی عزت حاصل نہ ہو سکی۔

بندیل کھنڈ کے دوسرے قلعوں پر قبضہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ دتیا پر بھی جلد ہی قبضہ ہو گیا۔ البتہ جھانسی میں جھجار سنگھ کے ایک ساتھی نسبت نے کچھ رکاوٹ پیدا کی۔ مکرمت خاں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ فتح کرنے والوں کو یہاں کافی مال غنیمت ملا۔ پورا توپ خانہ مع بارود، ایک غلہ سے بھرا ہوا گودام اور بہت ساز و سامان ان کے ہاتھ آیا۔ قلعہ گردھر ولد وٹھل داس کو دے دیا گیا۔ اس پر یہ عنایت اس کے باپ کی خدمت کا اعتراف تھا۔

شاہجہاں کا بندیل کھنڈ آنا

شہزادہ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو جو خطوط لکھے ان میں بندیل کھنڈ کے فطری مناظر کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا۔ لکھا کہ یہاں کے جنگلات قابل شکار جانوروں سے بھرے پڑے ہیں۔ مصنوعی جھیلیں بہت بڑی ہیں۔ پہاڑیاں سرسبز و شاداب ہیں۔

شاہجہاں کا جذبہ تحیر بیدار ہوا

اگرچہ اس کا گوالیار سے دکن جانا ضروری تھا لیکن وہ مشرق کی طرف چلا اور بندیل کھنڈ میں داخل ہوا بھوم گڑھ کے خوشگوار آبشار، دتیا کی خوبصورت عمارات نے اُسے اصل مسرت عطا کی اور چھا میں بیر سنگھ کے شاندار محل میں اس کا قیام رہا۔ بیر ساگر بھی اس نے دیکھا یہاں آبی پرندوں کا شکار کیا۔ دھامونی کے قریب اورنگ زیب نے اپنے باپ کا استقبال کیا یہاں سے دونوں سرونج گئے تاکہ دکن کا سفر اختیار کریں۔

چمپت رائے کی نقل و حرکت

جھجار سنگھ کے بعد بندیلا تاریخ کے تسلسل میں فرق آگیا۔ لیکن ان کے حکمرانوں کے انجام اور فاتحوں کی سنگین بداخلاقیاں دیکھ کر مقامی بندیلوں میں مخالفت پیدا ہو گئی جلد ہی ایک لائق اور پُرجوش رہنما کے پرچم تلے لوگ جمع ہو گئے۔ مغلوں کے خلاف اعلان جنگ ہو گیا۔ اس رہنما کا نام چمپت رائے تھا وہ مہوبا کے، اودے جیت خاندان کا فرد تھا۔ اودے جیت کا خاندان اور چھا کی شان و شوکت کے سامنے دب گیا تھا۔ چمپت رائے، بیر سنگھ کا دوست تھا اور بغاوت میں اسی نے جھجار سنگھ کی مدد بھی کی تھی آخر الذکر کی پائمالی کے بعد اس نے پرتھوی راج کو بندیلا گدی کا دعویدار بنایا۔ پرتھوی راج جھجار سنگھ کا وہ لڑکا تھا جو اب تک گرفتار نہ ہوا تھا۔ اُس نے اپنے پُرجوش ساتھیوں کے ساتھ چمپت رائے نے جھاترا کے محلوں پر حملہ کیا۔ جھاترا کا نام اب اسلام آباد پڑ گیا تھا۔ اس سرکار کے فوجدار، باقی خان نے چمپت رائے کی یورش کی بہت کچھ روک تھام کی مگر بندیلا کے چھاپہ ماروں کی نقل و حرکت نے اس کی اسکیم ناکامیاب بنادی۔[55]

اس کی سرکوبی کے لیے عبداللہ خاں کا بھیجا جانا

وسط جنوری 1639ء میں شاہ جہاں آگرہ سے لاہور گیا۔ اس وقت چمپت رائے کا حوصلہ ہمیشہ سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اس نے مغل کی سرحدی چوکیوں پر بلا

خوف وتردد حملے کر دیے۔ صوبہ داروں کی فوجی رسد کی روک تھام کی۔ اس کی غارت گری کا سلسلہ سرونج، بھلسا اور دھاموئی تک پہنچا۔ دکن کا راستہ غیر محفوظ ہو گیا۔ شاہ جہاں نے مجبور ہو کر عبداللہ خاں کو سرکوبی کے لیے بھیجا[56] سال بھر عبداللہ خان چمپت رائے کو زیر کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار اپریل 1640ء میں جاسوسوں نے خبر دی کہ چمپت رائے اور پرتھوی راج اور چھا اور جھانسی کے درمیان جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ عبداللہ خان باغی کو زیر کرنے کے لیے خود جانا چاہتا تھا لیکن باقی خان نے درخواست کی کہ اس مہم کا کام اسے سپرد کر دیا جائے۔ اس نے بندیلیوں پر کامیابی سے اچانک حملہ کیا۔ پرتھوی راج کو گرفتار کر لیا گیا حکم ہوا کہ اسے گوالیار میں قید کیا جائے۔ لیکن خاص باغی یعنی چمپت رائے غائب ہو گیا۔ بندیل کھنڈ میں شورش قائم رہی[57]

بہادر خان کی کوشش

عبداللہ خان کی اس دیر طلب مہم نے شاہجہاں کو غیر مطمئن کر دیا اُس نے اسے واپس بلا لیا۔ ایک نوجوان و پرجوش افسر بہادر خان روہیلا اس کی جگہ مقرر ہوا نئے افسر نے اپنا کام بڑی سرگرمی سے شروع کیا۔ باغیوں کی ایک جماعت کو جلد ہی نیست و نابود کر دیا لیکن اس کے درباری دشمنوں نے بادشاہ کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ کہا گیا کہ اگر اس کو بندیل کھنڈ میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے تو وہ اس کو دوسرا روہیل[58] کھنڈ بنا دے گا۔ چنانچہ بادشاہ نے اسے واپس بلا لیا اور عبداللہ خان[59] کو دوسری بار روانہ کیا۔ وہ صورت حال میں بہت کم تبدیلی کر سکا۔ چمپت رائے اب بھی دھوکہ دھڑی سے بچتا رہا کیونکہ بندیل کھنڈ کے باشندے پوری طرح اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

پہاڑ سنگھ کی کامیابی

بادشاہ نے پہاڑ سنگھ کو حکم دیا کہ اپنے مقامی ملک میں آتش بغاوت فرو کرے۔ چونکہ وہ بیر دیو سنگھ کا لڑکا تھا اس لیے اپنے گروہ کے لوگوں سے وفاداری

کی امید کر سکتا تھا جس سے چمپت رائے کی قوت کم ہو جاتی۔ علاوہ اس کے اپنی جنم بھومی سے وہ اچھی طرح واقف تھا اس لیے باغیوں سے ان ہی کی طرح لڑ سکتا تھا، وہ 1642ء میں بندیل کھنڈ آیا ایک ہی مہینہ میں چمپت رائے نے اپنے کو اس کے سپرد کر دیا اس کی ملازمت میں شہنشاہ کی رضامندی سے داخل ہوا کچھ دنوں تک تو یہ معلوم ہوا کہ چمپت رائے پہاڑ سنگھ کی اطاعت صدق دل سے کرتا ہے لیکن آخرالذکر اس کی ہر دلعزیزی پر رشک کرنے لگا۔ اس لیے چمپت رائے نے اس کو چھوڑا اور شہزادہ دارا کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔[60]

چمپت رائے، دارا کی ملازمت ترک کرتا ہے

باوجود پہاڑ سنگھ سے کشیدگی کے چمپت رائے نے کوشش کی کہ ظاہری اطوار سے خوش دلی کا اظہار ہوتا رہے، لیکن پہاڑ سنگھ بددیانت تھا ایک موقعہ پر جب چمپت رائے اس سے ملنے آیا تو اس نے اس کو زہر دینے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ بعد میں ایک موقعہ پر پہاڑ سنگھ نے کچھ مال مسروقہ چمپت رائے کے خیمہ میں پہنچا کر اس پر چوری کا الزام لگایا جس سے اس کو ندامت ہو۔ چمپت رائے نے شہزادہ سے شکایت کی، اس نے بغیر کسی تحقیقات کے پہاڑ سنگھ کا الزام صحیح مان لیا۔ نہ صرف اس کو نکالا بلکہ اس کو جاگیر[61] سے بھی محروم کر دیا۔ شہزادے کی اس حرکت نے چمپت رائے کو منحرف کر دیا۔ مغلوں سے اس کی دشمنی کا جذبہ پھر مشتعل ہوا۔ اس نے دارا سے اس کا پورا انتقام لیا اورنگ زیب کو چمبل پار کرنے کے لیے ایک ایسا راستہ بتایا جو بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ دارا کے خلاف لڑتا رہا۔

لیکن اورنگ زیب سے اس کا سمجھوتہ عارضی تھا چمپت رائے کا مشہور لڑکا چھتر سال تخت نشین ہوا تو اس نے شاہی حکومت کو پیام جنگ دے کر بندیل کھنڈ میں اچھا خاصہ انتشار پیدا کر دیا۔

نورپور کے زمیندار

نور پور کا زمیندار راجہ باسو، جہانگیر کا منظور نظر تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی جگہ اس کا لڑکا سورج مل بیٹھا۔ لیکن وہ شاہی اغراض کے لیے غدار ثابت ہوا۔ اس لیے اس کی جگہ اس کے بھائی جگت سنگھ کو دے دی گئی۔ جہانگیر نے جگت سنگھ کو ایک ہزار ذات اور پانچ سو سوار کا منصب دے کر کانگڑا کے محاصرہ کے لیے بھیجا۔ وہ حکومت کی خدمت میں لگا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ گاہے بگاہے نافرمانی بھی کرتا رہا لیکن جہانگیر کے عہد حکومت کے اختتام تک وہ تین ہزار ذات اور دو ہزار کا منصب دار ہو گیا۔ جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اس کا منصب بحال رکھا۔ شاہجہاں کے خیر مقدم کے لیے 13/ مارچ 1634ء میں وہ بمقام سرائے اعتمادالدولہ حاضر ہوا۔[66]

جگت سنگھ کی خدمات

اسی سال نومبر میں جگت سنگھ وسط بنگش کا تھانہ دار اس لیے بنایا گیا کہ وہ باغی کھٹکوں کو سزا دے، تین سال تک اپنے فرائض افسران بالا کی خوشنودی مد نظر رکھ کر اس نے انجام دیے۔ 1637ء وہ صوبہ کابل میں تعینات کیا گیا۔ اس نے کریم داد ولد احداد کو زیر کرنے اور گرفتار کرنے میں وہاں کے صوبہ دار کی مدد کی۔ فروری[69] 1639ء میں وہ لاہور آیا اور دوسرے ہی مہینے میں پورے بنگش[70] کا ذمہ دار بنایا گیا اس کے ایک سال کے بعد جب شہنشاہ کشمیر جا رہا تھا تو اُسے حکم دیا گیا کہ وہ راستہ صاف کرائے۔[71]

راج روپ

اس کی عدم موجودگی میں نور پور ریاست کا سارا انتظام جگت سنگھ کا لڑکا راج روپ کرنے لگا اس نے اپنے لیے کانگڑا وادی کی فوج داری بھی حاصل کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ شہنشاہ کی خدمت میں زر کثیر پیش کرے گا۔ لیکن اپنی فضول خرچی کی وجہ سے ذمہ داری پوری نہ کر سکا۔ جب شاہی خزانے سے اس کا مطالبہ ہوا تو اس کا رویہ باغیانہ ہو گیا۔ اس کا باپ خفیہ طور پر اس کی ہمت افزائی کرتا رہا۔ کانگڑا وادی

کے سرکاری ملازمین راج روپ سے معاملہ کرنے میں ناکامیاب رہے۔

جگت سنگھ اپنے گھر واپس آتا ہے

جگت سنگھ اپنے لڑکے کے چال چلن پر بظاہر ناخوشی کا اظہار کرتا رہا چنانچہ اس نے درخواست کی کہ اس کے خلاف مہم کا اسے سرغنہ بنادیا جائے۔ اس کے معاہدے پر کہ وہ سالانہ چار لاکھ روپیہ خراج ادا کرے گا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ وہ غیر وفادار اور مکار ہے۔ شاہجہاں نے اجازت دی کہ اگست 1640ء میں وہ اپنے گھر آسکتا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آگیا۔ دوسرے بارہ مہینے جب تک جگت سنگھ اپنے وطن میں رہا کوئی بات نامعقول نہیں ہوئی وہ پوری طرح شاہی احکام کی پابندی کرتا رہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اس کے رویہ سے مطمئن نہیں تھا اس نے کانگڑا وادی کے فوجدار کے عہدہ سے اسے برطرف کر کے اس کی جگہ خانہ زاد خان ولد سعید خان ظفر جنگ[72] کو مقرر کر دیا۔

اس کی فرد جرم

جگت سنگھ کے خلاف کسی خاص جرم کا اندراج نہیں۔ صرف ایک دلیل جو اس کی غداری کے سلسلے میں عصری مورخوں کے یہاں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جگت سنگھ کو اپنے تحفظ کا ضرورت سے زیادہ اعتماد ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر کافی تسکین بخش نہیں۔ ہندوستان کے زمینداروں کی حکومت کی مخالفت کا عام رویہ اور مال گزاری ادا کرنے میں دفع الوقتی سے کام لینا منجملہ دیگر اسباب بغاوت کے ایک سبب ہو سکتا ہے لیکن کسی خاص اشتعال کے بغیر کسی بغاوت کی مثال کم یاب ہے۔ برخلاف اس کے یہ بھی سوچنا فضول ہوگا کہ جگت سنگھ نے بے سبب بغاوت کی۔ نہ وہ بے وقوف تھا نہ بد معاش، اس کے بعد کے کارناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہادر بھی تھا اور لڑاکا بھی لیکن نادان نہ تھا۔ کیوں غلط راستے پر چل کر تباہی کا متمنی ہوا۔ پہلی نظر میں یہ بات بے معنی نظر آتی ہے۔

لیکن بغاوت سے پہلے کے حالات اس کے رویے کی ضرور تشریح کرتے

ہیں۔ پہلی بات یہ تھی کہ اس کو شہنشاہ کے رویہ میں بیگانگی نظر آئی۔ باوجود قابل قدر خدمات کے اس کو کوئی ترقی نہ ملی۔ اس کو بیزاری اور بے اطمینانی ہوئی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے علاقہ کی آمدنی سرکاری مطالبات پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ جو جاگیر اسے دی گئی تھی وہ ناہموار اور پتھریلی تھی آمدنی زیادہ نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی کم تھی جو اندرونی سکون بر قرار رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب وہ اپنی ریاست میں آیا تو چمپا کے راجہ کے ایک حصے زمین پر قبضہ کر لیا اس پر تارہ گڑھ کا قلعہ بنالیا اس جارحانہ اقدام اور اقتدار نے بادشاہ کو جگت سنگھ سے برگشتہ کر دیا۔ آخر الذکر نے ایسے سرکش کا وجود کشمیر کے راستہ میں خطرناک سمجھا۔ آخری سبب یہ تھا کہ اس نے اپنے لڑکے راج روپ کے خلاف سخت گیری سے کام نہ لیا جو شاہجہاں کی ناراضگی کا فوری سبب ہوئی۔ اسی لیے اس نے جگت سنگھ کو ہٹا کر کانگڑا کی فوجداری دوسرے افسر کو دے دی۔

چال چلن کی جواب دہی سے انکار

گورنمنٹ کے حکم کی نافرمانی یعنی اس کا دربار میں طلب کیا جانا اور نہ آنا بغاوت کا پہلا اعلان تھا۔ شاہجہاں نے سندر کوی رائے کو جگت سنگھ کے پاس جواب طلب کرنے اور اس کے مستقبل کے منصوبات کی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے بھیجا۔ کوی رائے نے اطلاع دی کہ جگت سنگھ کا رویہ بظاہر اطاعت و فرمانبرداری پر محمول تھا لیکن دراصل وہ بغاوت پر آمادہ ہو رہا تھا۔ اس خبر کے پاتے ہی شاہجہاں نے تین جنرلوں سید خان جہاں، سعید خان بہادر، ظفر جنگ، اصالت خان کو حکم دیا کہ پہاڑی علاقہ میں داخل ہو کر اس کی پناہ گاہوں پر حملہ کر کے انتشار ختم کریں۔ شہزادہ مراد جو کابل سے آرہا تھا، اس کو اس مہم کا سپہ سالار بنایا۔[73]

مہم

یہ مہم برسات کے ختم ہونے تک شروع نہیں ہوئی۔ جب شہزادہ مراد پٹھان پہنچا تو سعید خان بہادر اس سے جاملا، اول الذکر بہرام پور میں برسات کی وجہ سے رُکا تھا، اسی کے ساتھ جموں[74] کے زمینداروں سے مال گزاری وصول کر کے اصالت خان بھی آگیا۔

شہنشاہ کے مرتب کردہ منصوبہ کے مطابق ماؤ اور نور پور کے قلعے کا بہ یک وقت محاصرہ شروع ہوا اسی منصوبہ کے مطابق سعید خان، اصالت خان اور جے سنگھ ماؤ کے محاصرہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ یہ جگہ پٹھان سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی یہاں شہزادہ مراد فوجوں کی رسد کی نگرانی کر رہا تھا۔ سعید خان ہاواوادی سے چلا، جے سنگھ اور اصالت خان نے چاکی پار کر کے درہ کا راستہ لیا۔ سعید خان سب سے پہلے ماؤ پہنچا وہ یہاں ایک ہموار زمین پر خیمہ زن ہوا۔ یہ جگہ راجہ باسو کے باغ کے متصل اور درہ ماؤ پہاڑیوں کے درمیان میں تھی۔ بعد میں جے سنگھ اور اصالت خان بھی یہاں جلد ہی پہنچے۔ ان کی کمک کے لیے عبداللہ خان، قلیج خان، بہادر خان، اللہ وردی خان اور ظفر خان بھی آپہنچے۔

ماؤ کا محاصرہ

ماؤ کا قلعہ ناہموار پہاڑیوں میں گھنے جنگل کے درمیان واقع تھا۔ جس سرزمین کی آغوش میں قلعہ کھڑا تھا اس کے ارد گرد کا ہر درہ گچ کے کام سے بند تھا۔ قلعہ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا۔ فوج کا ایک دستہ خیمہ میں چھوڑ کر مغلیہ فوجی افسروں نے بقیہ فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے بھیجا کہ مصنوعی رکاوٹوں کو دور کریں۔ دشمن نے روک تھام کے لیے ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ بعض اوقات انہوں نے ان غیر جنگی سپاہیوں پر بھی حملہ کیا جو پاس پڑوس کے جنگلوں میں ایندھن اور چارہ جمع کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ دوران محاصرہ راجہ جے سنگھ اپنی جوش جوانی سے متاثر ہو کر صرف اپنے راجپوت سپاہیوں کو لے کر دشمنوں سے لڑنے چل پڑا۔ بندوقوں سے ایسی ہلاکت خیز آگ برسائی کہ وہ پسپا ہونے پر

مجبور ہو گئے۔ اس سانحہ نے ساری فوج کو اتنا افسردہ کیا کہ بعد کے تین مہینوں میں مشکل سے کوئی کامیابی حاصل ہوئی۔

بعض مقامی زمینداروں کی تجویز پر طے کیا گیا کہ ماؤ کا محاصرہ زیادہ سرگرمی سے کیا جائے۔ اس منصوبے کی روشنی میں نجابت خان، نظر بہادر خویشگی، اکبر قلی، سلطان کھکھڑ اور راجہ مان گوالیاری نور پور کی فوج سے کمک کے لیے ماؤ کی فوج میں بلا لیے گئے۔ ان لوگوں کے آنے کے بعد 9/نومبر 1647ء کو سعید خان ماؤ سے روانہ ہوا۔ "راپر" کے راستے سے اس باموقع پہاڑی پر دھاوا کیا جو قلعہ کے پشت پر تھی سعد اللہ و عبد اللہ اور ذوالفقار خان کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ اس لیے بھیجا کہ پہاڑ کی چوٹی پر کوئی مناسب جگہ قیام کے لیے تلاش کر لیں۔ لیکن انہوں نے دیکھا تو پہاڑی گھنی جھاڑیوں سے بھری پڑی تھی۔ باپ سے کہلا بھیجا کہ جب تک جگہ صاف نہ ہو سکے، وہ جہاں ہیں وہیں ٹھہریں۔ ہنوز یہ لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ باغیوں نے ایک نزدیکی ٹیلا سے بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ مغلیہ فوجی دستہ پراگندہ ہو گیا۔ یہ خبر پا کر سعید خان نے اپنے دوسرے لڑکے لطف اللہ کو مدد کے لیے بھیجا لیکن لطف اللہ ہار گیا زخمی ہوا اور واپس آیا۔ آخر کار ذوالفقار خاں دشمنوں کو بھگانے میں کامیاب ہوا دوسرے دن سعید خان "راپر" پہنچا اور آگے بڑھتا رہا۔ ہر مقام پر وہ کانٹوں اور جھاڑیوں کا دھس اپنے خیموں کے ارد گرد بناتا گیا تاکہ باغیوں کے شب خون سے بچا رہے۔ وہ آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ آگے بڑھتا رہا دشمن سے ایک ایک انچ پر مقابلہ ہوتا رہا۔

15/نومبر کو نجابت خان جو سعید خان کی فوج کے ہراول دستہ کا رہنما تھا اس مقام پر پہنچ گیا جو دشمنوں کے تحفظ کی خاص جگہ راجہ باسو کے باغ کے سامنے تھی جہاں اس نے ایک مضبوط فوجی دستہ تعینات کر دیا تھا لیکن ذوالفقار خان اور اس کے بندوقچیوں نے ایک طرف سے حملہ کیا اور نظر بہادر خویشگی، شیخ فرید، راجہ مان نے دوسری طرف سے بہر حال باغیوں نے بہادری سے مقابلہ کیا اور

حملہ آوروں کی فوج کو سخت نقصان پہنچایا۔ دشمنوں کے مورچوں پر حملہ بے کار گیا۔ مئو کے خلاف حملے فی الحال روک دیے گئے۔ راجہ مان کو الگ کر کے ایک قریبی قلعہ کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے فتح کر لیا۔

محاذ جنگ کے دوسرے مرکز کا بھی حال بہت امید افزانہ تھا۔ شمال اور جنوب کے اطراف ایسی بلند پہاڑیوں سے محفوظ تھے جو نور پور کے قلعہ کی پہاڑیوں سے بلند تر تھیں۔ مغربی کنارے پر ایک تیر کے نشانے کے لگ بھگ ایک تند و تیز دشوار گزار چشمہ بہہ رہا تھا۔ مشرقی کنارے پر جہاں صدر دروازہ تھا، وہاں ایک ایسا ناہموار میدان تھا جو فوجی قیام گاہ کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔ علاوہ بریں محافظ فوج کے پاس کافی رسد اور سامان جنگ تھا۔ دشمنوں نے تمام ہمسایہ عمارتیں گرادی تھیں۔

28/ستمبر 1641ء کو نور پور جاتے ہوئے سید خان جہاں بلھوان پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ راج روپ ایک مضبوط دستہ لے کر اس کی راہ روک رہا ہے۔ 15/اکتوبر کو وہ اس سے جنگ کرنے نکل پڑا۔ نجابت خان جو ہراول دستہ کا کمانڈر تھا اس نے راج روپ کو بھگا دیا۔ دوسری فوج نے ان رکاوٹوں کو مسمار کر دیا جو مغلیہ فوج کے راستے روکنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ یہ فتح بھی سید خان جہاں کو منزل مقصود کے قریب نہ لا سکی۔ نور پور کا راستہ اب تک نہ کھلا۔ ہر سرحدی چوکی پر مستعد بندوقچی اور تیر انداز تعینات تھے لیکن ایک مقامی پہاڑی باشندہ کی مدد سے خان جہاں ایک سنسان راستہ سے 9/نومبر کو نور پور سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ جگت سنگھ نے قلعہ کی محافظت کے لیے زبردست تیاریاں کی ہیں۔ یہاں دو ہزار بندوقچی تعینات تھے بایں ہمہ سید نے محاصرہ پُر جوش طریقے پر کیا۔ قلعہ میں داخل ہونے کی رکاوٹوں کو دور کر کے بڑی مشکلوں سے وہ قلعہ تک پہنچ پایا اس نے چاہا کہ سرنگ سے قلعہ اڑا دے، لیکن محافظ فوج نے ہر بار مختلف طریقہ سے اس کی کوششوں کو بے اثر بنا دیا کبھی تو

سرنگوں میں پانی بھر دیا اور کبھی فصیل پر اتنی روشنی کر دی کہ شاہی فوجیں نہ صرف ان کی آتش بازی کے زد میں آگئیں، بلکہ سرنگ بچھانے کا کام بالکل ناممکن ہو گیا۔ جب نجابت خان اور دوسرے لوگ اس کی فوج سے الگ تعینات ہوئے تو اس وقت سید خان جہاں کے قدم آگے بڑھنے سے رُک گئے۔ بایں ہمہ اس کے توپچیوں نے سات سرنگیں عمارتوں کے نیچے بچھا دیں۔ جس میں سے چھ کا پتہ فوج کو مل گیا۔ لیکن ساتویں سرنگ نظر نہ آئی۔ سید خان جہاں کا لڑکا ڈرا کہ مبادا اس کا بھی ان کو پتہ چل جائے۔ لہٰذا اس میں بارود بھر دیا اور باپ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں آگ لگانے کے لیے احکام کا انتظار کر رہا ہوں۔ سید خان جہاں اپنے آدمیوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ حملہ کرنے کی نیت سے تیار ہو گیا لیکن چونکہ سرنگ میں بارود پوری طرح نہ بھری گئی تھی اس لیے فصیل کا صرف ایک حصہ اڑا اور کوشش بیکار ہو گئی۔

ماؤ اور نور پور کے حملوں کی ناکامیابی نے شاہجہاں کو کسی قدر اپنا منصوبہ بدلنے پر مائل کیا۔ اُس نے اصالت خان کو نور پور بھیجا اور سید خان جہاں کو ماؤ تبدیل کر دیا۔ شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ وہ راؤ امر اؤ سنگھ اور مرزا حسن صفی کو انتظام سپرد کر کے پیٹھان چھوڑ کر ماؤ چلا جائے اور بذات خود محاصرہ کی نگرانی کرے۔ شاہی قوت کے اس اجتماع نے جگت سنگھ کو خوفزدہ کر دیا۔ اللہ وردی خان کی وساطت سے اس نے اپنے لڑکے راج روپ کو شہزادے کے پاس معافی کے لیے بھیجا۔ شاہانہ عفو تقصیر کا یقین کر کے وہ شاہزادہ مراد کے پاس 28/نومبر 1641ء کو حاضر ہوا۔ لیکن گفت و شنید کے درمیان اس نے بعض ناقابل قبول شرائط پیش کیں جس پر شہزادے نے کہا "اطاعت کے معنی ہیں جو کچھ دیا جائے اُسے قبول کرنا نہ کہ اپنی خواہش کے لحاظ سے مطالبہ کرنا" اس جملہ پر جگت سنگھ کا دماغ بدل گیا وہ قلعہ واپس آیا تا کہ اپنی کوشش از سر نو شروع کرے۔

ہمیشہ سے زیادہ اب جوش و خروش سے ماؤ کا محاصرہ شروع ہوا۔ سید خان

جہاں، رستم خان اور بہادر خان کو حکم ہوا کہ کنگ کی طرف سے قلعہ پہنچیں۔ بہادر خان ہراول دستہ کو لے کر آگے بڑھا دشمن سے بھاگتے جانا اور لڑتے رہنا کے انداز میں لڑائی جاری رکھی۔ جس میں اس کے ساتھ سو آدمی مارے گئے۔ لیکن فوجی افسروں کے چہرے پر شکن نہ پڑی۔ انہوں نے اپنی کارگزاری جاری رکھی۔ 13/دسمبر کو شہزادہ مراد نے قلعہ کے سامنے کی پہاڑی فتح کرلی اور ایک عام دھاوا بول دیا۔ جے سنگھ اور اللہ وردی خان نے درہ کی طرف حملہ کر دیا اور قلعہ میں آسانی سے داخل ہو گئے۔ قلیج خان نے بائیں سے حملہ کیا۔ دوسرے افسر جنگلوں میں داہنی طرف آئے اور اس پہاڑی پر پہنچ گئے جو قلعہ کے مقابل تھی۔ جگت سنگھ کی ہمت چھوٹ گئی، وہ تاراگڑھ بھاگ گیا۔ بیک وقت نورپور کی محافظ فوج بھی دل شکستہ ہوئی۔ اس نے بھی قلعہ خالی کر دیا۔ جس پر قبضہ کر لیا گیا۔

اگرچہ جگت سنگھ کے علاقہ کا خاص حصہ قبضہ میں کر لیا گیا تھا لیکن لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ تاراگڑھ کا پہاڑی قلعہ اب بھی اس کے قبضہ میں تھا۔ 28/دسمبر کو بہادر خان اور اصالت خان قلعہ فتح کرنے کے لیے بھیجی گئی۔ اس کے علاوہ پرتھی چند، راجہ چمپا کو حکم ہوا کہ وہ گھر واپس آئے اور قلعہ کی تسخیر میں امداد کرائے اس کے ساتھ جگت سنگھ کا ایک جانی دشمن راجہ مان گوالیاری بھی تھا۔ ان لوگوں کو حکم ہوا کہ اس پہاڑی پر قبضہ کریں جہاں سے تاراگڑھ پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پہاڑی ضلع چمپا میں تھی۔[75]

تاراگڑھ کے محاصرہ کی ابتدا اوائل جنوری 1642ء میں ہوئی اور دو مہینے تک رہی۔ اگرچہ شاہی فوج کو بہت کم آگے بڑھنے کا موقعہ ملا لیکن جگت سنگھ تھک گیا تھا۔ اپنے لڑکے راج روپ کو سید خان جہان کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ شہزادے اور شہنشاہ سے اس کی سفارش کرے، اور اس کے منصب اور علاقہ بحال کرادے۔[76] شہزادہ مراد کی سفارش پر سید خان جہاں کو جگت سنگھ کو لانے کے لیے بھیجا۔ جب وہ تاراگڑھ پہنچا جگت سنگھ نے اس کو قلعہ میں داخل

کرلیا اور اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت دی جس میں خان جہاں اور اصالت خان کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی حکم ہوا کہ تاراگڑھ کا قلعہ مسمار کردیا جائے اس حکم کی وجہ سے شاہی افسروں میں اختلاف رائے ہوا۔ بہادر خان اور اصالت خان کی رائے میں حکم کی تعمیل فوراً ہونی چاہیے تھی۔ خان جہان نے دیرنہ کرنے کی صلاح دی بہادر خان کے رویہ پر جگت سنگھ مشتعل ہوگیا اس نے ان لوگوں سے کہا آپ لوگ قلعہ میں اس لیے آگئے کہ میں لے آیا۔ لیکن اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا میں اس قلعہ کا باہری حصہ سید خان جہاں کی نذر کرتا ہوں اور میں دفاع کی دوسری صف میں چلا جاتا ہوں مجھے دیکھنا ہے کہ تم مجھے کیسے زیر کرسکتے ہو۔ جگت سنگھ واقعی دوسری صف میں چلا گیا اور مزید مقابلے کی تیاری کرنے لگا۔

خان جہاں کا کام

خان جہاں نے حسب ذیل مراسلہ شاہ جہاں کی خدمت میں روانہ کیا "میں نے جگت سنگھ کی سفارش اس لیے نہیں کی، کہ میں اس سے ڈرتا تھا۔ حقیقتاً میں اس کے خون کا پیاسا تھا۔ میری دشمنی کے اسباب مختلف تھے۔ یہ جنگ جو شہزادے اور دوسرے افسروں کی سرکردگی میں لڑی گئی بہت طولانی ہوگئی اور جگت سنگھ نے اس قلعہ میں پناہ لی، جو ناقابل تسخیر تھا اس سے آگے جنگ بحال رکھنے میں شاہی اقتدار کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ میں جمال خان کو بھیج رہا ہوں وہ جہاں پناہ کو پورے حالات سے آگاہ کرسکتا ہے اب یہ حضور کے فیصلہ کی بات ہے کہ باغی کو معاف کیا جائے یا نہیں"۔ مراسلہ کے بعد خان جہاں نے کامیابی سے دوسرے افسروں کو شاہی احکام پر عمل کرنے سے روکے رکھا اور اس سلسلے کی ساری ذمہ داریاں بذریعہ تحریر اس نے اپنے سر لے لیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کو اس پر اصرار تھا کہ تاراگڑھ کی ساری عمارتیں مسمار کردی جائیں کیونکہ بعد کے ایک مراسلہ میں خان جہاں نے شہنشاہ کو لکھا کہ

جگت سنگھ اس پر رضا مند ہو گیا ہے بشرطیکہ وہ عمارتیں چھوڑ دی جائیں جو اس نے اپنے خاندان کے لیے بنوائی ہیں۔ باہر کی عمارتوں کو مسمار کرنے کے بعد خان جہاں نے اپنے داماد سید فیروز کو بقیہ فصیل و قلعہ کے استیصال کا حکم دیا اور خود جگت سنگھ کو اپنے ہمراہ لے کر 11/مارچ 1642ء کو شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جگت سنگھ کو شہنشاہ کے روبرو ایک ہفتہ بعد پیش کیا گیا۔ اس کا منصب بحال کر دیا گیا۔ اس نے اپنی بقیہ زندگی شاہی ملازمت میں گزاری۔

بندیلا کی بغاوت سے تقابل

یہ بغاوت بندیلوں کی بغاوت سے بالکل متوازی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے غیر معمولی طور پر مشابہ ہیں۔ دونوں یکساں حالت میں پیدا ہوئیں دونوں بغاوتوں کی بعض تفصیلات میں نمایاں مطابقت ہے۔ چوراگڑھ پر جھجار سنگھ کا زبردستی قبضہ کر لینا ریاست چمبا کے غاصبانہ قبضے جگت سنگھ کے اس مداخلت بیجا سے مشابہ ہے۔ پریم نرائن کو دغا بازی سے قتل کر دیا جانا ویسا ہی ہے جیسا پرتھی چند کے باپ کا قتل۔ دونوں یکساں حالات میں ہوئے اگر جھجار سنگھ کا بیٹا پریم جیت کسی وقت برداشتہ خاطر تھا تو جگت سنگھ کا لڑکا راج روپ بھی کچھ عرصہ تک غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ گو کہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ رویہ صرف دکھانے کے لیے ہو۔ دونوں بغاوتوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ ایک صورت میں باغیوں کی پوری صف کی صف نیست و نابود کر دی گئی اور دوسری صورت میں باغیوں کو معاف کیا گیا بلکہ نوازا بھی گیا۔ اسباب کی تلاش میں دور جانا نہیں ہے۔ بندیلہ کی بغاوت کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی دولت نے مغلیہ شہنشاہ کی حرص کو مشتعل کر دیا تھا اور بغیر ان کی بنیاد ختم کیے دولت کا پانا ناممکن تھا۔ البتہ جگت سنگھ کے واقعہ میں لالچ کی ایسی وجہ نہ تھی جہاں ایک مرتبہ وہ اس پر راضی ہو گیا کہ اس کا قلعہ مسمار کر دیا جائے تو پھر شاہجہاں نے بھی آگے قدم بڑھانا ضروری نہ سمجھا کیونکہ باغی اب بے ضرر ہو گئے تھے۔

باب 5

معمولی فتوحات اور انتشارات

اہل پرتگال

1537ء میں سان دیپ کے بعض پرتگالی سوداگروں نے بنگال[1] کے حکمران سے ہگلی کے کنارے کی زمین کا عطیہ حاصل کیا ہگلی شروع میں ایک چھوٹا شہر تھا جلد ہی وسعت و آبادی میں بڑھ گیا۔ باشندوں نے پائیدار مکانات بنوائے اور ان کی چھتوں پر چھوٹی چھوٹی جنگلی توپیں چڑھادیں، گنگا کی ایک شاخ نے شہر کے ایک طرف قدرتی آماجگاہ کا کام دیا اور ایک مصنوعی خندق نے دوسری[2] تین سمتوں کو محفوظ کردیا اس کی جائے وقوع بنگال کی شاہراہ تجارت کے دہانے پر تھی۔ اس لیے تھوڑے عرصہ میں وہ اس علاقہ میں بہت متمول و خوشحال بندرگاہ بن گیا یہاں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے علاوہ چین، ملکا، منیلا کے جہاز اور مغلوں، ایرانیوں، ارمینوں کی تجارت کا بازار تیزی سے گرم ہوا[3]

بنگال میں ان کا مقام

بقیہ سولہویں صدی میں بنگال کی غیر اطمینانی سیاسی حالت نے پرتگالیوں کو بڑے فائدے پہنچائے۔ انہوں نے اپنا اقتدار قائم کیا اور تجارت کو وسعت دی۔ حکومت سے نمک کی اجارہ داری بھی ان کو مل گئی جس کے عوض دس ہزار ٹنکا

مغلوں کو دینا طے ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دولت مند اور حکمرانی کے لحاظ سے تقریباً آزاد جماعت کی صورت میں ہوگئے۔ مغلیہ گورنروں نے ان کے اندرونی معاملات میں کبھی دخل دینا پسند نہ کیا یہاں کے انتظامات ایک سردار اور چار نمائندہ شہری کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی مذہبی ضرورتیں تاہم ان کی انجام دہی کے لیے ایک گرجا تھا جس کی نگرانی اغطسی مشنری کرتے تھے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر مخلوط النسل تھے، ان لوگوں نے گودا، کوچین، اور ملکا کے آقاؤں سے روگردانی کی تھی۔ یہ لوگ نڈر بھی تھے اور بے ایمان بھی[4]

چٹاگانگ کے پرتگالی بھی اسی قماش کے تھے ان کی ساز باز سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے ہمسایہ سمندروں میں بھاگ دوڑ کی۔ گنگا کی مختلف شاخوں میں داخل ہوئے نچلے بنگال کے جزیروں کو لوٹ لیا اور اکثر چالیس پچاس فرسخ تک ملک میں گھس کر ساری آبادی کو بازار کے دن زیر زبر کر دیتے اور کبھی کبھی ان موقعوں پر کہ جب مقامی باشندے شادی یا کسی اور تہوار میں جمع ہوتے سب کو گرفتار کر لیتے، گرفتار کردہ غلاموں کے ساتھ ان کا برتاؤ قابل نفرت تھا وہ اکثر بوڑھے لوگوں کا ان کے مکان ہی میں نیلام کرتے اور نوجوانوں کو اپنے والدین[5] کو آزاد کرانے کا بڑا دردناک منظر ہوتا۔

ان کی تجارت کا فروغ ست گاؤں، سنار گاؤں کی بحالی پر ایک گھونسہ تھا۔ ان کی غارت گری نے ہمسایہ آبادیوں کو تباہ کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ بھی ظلم تھا کہ جو ان کی حکومت[6] میں آجاتے تھے ان کو زبردستی عیسائی بنا لیتے تھے۔ یہ نو مذہب لوگ یا تو غلام بنا کر دوسرے پرتگالی علاقوں میں یا اراکان[7] کے ماگھ بادشاہ کی جنگی کشتیوں کے کھینے کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ اراکان کا بادشاہ مغلوں کا جانی دشمن تھا جس کو وہ لوگ بارود، اسلحہ، شورہ اور دوسرے سامان حرب مہیا کرتے تھے۔ اس طرح ان کا وجود بنگال کے امن وسکون و خوشحالی کے لیے زبردست خطرہ ہو گیا کیونکہ صلح پسند سوداگر ہونے کے بجائے وہ بحری ڈاکو ہو گئے۔

جہانگیر کے زمانے تک ان کو آزادی تھی جو چاہتے تھے کرتے تھے بشر طیکہ سرکاری مطالبہ بے باق ہوتا رہے۔ شاہجہاں کی ناراضگی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ جب وہ بہ حیثیت باقی بنگال گیا تو ان لوگوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ بر خلاف اس کے انہوں نے شہزادے پرویز سے ہمدردی کی اور اُن سے ایک نے شاہجہاں کے ساتھ دغابازی بھی کی۔ ہگلی کے ایک باشندہ مانومل ٹیورس نے پہلے شاہجہاں کا ساتھ دیا لیکن ایک نازک موقعہ پر اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قیمتی اسباب سے لدی ہوئی کچھ کشتیاں گرفتار کر لیں، کچھ کنیزوں کو بھی لے گیا جس میں ممتاز محل کی دو لونڈیاں تھیں۔ اسی وقت ایک دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ میگوئل[1] روڈری گری ایک خوش پوشاک، مغرور نوجوان اور ابراہیم خان گورنر بنگال کے منظور نظر کا گستاخانہ سلوک تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ شاہجہاں کی ملازمت کرے اس نے انکار کر دیا۔ شاہجہاں کے دل میں یہ ذلتیں ٹیس مارتی رہیں۔ اُس نے طے کیا کہ جیسے ہی وہ صاحب اقتدار ہوگا، فوراً بدلہ لے گا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد بھی پرتگالیوں نے اس کے خوش کرنے کا کوئی رویہ اختیار نہ کیا نہ تحفے نہ مبارکباد۔[8]

انتقام لینے کا موقعہ ابھی تک نہ آیا ان کی خوش قسمتی تھی کہ شاہجہاں سلطنت کے دوسرے معاملوں میں الجھا رہا۔ اپنی قریبی تباہی سے بے خبر پرتگالیوں نے جبر ستانی اور غارت گری کا بازار گرم رکھا۔ 1629ء میں ڈائی گوڈاسا[2] نے ماگھ علاقہ سے خروج کر کے ڈھاکہ کے قریب ایک بڑے گاؤں پر دھاوا بول دیا اور بے رحمی سے سب کچھ لوٹ لے گیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک معزز مغلیہ خاتون کو گرفتار کیا جو جان بچا کر اپنی لڑکی اور بہو کے ساتھ ایک بند گاڑی میں جا رہی تھی۔ اس کی عصمت دری کی بھی کوشش کی اس بدمعاشی کی شکایت اس کے شوہر نے شہنشاہ سے کی، شہنشاہ بہت مشتعل ہوا لیکن 1632ء سے پہلے پرتگالیوں[9] کے

---

(1) Miguel Rodrigury (2) Diege Desa

خلاف کوئی موثر کارروائی نہ ہو سکی۔

ست گاؤں اور ہگلی کے دو پرتگالی سوداگروں نے جھگڑا کر کے شاہجہاں کے مجوزہ حملہ کو عمل میں لانے کا موقعہ دیا۔ پہلے سوداگر مارٹن آفسوڈی میلو[1] دوسرے حریف مارٹن لوتھر نے جھگڑا طے کرنے کے لیے ہگلی شہر بلایا، لیکن چونکہ فریق ثانی آفسو کا بیحد قریبی رشتہ دار تھا اسے منصفانہ فیصلہ کی اُمید نہ تھی اس لیے وہ قاسم خان گورنر ڈھاکہ کی طرف گیا اور پورے ہگلی شہر کی شکایت کی سارے باشندوں پر ایسے جرائم کا الزام لگایا جن کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ قاسم خان کا جب اس عہدہ پر تقرر ہوا تھا تو اس کو واضح طور پر شہنشاہ نے ہدایت کی تھی کہ اہل پرتگال کو نیست و نابود کرو۔ یاددہانی کے لیے متواتر فرمان بھی بھیجے تھے۔ افسوس کی شکایت اور امداد کے وعدے نے وہ موقعہ دیا جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا۔[10]

اُس نے پرتگالیوں پر اچانک[11] حملہ کا منصوبہ بنایا۔ اپنے لڑکے عنایت اللہ کو اس بہانہ سے بھیجا کہ وہ بردوان میں ہجلی کی مہم پر جارہا ہے۔ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ وہاں خواجہ شیر معصوم زمیندار، محمد صالح وغیرہ کے بحری بیڑے کی آمد کا سری پور میں انتظار کرے علاوہ بریں بہادر کو پانچ سو فوج دے کر اس لیے مخصوص آباد بھیجا گیا کہ وہ عنایت اللہ کے ساتھ متحد ہو کر اسی وقت کام شروع کرے جس وقت خواجہ شیر اپنا بحری بیڑا لے کر پہنچے۔ مقررہ اشارے پر عنایت اللہ بردوان سے چل پڑا اور چوبیس گھنٹے کے اندر بلدی پور پہنچا جو ست گاؤں اور ہگلی کے درمیان میں ہے۔ بہادر اپنا دستہ لے کر فوراً اس سے مل گیا انہوں نے ہگلی کا راستہ بند کرنا شروع کر دیا تاکہ پرتگالی بچ کر نہ جا سکیں، حملہ آور فوج کے ساتھ چھ سو کشتیاں چودہ ہزار سوار نوے ہاتھی اور بہت سے پیدل سپاہی[12] تھے۔

جب پرتگالیوں نے اس جم غفیر کو خشکی اور تری سے آتے دیکھا تو گھبرا گئے۔

---

(1) Martin Offousade Mello.

وہ فادرس آف دی سوسائٹی آف جیسس کے پاس گئے تاکہ وہ لوگ حملہ آوروں سے دوستانہ مصالحت کرادیں۔[13] جان کبرل[1] دو پکھراج لے کر مغل سردار کے پاس گیا۔ اس نے مرشد آباد پر ماگھ بادشاہ کے حملہ کرنے اور تباہ کرنے میں ہگلی کے پرتگالیوں کی امداد کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کا بھی الزام لگایا کہ ان ہی لوگوں میں کسی نے سید خاندان کی ایک عورت کو زر خرید کنیز بنایا اور آخری جرم یہ بتایا کہ یہ لوگ غلاموں کی خرید و فروخت میں بھی شامل ہیں۔

طرفین نے لڑائی کی تیاریاں شروع کردیں۔ کچھ دن تک ہگلی میں بڑی گڑبڑ رہی کیونکہ سارے باشندے ایک خیال کے نہ تھے۔ بعض ان میں سے ایسے تھے جو نہ صرف غلاموں کو سپرد کرنے کے لیے تیار تھے بلکہ مغلوں کی دوسری شرط بھی ماننے کے لیے تیار تھے۔ ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں مسئلہ پوری طرح بحث میں لایا گیا۔ اکثریت لڑنے کے موافق تھی اس لیے اس کی رائے غالب رہی۔ ازودو کو شہر کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اس کو بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ مقامی باشندوں پر اس کو اعتماد نہ ہوتا اور اس کے ساتھ کام کرنے والے سفید آدمیوں کی تعداد صرف تین سو تھی علاوہ بریں شہر کے بچاؤ کے لیے کوئی مضبوط تعمیر نہ تھی۔ اس کی مدافعت کے لیے صرف ایک خندق تھی جو کچھ ازودو نے کیا وہ یہ تھا کہ جو کچھ سامان موجود تھا ان سے متعدد مکانات کو متحد کر کے کچی مورچہ بندی کردی دھنس پر چھوٹی توپیں چڑھادیں۔ اس عارضی انتظام کے ساتھ وہ مغلیہ فوجوں کے حملہ کا مقابلہ کرنے کھڑا ہوا۔

پہلے دن محافظ دستہ کو مرعوب کرنے کے لیے مغلوں نے ایک فوجی مظاہرہ کیا۔ انہوں نے دکھانا چاہا کہ وہ ان پر حملہ کررہے ہیں اور پھر واپس ہوگئے۔ پہلی جولائی کو وہ شہر سے قریب تر اور پرتگالی توپ خانے کے اس زد تک پہنچ گئے جو ان سے پوشیدہ تھا۔ محافظ دستہ نے خوفناک آتش بازی کی۔ حملہ آوروں کو بھاری

(1) John Cabral.

نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا۔ دوسرے دن مغلوں نے بری اور بحری فوجوں کا ایک متحدہ حملہ کیا، خشکی پر وہ پرتگالیوں کے دفاعی محاذ سے اتنے قریب ہو گئے کہ بندوق و توپ اُن سے چھین سکے۔ لیکن بحری لڑائی میں ان کا حال برا رہا اس لیے کہ چھ سو آدمی مارے گئے۔

آدمیوں کی ایسی خوفناک بربادی نے مغل افسروں کی ہمت شکنی کی افسروں نے عنایت اللہ سے درخواست کی کہ جس مقام پر وہ پہنچ گیا ہے اس سے پیچھے ہٹ آئے لیکن آخر الذکر نے اس طرز عمل میں مغلیہ سلطنت کے اقتدار کی توہین دیکھ کر اس رائے کو پسند نہ کیا تھا جہاں تھا وہیں رہا، لیکن دشمن بھی تھک گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے لڑائی رک گئی۔ انہوں نے فادر فرائی انٹونیوڈی کرسٹو کو صلح کی بات چیت کرنے کے لیے مغل سپہ سالار کے پاس بھیجا اس کے ساتھ ایک مغل عورت بھی تھی تاکہ مسلمانوں پر اثر ڈال سکے۔ عنایت اللہ نے تین مطالبے کیے۔ (1) پرتگالیوں نے جو تین جنگی جہاز گرفتار کیے ہیں وہ سپرد کر دیں۔ (2) جملہ بنگالی غلاموں کو آزاد کر دیں۔ (3) ان میں سے ہر ایک فرد اس کے احترام اور سربلندی تسلیم کرنے کے لیے آئے۔ یہ شرط یقیناً بڑی ذلت آمیز تھی۔

کپتان پہلی شرط کے لیے فوراً راضی ہو گیا۔ جہاز سپرد کر دیے۔ دوسری شرط کے لیے اس نے اپنی برادری کی ایک میٹنگ کی جس میں اکثریت نے شرط منظور کرنے کی موافقت میں فیصلہ کیا۔ اگرچہ فادر مانویل کوئلھو کی زیر قیادت، فادرس آف سوسائٹی آف جیسس نے بڑے زور و شور سے لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر کوشش کی کہ صلح کی موافقت کے خلاف راستہ اختیار کیا جائے۔ کپتان نے نوے عیسائی غلام مغلوں کو سپرد کیے اس کے بعد مطالبہ ہوا کہ وہ جملہ ہندوستانی عورتیں تجربہ کار باورچی، ناچنے والی عورتیں ان کے نان بائی اور

a- Afrede.

کپڑے سینے والی عورتوں کو بھی سپرد کریں۔ کچھ تو ان باتوں پر بھی راضی ہو گئے اور مطلوبہ افراد کو ایک گرجے میں اکٹھا کیا لیکن پرتگالی سپاہیوں نے سب کو منتشر کر دیا کیونکہ یہ لوگ کسی اور دست برداری کے لیے تیار نہ تھے لیکن تیسرا مطالبہ حقیقتاً پورا ہوا۔

اس کے بعد تاوان جنگ کی رقم کے تعین کا سوال آیا۔ مغل سپہ سالار نے ساتھ لاکھ پاٹکا طلب کیا لیکن پرتگالیوں نے اتنی بڑی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے مدار المہام جان کرال ڈی کرسٹو اور مغل عورت کو عنایت اللہ نے روک لیا دوسرے دن اس نے کبرال کو آزاد کیا تاکہ وہ اپنے دوستوں کو شرائط منظور کرنے پر راضی کر لے لیکن چلتے وقت ایک آرمینی نے اس سے کہا کہ مغل سپہ سالار ایام گزاری کر رہا ہے، تاکہ مزید کمک آجائے اس خبر کی تائید جاسوسوں نے بھی کی اور پرتگالیوں نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن وہ لوگ مالی اور ہگلی دونوں کو بچا نہ سکتے تھے اس لیے ہگلی چلے آئے۔ مغلوں نے بالی پر قبضہ کیا اور باشندوں کی جان لینے کے بعد ان کے گھروں کو آگ لگا کر جشن فتح منایا مگر کرسچین کالج اور کچھ گھر باقی رہنے دیا۔

بے ترتیب لڑائی مغلوں اور پرتگالیوں میں ڈیڑھ مہینہ تک ہوتی رہی اس کے بعد ایک سو بیس توپیں بارہ پونڈ یا اس سے زیادہ وزن کے گولے چلانے والی ہگلی آئیں۔ مارٹن آنا تو محافظ دستہ کا جانی دشمن بھی سرنگ بچھانے والوں اور کچھ جنگلی جہاز لے کر محاصرہ کرنے والوں کی امداد کو آگیا یہ کمک پانے کے بعد مغلوں نے ہگلی پر ہر طرف سے گولے باری شروع کر دی اس کے علاوہ پرتگالیوں کے مقامی ملازم ملاحوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مغلوں نے چار ہزار گھرانے گرفتار کر لیے، اپنے بال بچوں کو بچانے کے لیے ملاحوں نے ایک ساتھ ہی پرتگالیوں سے قطع تعلق کر لیا اور مغلوں سے مل گئے۔[14]

اس سے پرتگالیوں کا زور گھٹ گیا، چونکہ کمک کی زیادہ امید بھی نہ تھی۔ اس

لیے انہوں نے تیسری بار صلح کی گفت وشنید شروع کی۔ عنایت اللہ نے بات چیت کرنے پر فوراً رضامندی ظاہر کی کیونکہ اس کے یہاں بھی غلہ کی وقتی قلت کی وجہ سے فوجیوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ کچھ بات چیت کے بعد پرتگالیوں نے دس ہزار ٹن کا تاوان جنگ کی پہلی قسط ادا کی اور وعدہ کیا کہ دو لاکھ ٹن کی دوسری قسط بھی جلد ادا کر دیں گے۔ اس رقم سے مغلیہ خزانہ پھر بھر گیا عنایت اللہ نے فوجی طاقت بڑھالی۔ اس درمیان میں مارٹن افنسو نے اپنے دشمنوں کی بربادی کی دوسری اسکیم تیار کی۔ اس نے بروقت موجودہ سامان سے کشتیوں کا ایک پل تیار کیا بڑی بڑی شہتیرین کیلیں، لوہے اور زنجیروں سے سب کو نتھی کر دیا۔ اس پل کی لمبائی کو یکجار رکھنے کے لیے اس نے ایک تار ہگلی کے آرپار تک لگادیا۔ اس کے علاوہ باہر جانے کے سب راستے بند کر دیے۔

اس بڑے پیمانے کی تیاری نے پرتگالیوں کو خوفزدہ کر دیا۔ کچھ دیر کی افراتفری اور اختلافی فیصلے کا ان پر غلبہ رہا۔ فطرتاً اس درمیان میں مغلوں سے بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حقیقتاً عنایت اللہ خود معاہدے کی خلاف ورزی کے لیے بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ اب اس نے محاصرے کی شدت بڑھادی اور حملہ آوروں نے اپنی یورش گرجے کی طرف شروع کی۔ یہاں خندق تنگ اور چھچھلی تھی۔ یہاں سے پانی آسانی سے نکالا جا سکتا تھا بہادر خان، اللہ یار خاں اور سعید حسن کمبوہ نے اپنی خندق کا سلسلہ گرجے تک پہنچادیا۔ اس کے بعد انہوں نے سرنگ بچھا کر بارود بھر دی محافظ دستہ نے دو سرنگوں کا پتہ چلالیا ان میں بارود کے بجائے مٹی بھر دی، لیکن ایک تیسری خندق کی ایک سرنگ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہی مغل وہاں اکٹھا ہوئے پرتگالی بھی زیادہ تر اس مقام پر آگئے ان کے جمع ہوتے ہی سرنگ اڑادی گئی اس دھماکے نے محافظ دستہ کو زبردست نقصان پہنچایا باقی ماندہ لوگوں کو ناقابل تلافی پست ہمتی سے دوچار کر دیا۔

پچاس ساٹھ آدمیوں کو چھوڑ کر ایک کشتی میں بیٹھ کر سارے پرتگالی ہگلی سے

چلے گئے اور مغلوں نے شہر پر فوراً قبضہ کر لیا۔ کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ تمام سڑکوں پر لاشیں بچھی ہوئی تھیں لاتعداد گھر جل چکے تھے۔ پرتگالیوں کے بحری بیڑے نے دریا سے بھاگنے اور مغلوں کی صف کاٹتے ہوئے جان بچانے کی کوشش کی۔ ان کے پاس بہت سی کشتیاں تھیں لیکن سوار ہونے والے کمزور تھے اور غیر منظم تھے۔ صرف مانویل ازویڈو کا جہاز البتہ ہلکی توپیں چول چھلا اور بندوقوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن مقابلہ کرنے والے کے پاس پانچ سو کشتیاں ایک لاکھ سپاہی، خندقوں کی پانچ قطاریں اور ایک سو بیس عدد توپوں کے علاوہ بے شمار بندوقیں تھیں۔

جب مغلوں نے پرتگالیوں کو دریا پر دیکھا تو ایک آتش بار بحری بیڑا سولہ کشتیوں کا آگ لگانے کا سارا سامان معہ شورہ، رال اور گندھک بھیجا۔ لیکن دشمنوں کے بحری بیڑے میں آگ لگانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری طرف پرتگالیوں نے ان کا بحری بیڑا پکڑ لیا۔ اس قطار کو کاٹ دیا جس سے راستہ مسدود تھا۔ اب ایک مہلک بھاگ دوڑ شروع ہوئی سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ یکے بعد دیگرے وہ پرتگالی کشتیاں جن میں پناہ گزیں بھرے تھے پکڑ لی گئیں یا ڈبو دی گئیں۔ ان کشتیوں میں ایک کشتی بڑے قیمتی سامان سے لدی تھی یہ ہگلی کے ایک بڑے سوداگر کی ملکیت تھی اس میں عورتیں بھی بھری تھیں۔ مغلوں نے قبضہ کر کے مسافروں کو گرفتار کر لیا بایں ہمہ ان سے کچھ پرتگالی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے، وہ ساگور پہنچے وہاں کے ایک پگوڈا کو قلعہ بنالیا وہاں سے جان کیرل، اراکان کے ماگھ بادشاہ کے پاس صلح کرنے کے لیے روانہ کیا گیا اس طرح ہگلی کو لٹیروں سے صاف کر دیا گیا۔

اس لڑائی میں دس ہزار آدمی مارے گئے، جن میں بوڑھے جوان، عورت بچے بھی تھے۔ تخمیناً چار ہزار چار سو عورت و مرد معہ اہل یورپ قید کر لیے گئے ان اسیروں میں کافی تعداد ان لوگوں کی تھی جو بہ جبر عیسائی بنالیے گئے تھے اور پاس

پڑوس کے پرگنوں اور قصبہ جات کے رہنے والے دس ہزار باشندے جو پرتگالیوں کے ہاتھ پڑ گئے تھے سب کو رہائی نصیب ہوئی۔ مغلوں کا بھی نقصان کم نہیں ہوا۔ ان کی بتیس کشتیاں آتش بار لڑائی میں تباہ ہوئیں۔ ساٹھ کشتیاں عارضی پل کی تعمیر میں ختم ہوئیں اور ایک سو سے زیادہ ساحل دریا پر بیکار ہو کر پڑی تھیں، زخمیوں اور مرنے والوں کی بھی تعداد ہزاروں میں تھی۔

قیدیوں کے لیے بڑی مصیبت کا زمانہ تھا۔ گیارہ مہینے دشوار گزار سفر کرنے کے بعد یہ لوگ آگرے پہنچے۔ نازک عورتیں معصوم بچے ناخوشگوار مصیبت برداشت کرنے پر مجبور تھے یہ سب قیدی شاہجہاں کے سامنے پیش کیے گئے۔ اس نے حکم دیا کہ ان سب کو شہزادوں، امیروں میں بانٹ دیا جائے۔ کچھ خوبصورت عورتوں کو اپنے حرم میں بھی رکھ لیا جائے۔ اس کے بعد شہنشاہ نے کوشش کی کہ کچھ پرتگالی پادری مسلمان ہو جائیں۔ ان کو عالی مرتبہ اور خاطر خواہ انعام کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ بلکہ ڈی کرسٹو نے ہمت سے کام لے کر بادشاہ کو عیسائی ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ عذاب روحانی سے محفوظ رہے۔ ڈی کرسٹو کو حراست میں لے لیا گیا۔ ایک سچے عیسائی کی طرح نو سال تک وہ اپنی صلیب لیے رہا۔ دو اور پادری جو ہگلی میں رہ گئے تھے ان کے ساتھ ڈھاکہ کے ملاؤں نے تحقیر آمیز سلوک کیا۔ ایک کو مارتے مارتے مار ڈالا اور دوسرے کو بھی بری طرح زخمی کر دیا۔ دوسرے پرتگالی جنھوں نے اسلام قبول کیا وہ فوراً آزاد کر دیے گئے ان کے علاوہ اور لوگ قید خانے میں رہے۔ ان کو شدید اذیت کے ساتھ رکھا گیا۔[15]

ہگلی کی بربادی اور پرتگالیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کو شاہجہاں کی مذہبی نارواداری سے بار بار منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ صحت ہے بھی مگر ساری بات سچ نہیں۔ مذہبی جوش و جنون کے علاوہ دوسرے اسباب جو گزشتہ بیان میں پیش کیے گئے ہیں، ان پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جو لوگ

شاہجہاں کو مطعون کرتے ہیں وہ پرتگالیوں کی موافقت میں ایک لفظ نہیں کہتے۔ پرتگالیوں کو صلح پسند اور صالح تاجر نہیں بتایا جاتا ان کے لٹیرے پن تبلیغی سرگرمی اور بے ایمانی کا تذکرہ ہر عصری تاریخ ہندوستان و غیر ہندوستانی میں ملتا ہے۔ جو کچھ ان کا انجام ہوا اس کے وہ سزاوار تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ضرورت سے زیادہ سختی برتی گئی، لیکن اگر ان کا استیصال اور شاہ جہاں کی ناروا داری میں اتفاقی مطابقت ہے تو یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ آخر الذکر اول الذکر کا سبب تھا۔

کوچک تبت

اس عہد کے مختصر الحاقات میں سب سے زیادہ دلیرانہ الحاق چھوٹے تبت کا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں ہاشم خان نے اس ملک کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کو تباہ کن ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔[16] شاہجہاں نے اپنے دور میں اس کوشش کی تجدید کی اس کو کچھ کامیابی ہوئی، تعجب ہوتا ہے کہ اس دور کے مورخین نے حسب دستور بادشاہ کی اس لڑائی کا جواز نہیں پیش کیا جو شمال کی غیر مہمان نواز پہاڑی علاقہ میں ہوئی۔ حقیقت یہ تھی کہ کوچک تبت میں بہت کم مایہ فخر سامان تھا اس کی پیداوار میں بجز بعض کم حیثیت اُون کے کچھ نہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حکمران ابدال نے کشمیر کے اصل حکمراں چکوں کو پناہ دے کر مغلوں کو ناراض کر دیا تھا۔ یہ چک یہاں سے اکثر اوقات اپنے قدیمی ملک میں داخل ہو کر انتشار پیدا کیا کرتے تھے۔

کشمیر کے گونر ظفر خان نے ابدال کو مغل حکومت کی اطاعت اور بادشاہ کے نام پر خطبہ پڑھنے کے لیے 1634ء میں راضی کیا۔ لیکن چار سال کے اندر وہ اپنا وعدہ بھول گیا اور اس نے معاہدے رد کر دیے۔ اس لیے 38-1637ء میں شاہجہاں نے تبت کی تسخیر کی اور ظفر خان دو ہزار سوار اور دس ہزار پیدل لے کر چھوٹے تبت میں داخل ہوا۔ ابدال کو ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر بھاگنا پڑا۔ بالآخر جب اس نے دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے تو اپنے کو ظفر خان کے

سپرد کر دیا۔ پھر شاہ جہاں کے نام خطبہ پڑھا گیا اور ابدال کو دس لاکھ روپیہ تاوان جنگ دینا پڑا۔

چھوٹے تبت کی تسخیر میں اسلحہ کے زور کی بہ نسبت ریاکاری و دغابازی سے زیادہ کام لیا گیا۔ لیکن ابدال کی اطاعت سے بھی زیادہ حبیب چک اور احمد چک کے خاندان کا خدشہ اہم تھا۔ اعتقاد خان کے دور نظامت میں آخر الذکر نے بے پناہ شرارتیں کی تھیں اور اب بھی ابدال کی طرف سے بھیجا گیا تھا کہ شاہی فوج پر عقب سے دباؤ ڈالے۔ ان کی رسد کا راستہ مسدود کر دیے۔ لیکن ابھی حبیب چک تبت ہی میں تھا کہ معہ سو سپاہیوں کے اس نے اپنے کو ظفر خان کے حوالے کر دیا، ظفر خان اس اندیشہ سے کہ اس کے صوبہ میں بغاوت نہ ہو جائے ابدال اور چک کو قید کر کے ظفر خان فوراً کشمیر واپس آیا۔

آسام

شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت شمال مشرق کی سرحد کے سیاسی حالات کسی لحاظ سے پیچیدگی سے خالی نہ تھے۔ کوچ بہار میں بیر نرائن ولد لکشمی نرائن حکمران تھا اور کام روپ میں مغل افسر شیخ زاہد برائے نام نگراں تھا۔ دس سال ان علاقوں میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، اس کا خاص سبب آسام کے بادشاہ آہوم کی احتیاط پسندی تھی جو خواہ مخواہ مغلوں سے کام روپ کی سیاست میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس پرسکون فضا کو قیام عطا کرنے کے لیے قاسم خان ناظم بنگال نے اپنے پیامبر آسامی سوداگر کے ساتھ آہوم بادشاہ کے پاس بھیجا۔ لیکن آخر الذکر نے اپنے کسی خود غرض مشیر کار کی رائے کے زیر اثر اس سوداگر کو قتل کرا دیا اور مغل سفیر کو اپنے یہاں بلانے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے بالی نرائن ولد پرکشت کی اس وقت مدد کی جب وہ کام روپ پر حملہ کرنے جا رہا تھا۔ کام روپ سے اس کو مغلوں نے بے دخل کر دیا تھا۔ اس طرح پر اک آگ بھڑکی جو دو سال تک اپنا کام کرتی رہی اور خوفناک طریقہ پر جان و مال کی تباہی کا باعث ہوئی۔

مغل حملہ کے لیے تیار نہ تھے اس لیے کام روپ سے انہیں جلدی نکال دیا گیا اور اس کی راجدھانی "ہاجو" پر حملہ آوروں نے قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں بنگال سے قاسم خان کا تبادلہ ہو گیا تھا اس کی جگہ اسلام خان آ گیا تھا۔ اسلام خاں نے آتے ہی اس بات کی بڑی کوشش کی کہ مغلوں کے مشرق میں ضائع شدہ اقتدار کی تلافی ہو جائے۔ اس نے زوردار کمک کام روپ کو بھیجی جس نے بالی نرائن اور اس کے مددگاروں کو بھگا دیا۔ مغلوں کا حملہ ابھی ہو ہی رہا تھا کہ بالی سنگھ کا انتقال ہو گیا اس طرح مشرقی علاقہ سے ایک شر انگیز مخزن کا خاتمہ ہو گیا۔

جو کچھ آہوم بادشاہ نے کام روپ میں کیا تھا اس کے بدلہ لینے کے لیے شاہ پرستوں نے طے کیا کہ لڑائی آسام تک کی جائے اور مغل سلطنت کی مشرقی سرحدیں جتنا ممکن ہو بڑھا دی جائیں۔ انہوں نے آہوم کی سرحدی چوکی کجلی پر حملہ کیا اور قبضہ بھی کر لیا۔ محافظ دستہ کجلی میں چھوڑ کر مغل آگے بڑھ گئے۔ سام دھارا میں رُکے آہوم بادشاہ نے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے جلدی جلدی تیاریاں کیں۔ سام دھارا کے قلعہ کو مکمل طور پر ٹھیک ٹھاک کر دیا اور محافظ دستہ مقرر کیا۔ اس نے پوری طرح سے قلعہ کی حفاظت کا انتظام کیا دشمن سے مقابلہ کے لیے تیار ہوا۔ آسام میں داخل ہونے سے پہلے ہی مغلوں کو اپنے دشمن کی قوت کا اندازہ نہ تھا۔ آہوم کے بادشاہ نے سرگرمی سے حملہ کیا اور ان کو دریائے برہمپتر کے اس پار بھگا دیا۔ کجلی کا قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انہوں نے کام روپ کا دارالسلطنت گوہاٹی کو بنایا۔

اس وقت 1658ء تک مغلوں اور آہوم بادشاہ کے تعلقات اگرچہ بہت دوستانہ تھے مگر پُر امن ضرور تھے کبھی کبھی جھگڑے ہوئے سرحد کے بارے میں یا تجارتی حقوق کے لیے یا ایسے ہی دوسرے معاملوں کے لیے لیکن کبھی کشیدگی زیادہ نہیں بڑھی۔ 1647ء میں آہوم بادشاہ کے پاس گوہاٹی کے فوجدار کے دوستانہ مشن بھیجنے کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ مغل[19] بادشاہ کی اجازت سے

ہوا تھا۔ حقیقتاً 1639ء کے بعد مغل مورخوں نے آسام کا بہت کم ذکر کیا ہے اور یہ بعید از قیاس ہے کہ کوئی سوچی سمجھی پالیسی اس علاقہ میں انہوں نے اختیار کی ہو۔ کام روپ پر قبضہ کرنا ایک انفرادی واقعہ ہے جس کا تعلق تمام شاہانہ پالیسی سے شاہجہاں کے دور میں نہ تھا۔ وہ اپنی سلطنت شمال مغرب اور جنوب کی طرف بڑھانا چاہتا تھا۔ بنگال سے آگے بڑھ کر مشرقی علاقہ کا خیال شاہجہاں کے دل میں کبھی کوئی خاص امنگ نہیں پیدا کر سکا۔ آسام سے جنگ صرف کام روپ کے بچانے کے لیے کی گئی تھی اگر بالی نرائن کی ہمت افزائی آہوم بادشاہ نہ کرتا تو اس میں بھی شک ہے کہ اتنا وقت اور زور اس علاقہ میں مغل ضائع کرتے یا نہ کرتے۔

بیر بھوم اور پاچیت سے لے کر رتن پور متوسط ہند اور روہتاس گڑھ موقوعہ جنوبی بہار سے لے کر اڑیسہ کی سرحد تک عہد متوسط میں یہ سارا علاقہ جھار کھنڈ کے نام سے مشہور تھا۔ بعد میں کئی ایک خود مختار حکومتوں میں تقسیم ہوا جس سے کبھی کبھی مغلوں کو درد سری ہوئی۔ اس علاقہ کی پہاڑی اور جنگلی خصوصیات کے سبب یہاں کے سرداروں کو زیر کرنا دیر طلب ثابت ہوا۔ علاوہ بر ایں دوسرے زمینداروں کی طرح وہ بھی وقت پر جھک جاتے تھے اور بعد میں خلاف ورزی کرتے تھے۔

اجینیا

شاہجہاں نے عبداللہ خاں فیروز جنگ کو حکم دیا کہ وہ بکسر کے قریب اجینیا کے زمیندار پرتاپ کی سرکوبی کرے۔ ہنوز عبداللہ خان اس کے بھوج پور کے قلعہ کا محاصرہ قریب سے کیے ہوا تھا کہ ایک دوسرے فوجی دستہ نے زبردست خان کی قیادت میں طوفانی حملہ کر کے دکھن کی طرف سے کوہی پور کا قلعہ فتح کر لیا۔ بھوج پور کا محاصرہ چھ مہینہ تک رہا۔ محافظ دستہ کی حالت دیگر گوں ہوئی۔ بالآخر پرتاپ نے خاص قلعہ خالی کر کے اپنے باغ میں پناہ لی۔ یہاں بھی وہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔ چاہتا تھا کہ اپنی گڑھی میں چلا جائے لیکن اس پر ظفر خاں کے

لڑکوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ ایک خوفناک لڑائی ہوئی جس میں آخرالذکر مارے گئے۔ مغلوں نے پرتاپ کی گڑھی کا بھی محاصرہ کر لیا۔ اس کو سپردگی پر مجبور کیا۔ وہ عبداللہ خان سے ملنے آیا صرف کمر پر ایک کپڑا باندھے تھا، اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے تھا۔ عبداللہ خان نے اسے قید خانہ بھیج دیا اور اپنی کامیابی کی اطلاع بادشاہ کو دی۔ شاہ جہاں نے پرتاپ کے قتل کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی بیوی کو کسی مسلمان افسر کو دیئے جانے کا حکم دیا۔[20]

رتن پور۔ 35-1634ء

دوسرا مقام عبداللہ خان کے حملہ کا مرکز رتن پور تھا جس کا زمیندار بابو لچھمن سرکش اور نافرمان بردار ہو گیا تھا۔ باندھو کے زمیندار امر سنگھ کی مدد سے عبداللہ خان نے رتن پور پر چڑھائی کی۔ راستہ میں بابو لچھمن کے ہمدردوں نے راستہ بند کر دیا لیکن عبداللہ خان نے آسانی سے اُن کو زیر کر کے تائی انتھر کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ مایوسی کے جذبہ سے متاثر ہو کر محافظ دستہ نے اپنے بال بچوں کو مار ڈالا اور دلیرانہ انداز میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، انہوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن کثرت تعداد سے زیر ہو گئے۔ اُن کا ایک ایک آدمی مارا گیا۔ شاہی فوج نے گڑھی پر قبضہ کر لیا عبداللہ خان رتن پور کے لیے روانہ ہوا۔ بابو لچھمن نے امر سنگھ کے ذریعہ صلح کی بات چیت شروع کی عبداللہ خان نے "کوی رائے" کو اس کے پاس شاہی رحم و کرم کا یقین دلانے کے لیے بھیجا۔ بابو لچھمن نے اطاعت قبول کی اور فیروز جنگ کے ہمراہ دربار گیا۔[21]

پالامئو

ان دونوں فتوحات سے زیادہ دلچسپ پالامئو کی تسخیر تھی۔ آس پاس کے علاقوں کی طرح یہ ضلع بھی مخلوط جنگل کا لبادہ پوش پہاڑیوں کا مجموعہ تھا درمیان میں چھوٹا ناگپور کے محدب میدان اور زرخیز وادیاں تھیں۔ اس پر ایک کولبری قبیلہ چیرس کا عمل دخل تھا اور اس وقت ان کا راجہ پرتاپ حکمراں تھا۔ گورنر بہار

سے اس کی نافرمانی اس کا ایک ناقابل عفو جرم تھی۔ جس کے لیے وہ سخت سزا کا مستحق تھا۔ لیکن پرتاپ کی خوش قسمتی تھی کہ جب عبداللہ خان اس صوبہ کا ناظم تھا تو آخر الذکر کو اتنی مہلت نہ تھی کہ اس کی طرف توجہ کرے۔ بقول مغل مورخ کے راجہ ضدی ہو گیا۔ نئے ناظم شائستہ خان سے ناشائستہ حرکات کرنے لگا اس کی اطلاع جب شہنشاہ کو ہوئی تو حکم ملا کہ پرتاپ کو بھگا کر اس کے کثیف وجود سے زمین پاک کی جائے۔[22]

حسب الحکم اپنے لڑکے کو پٹنہ کا انتظام سپرد کر کے شائستہ خان 12/ اکتوبر 1641ء کو پانچ ہزار گھوڑے پندرہ ہزار پیدل سپاہی لے کر پالا مئو کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی نقل و حرکت مکمل جنگ کی آراستگی کا نمونہ تھی۔ قلب فوج میں خود رہا، ہراول دستہ کا ذمہ دار زبردست خان کو بنایا داہنے بازو پر بختیار خاں اور بائیں پر آتش خان دکنی کو اور عقب میں سید مرزا کو تعینات کیا گیا۔ گیا سے آگے شائستہ خان بہت احتیاط کے ساتھ بڑھتا رہا۔ ہر مقام پر اپنی فوج کے ارد گرد کچی مٹی کا دھس بناتا گیا اس خیال سے کہ کوئی اچانک حملہ نہ ہو فوج کے آگے راستہ صاف کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت روانہ ہوئی جنگل صاف کیے گئے سڑکیں کشادہ کی گئیں اور دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے پاس پڑوس کے دیہاتوں میں غارت گری و بربادی کا بازار گرم ہوا۔ بایں ہمہ چیروس کبھی کبھی پڑوس کے جنگلوں سے نکل کر مغل فوج کے بھٹکے ہوئے سپاہیوں پر اچانک حملے کرتے رہے۔

26/ جنوری 1642ء کو شاہی فوج آرہ سے روانہ ہو کر پالا مئو کے قلعہ کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ دشمنوں نے ان راستوں کو روکا جہاں شاہراہ سے مختلف راستے پھوٹے تھے لیکن ایک تیز جھڑپ کے بعد مزاحمت کرنے والے بھاگ گئے۔ اب شائستہ خان نے اپنے ایک افسر کو اس مقام کے لیے روانہ کیا جہاں وہ خیمہ لگا سکے لیکن دشمنوں نے اس کی فوج کو شدید نقصانات پہنچائے۔ بالآخر بڑی جاں فشانی کے بعد شائستہ خان اس ندی پر پڑاؤ ڈالنے میں کامیاب ہوا،

جو قلعہ کے پاس سے گزرتی تھی۔ لیکن دشمن اس کے آدمیوں کو پریشان کرتے رہے۔ شاہی فوج نے ایک ایسے ٹیلے پر قبضہ کیا جس سے قلعہ پر آتش بازی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ پرتاپ بدحواس ہو گیا اور پیام بھیجا کہ وہ اسی ہزار روپیہ بطور پیشکش حاضر کرنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اس کو شاہی رحم و کرم کا اہل سمجھا جائے۔ وہ اس پر بھی راضی ہوا کہ پٹنہ جاکر مغل ناظم کی خدمت میں اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دے۔ یہ شرائط شائستہ خان نے منظور کر لیں کیونکہ وہ خود بھی عنقریب آنے والی برسات کے ڈر سے حملہ جاری رکھنا نہ چاہتا تھا۔

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا، کہ پالامئو میں اندرونی خلل سے وہاں کے معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت پڑی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پرتاپ نے اپنے ان احکام کے خلاف برے برتاؤ شروع کیے جنہوں نے ان کے خلاف سازش کی اس کا تختہ الٹ جائے۔ شائستہ خان کی جگہ پر اب بہار میں اعتقاد خاں آگیا تھا۔ اُس کے آتے ہی چیرو کے دو سردار دریا رائے اور تیج رائے نے اس کی امداد کا وعدہ لے لیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ پرتاپ کو قیدی بنا کر بھیج دیں گے۔ وہ لوگ پالامئو واپس گئے۔ دوستوں کی مدد سے پرتاپ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب اس قبیلہ کا سردار تیج رائے ہو گیا۔ اعتقاد خان نے جب اس سے وعدہ وفا کرنے کا تقاضا کیا تو اس نے ٹال مٹول شروع کی۔ لیکن تیج رائے زیادہ دیر تک اڑا نہ رہ سکا کیونکہ اس کا بھائی دریا رائے اس کے خلاف ہو گیا تھا تیج رائے کو سزا دینے کے لیے اعتقاد خان نے دریا رائے کو ملا لیا۔ آخر الذکر نے وعدہ کیا کہ وہ دیوگاؤں اس کے سپرد کر دے گا۔ بشرطیکہ ناظم اپنے آدمی وہاں بھیجے۔

اعتقاد خان نے اپنا ایک فوجی دستہ زبردست خان اور شاہ آباد کے زمیندار کی قیادت میں بھیج دیا۔ یہ لوگ اکتوبر 1643ء کے آغاز میں دیوگاؤں پہنچے۔ دریا رائے معہ اپنے لڑکوں اور دوسرے چیرو سرداروں کے ان کے استقبال کو آیا۔ قلعہ سپرد کر دیا۔ زبردست خان دریا رائے اور اس کے ہمراہیوں کو پٹنہ روانہ

کر کے دیوگاؤں میں اپنے کو مستحکم کرنے لگا۔ فرمانبرداروں کو انعام اور سرکش اور ضدی لوگوں کو سزا دے کر زمین ہموار کرلی۔ اس کے بعد اُس نے پالامئو کی سڑک چوڑی اور جنگل صاف کرنے کے لیے قرار ولی دستہ روانہ کیا۔ 15/ اکتوبر کو خبر ملی کہ تیج رائے نے چھ سو سوار اور سات ہزار پیدل راستہ روکنے کے لیے بھیجے ہیں۔ پہلی فوج نے شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ زبردست خان نے اطمینان کے ساتھ دشمن کا انتظار کیا اور موقعہ پر اُن کو پسپا کردیا۔

اس اثناء میں تیج رائے کی زبردست تیاری کی افواہیں اعتقاد خان تک پہنچیں۔ اس نے فوراً باقر خان نجم ثانی کو اپنی فوج کی امداد کے لیے دیوگاؤں بھیجا۔ لیکن آخرالذکر کے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی پالامئو میں ایک انقلاب آگیا۔ تیج رائے شکار کھیلنے چلا گیا تھا اس کی عدم موجودگی میں مدن سنگھ ٹھکرائی کے دو لڑکوں صورت سنگھ اور سیال سنگھ نے پرتاپ کو رہا کر کے دشمنوں کے سرداروں کے سپرد کردیا۔ تیج رائے ایک بے گھر کی طرح اِدھر اُدھر آوارہ مارا مارا پھرا۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں سر چھپانے کی جگہ تلاش کرتا رہا اس کا وکیل مدن سنگھ بھی ایسے ہی پریشانیوں میں مبتلا ہوا۔ دیوگاؤں کو دھیر ندر اجینیا کے سپرد کر کے زبردست خان اب گھنے جنگلوں کو پار کرتا ہوا تامان گڑھ پہنچا۔ یہاں اس کو پرتاپ کا ایک خط ملا۔ جس میں عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار کیا گیا تھا۔ لیکن زبردست خان نے جواب دیا کہ اس پر اس شرط سے اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ وہ میرے ساتھ پٹنہ چلے۔ پرتاپ نے یہ شرط منظور کرنے میں تکلف کیا۔ زبردست خان نے اس انکار پر جواب میں اس نحس انجام کا اشارہ کیا جو باقر خان کے آنے پر ہوگا۔ یہ سن کر پرتاپ گھبرا گیا۔ اس نے شرط منظور کرلی۔ زبردست خان کے ساتھ 17/ نومبر کو پٹنہ روانہ ہوا۔ باقر خان اور ان لوگوں سے ملاقات راستے میں ہوئی۔ پٹنہ پہنچ کر ایک لاکھ روپیہ تاوان ادا کرنے کے لیے پرتاپ راضی ہوگیا۔ اعتقاد خان نے ایک سرکاری منصب کے لیے اس کی

سفارش کی۔ شہنشاہ نے ایک ہزاری منصب دار کا اعزاز عطا کیا۔ اس طرح پالامئو سر دست اس تباہی سے محفوظ رہا جو اس عہد کے بعد اس پر نازل ہوئی۔[22]

مالوہ

مالوہ میں گونڈا اور بھیل نے گاہے ماہے شاہی افسروں کو تکلیف پہنچائی۔ یاں ایک بھاگرت بھیل "کھاتا کھیری" کا زمیندار تھا۔ جس نے اس وقت تک کسی گورنر کا اثر نہ لیا تھا۔ اپنے مستحکم جگہوں کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا۔ چنانچہ دسمبر 1632ء میں اس نے کچھ زیادتیاں کیں۔ ناصری خان گورنر مالوہ اس کی سرکوبی کے لیے گیا۔ بھاگرت گھبرا گیا اس نے اپنے پڑوسی سنگ رام زمیندار کنارے سے کہا کہ وہ اس کی وکالت کرے اور یہ وعدہ کیا کہ وہ فادار و فرمانبردار رہے گا جو قلعہ عرصہ دراز تک اس کا گھر تھا اس پر قبضہ رکھنے کے عوض برابر محصول ادا کرتا رہے گا۔ یہ بھی درخواست کی کہ دربار میں حاضر ہونے سے اُسے معاف کر دیا جائے۔ لیکن اس ناقابل اطمینان شرائط سے ناصری خاں کو آسودگی نہ ہوئی اس نے اپنے کوچ کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب وہ کھاتا کھیرلی سے چار میل کے فاصلے پر پہنچا تو بھاگرت کی ہمت نے جواب دیا وہ قلعہ سے اس وعدہ پر دست بردار ہوا کہ اسے معاف کر دیا جائے گا اور نیک سلوک بھی کیا جائے گا۔ 24/دسمبر 1632ء کو ناصری خان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہاں بادشاہ کے نام پر خطبہ پڑھا گیا اور مسلم رسوم کے لحاظ سے اسے وقف کر دیا۔[23]

اس سال بعد گونڈوانہ کی پہاڑیوں میں بمقام کنار کچھ جھگڑا ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ سنگ رام زمیندار وفادار سلطنت مغلیہ کا جب انتقال ہوا تو اس کے افسر اعلی نے ماروی گونڈ نے سنگ رام کے لڑکے بھوپت کو جائداد سے محروم کر دیا۔ خود قابض ہو گیا ایک حقیر رقم اس نے بھوپت کے گزارہ کے لیے مقرر کر دی۔ جتھا کی حمایت سے اپنے کو مضبوط کر لیا۔ اس کے بعد اس نے مغلوں کی اطاعت سے بھی انکار کر دیا۔ سالانہ خراج دنیا بھی بند کر دیا۔ اس کا یہ اقدام دوسرے

زمینداروں کے لیے دلکش ثابت ہوا۔ انہوں نے بھی محصول روک لیا سرکشی پر آمادہ ہوئے۔

صورت حال ناقابل برداشت ہوگئی ضرورت محسوس ہوئی کہ فوری اور پُراثر قدم اٹھائے جائیں۔ خان دوراں، رائے سین سے باغی کی سرکوبی کے لیے چلا۔ وہ اس کے علاقہ میں داخل ہوگیا اور وہاں اس وقت تک رہا جب تک کہ جنگل کا راستہ صاف نہیں ہوگیا۔ واپس آنے کے راستے میں مختلف مقامات پر محافظ دستہ مقرر کر کے کنار کی وادی میں گیا۔ 26/اپریل 1642ء کو اس فوج مخالف کا مقابلہ کرنا پڑا اس فوج میں پانچ ہزار گونڈ تھے جس میں سات یا آٹھ بندوقچی بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے شاہی فوج کا راستہ روکا۔ خان دوراں نے ایک مختصر لڑائی کے بعد ان سب کو مار بھگادیا۔ برسات بھر وہیں ٹھہرا رہا۔ اس درمیان میں اُس نے ایک فوجی دستہ بھیج کر آس پاس کے جھونپڑے مسمار کرادیے۔ مغل سپہ سالار کے اس تیور نے ماروی گونڈ کو خوفزدہ کردیا اب وہ مرزا ولی اور گوبند داس کے پاس گیا۔ یہ دونوں خان دوران کے بھروسے کے آدمی تھے۔ ان لوگوں سے اس نے ایک پُر امن مصالحت کی درخواست کی۔ اپنے دوستانہ رویہ کے ثبوت میں اس نے بھوپت کو چند سر برآوردہ لوگوں کے ساتھ مغلیہ خیمہ میں بھیجا۔

ہنوز گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا کہ محسوس ہوا کہ محافظ دستہ کے کچھ لوگ بھوپت سنگھ کو چھڑا لے جانا چاہتے ہیں اس پر خان دوران نے ان سرداروں کو قید کردیا جو بھوپت کے ساتھ آئے تھے اور بھوپت کو بھی حراست میں رکھا۔ ماروی گونڈ کے قلعہ نہ دینے پر خان دوراں آگے بڑھا اور لکھرا پہاڑی پر قبضہ کرلیا، لیکن تسخیر قلعہ کی کوئی خاص صورت نہ دکھائی دی۔ کیونکہ کنار کا جائے وقوع دو منزلہ پہاڑی تھی، جو ٹھوس چٹانوں کا ایک عمودی ٹکڑا تھی۔ ان قدرتی استحکامات میں ایک راستہ تھا وہ بھی بھاری پتھروں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ اس کا راستہ ایک ایک انچ توپوں سے محفوظ تھا۔

ان حالات میں بغیر زبردست توپ خانہ کے قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا اس لیے خان دوران نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ دو بڑی توپیں اور کمک بھیج دی جائیں۔ شاہ جہاں نے رشید خان انصاری کو برہان پور سے پہاڑ سنگھ بندیلہ کو اس کی جاگیر سے، جان سپار خان کو منڈسور اور پرتھوی راج راٹھور کو رامپور سے، خان دوراں کی امداد کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا۔ اس امدادی فوج کے آنے پر خان دوراں نے 18 ر فروری 1644ء کو قلعہ کے محاصرہ کی ابتدا توپوں کی بمباری سے کی۔ ماردی گونڈ نے محسوس کیا کہ مقابلہ کرنا بے کار ہے۔ اس نے صلح کی درخواست کی۔ مارچ کے خاتمہ پر خان دوراں سے ملنے آیا۔ خان دوراں نے قلعہ پر قبضہ کرلیا اپنے بھائی محمد صالح کے انتظام میں دے دیا۔ پانچ سو گھوڑوں اور سات سو بندوقچیوں کا ایک دستہ بھی ساتھ کر دیا۔[24]

گڑھوال اور کمایوں

گڑھوال اور کمایوں کے پہاڑی علاقوں پر بھی مغل بادشاہوں کی نظریں تھیں۔ کبھی کبھی ان پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں کمایوں کا راجا حاضر دربار ہوا تھا اس کو اچھے خاصے انعامات سے سرفراز بھی کیا[25] تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغل خاندان کا عمر بھر وفادار رہا۔

شاہ جہاں کے زمانے میں سب سے پہلی کوشش گڑھوال کو قبضہ میں لانے کی اپریل 1635ء میں ہوئی، یہ اس وقت کی بات ہے جب کانگڑا کے فوجدار نجابت خان نے سری نگر پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ سری مور پہاڑیوں میں داخل ہو کر دریائے جمنا کے کنارے شیر گڑھ پر قبضہ کرلیا۔ ہردوار تک برابر قبضہ کرتا چلا گیا۔ یہاں دریائے گنگا پار کر کے گڑھوال میں داخل ہوا۔ اب سری نگر کا فاصلہ صرف چھ میل رہ گیا۔ راجا نے اس سے دغا بازی کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دس لاکھ روپیہ بحیثیت خراج گزار ادا کرے گا لیکن اس کو پہاڑیوں میں ایسا گھیر دیا کہ راہِ فرار بھی نہ رہی۔ اس بری طرح سبھوں کی جان لی کہ بجز نجابت خان کے کوئی

آدمی نہ بچا۔ نجابت خان نے شہنشاہ کو اس تباہی کی اطلاع دی بادشاہ نے اس کو کانگڑا کی فوجداری سے برطرف کر دیا۔[26]

بیس سال بعد 1654ء میں خلیل اللہ نے سری نگر فتح کرنے کی دوسری کوشش کی۔ یہ کوشش بھی لاحاصل رہی۔ شاہ پرست بہادر پور تک دھاوا مارتے چلے گئے۔ کمایوں کے راجا سے اطاعت قبول کرائی اور واپس آ گئے۔[27] جنوری 1656ء میں قاسم خان میر آتش نے چار ہزار فوج سے گڑھوال پر حملہ کیا۔ اسی سال جولائی میں میدنی سنگھ ولد راجہ سری نگر شہنشاہ کی خدمت میں اپنے باپ کی جانب سے اطاعت پذیری کی درخواست پیش کرنے حاضر دربار ہوا۔[28]

ہندوستان کے شمالی و مغربی سرحدی پہاڑی قبیلوں میں ہمیشہ سرکشی اور بغاوت کی روح کارفرما رہی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں شاہی حکام کی بڑی پریشانیوں کا سرچشمہ تھی۔ لیکن 26-1625ء میں ظفر خاں نے اس پر دباؤ ڈالا اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جہاں باغی ایک اتفاقیہ نشانہ کا شکار ہو گیا۔[29] احداد کا جانشین اس کا لڑکا عبدالقادر ہوا۔ ظفر خان درہ خیبر کی طرف سے کابل جارہا تھا راہ میں عبدالقادر نے اس پر حملہ کیا۔ سارا سامان لوٹ لیا۔ اس موقعہ پر گورنر کی ساری فوج تباہ ہو گئی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد شاہ جہاں نے ظفر خاں کی جگہ لشکر خان کو کابل کا گورنر بنا دیا۔[30]

خان جہاں کی بغاوت کے زمانے میں ایک کمال الدین نے کابل اور اٹک درمیان افغانی قبائل میں شورش پیدا کر دی تھی۔ لیکن سعید خان نے فوراً اس کا مقابلہ کیا۔ عبدالقادر کو شکست دی۔ فتنہ فرو ہو گیا۔[31] اس کے بعد 1638ء میں تغز قبائل نے کریم داد کی قیادت میں عام بغاوت شروع کی۔ آخر الذکر کو زندہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔[32] دو سال بعد یوسف زئی قبیلہ بغاوت پر آمادہ ہوا۔ لیکن سید دلیر خان تھانہ دار نوشیرہ نے آسانی سے سرکوبی کر دی۔ 1650ء میں خوشحال کھٹک نے خود یوسف زئی قبیلہ کی تادیب کرنے کی درخواست کی وہ

کامیاب ہوااور اس کے بعد شاہجہاں کے بقیہ دورِ حکومت تک فوجیں ہندوستان سے قندھار کے لیے برابر آتی جاتی رہیں اس لیے بھی قبیلے خاموش رہے۔

قزوینی لکھتا ہے کہ لاہور کے قریب کی شکست کے بعد باسنقر کولاس (بدخشان) بھاگ گیااور وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ایک غیر معروف شخص اپنا نام باسنقر رکھ کر بلخ آگیا جہاں اس کا بڑا ہمدردانہ خیر مقدم ہوا۔ بلخ کے حکمران نے ایک بار اپنے خاندان میں اس کی شادی کرنے کا بھی قصد کیا۔ لیکن اس کی صداقت میں شک وشبہ پیدا ہوااور شادی نہ ہوئی۔ بھیس بدلنے والا بلخ سے ایران گیا۔ وہاں کے بادشاہ نے بغیر اس کی ملاقات کے بالواسطہ اس کی ایک شان دار دعوت کا انتظام کر دیا۔ ایران سے وہ بغداد اور ترکی گیا۔ بالآخر ٹھٹھ پہنچا۔ یہاں بھی اس نے اپنے پر فریب دعوئ دولت خان گورنر کے سامنے پیش کیے۔ گورنر نے اسے قید کیا اور شہنشاہ کے پاس بھیج دیا۔ وقاص حاجی نے اسے پہچان لیا اور 1636ء میں اس کو پھانسی دینے کا حکم کیا گیا۔

باب 6

احمد نگر کا اختتام

حکومت احمد نگر کا جائزہ

احمد نگر کی سلطنت 1490ء میں ملک احمد نظام الملک[1] نے بہمنی سلطنت سے الگ ہو کر اور اس کے نام نہاد بادشاہ سلطان محمود کو شکست اور اس کے متعدد حملوں کو رد کر کے قائم کی تھی۔ لیکن ملک احمد کے بعد ملک میں تفرقہ انگیز تحریکات پُر زور ہوتی گئیں اور اس کے وجود کی طولانی کشمکش کے آخری عہد تک ہم کو ایسا اور کوئی حکمراں نظر نہیں آتا جس نے کار آمد اقدامات پیش کرنے یا استحکام سلطنت کی قابل قدر فکر کی ہو۔ اس لیے احمد نگر جنگجو رہنماؤں کی طبع آزمائی کا ہمیشہ میدان تفریح بنا رہا۔ ان رہنماؤں کا مقصد اپنی برتری برقرار رکھنا تھا چاہے سلطنت قائم رہے یا نہ رہے۔ ان خرابیوں میں اگر بیجاپور اور گولکنڈہ سے مسلسل لڑائیاں بھی شامل کرلی جائیں تو سلطنت کی پراگندگی کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ جب سلطنت کی تخلیقی قوت ختم ہو گئی تو اس کے ذرائع آمدنی بھی کمزور ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتظام کی مشین بے کار ہو گئی 16ویں صدی کے آخری دہائیوں اور 17ویں صدی کے ابتدائی حصوں تک پہنچتے پہنچتے احمد نگر تن بے جان ہو گیا۔ ملک عنبر نے اُس کے پرانے دبے دبائے جوہر جمع کر کے پھر

روح پھونکنے کی کوشش کی لیکن اس کے انتقال کے بعد ہی اس پر زوال چھا گیا۔

مغلوں سے سابقہ

احمد نگر اور مغلوں میں باضابطہ تعلقات بُرہان اول کے دورِ حکومت میں شروع ہوئے۔ برہان اول نے بابر[2] اور ہمایوں[3] سے گجرات کے حکمران بہادر شاہ کی چیرہ دستیوں سے بچانے کی درخواست کی لیکن تیسرے مغل بادشاہ کی تخت نشینی کے سولہ سال تک یہ تعلقات سیاسی سطح پر قائم نہ ہوئے، گجرات پر اپنی پہلی مہم بھیجنے کے وقت اکبر نے میر محسن رضوی[4] کو نظام الملک کے دربار میں بھیجا۔ گویا یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ گجرات فتح کرنے کے بعد اکبر احمد[5] نگر کا بھی بادشاہ ہو گیا ہے۔ لیکن وقتی طور پر وہ نظام شاہ کی شکوک اطاعت اور بھیجے ہوئے تحفہ جات سے مطمئن ہو گیا۔ اکبر کی بھی حکومت شمال میں ہنوز مضبوط نہ ہوئی تھی اس لیے دکن کے حکمرانوں کو دعوت جنگ دینا خلاف[6] مصلحت تھا۔

دکن کی طرف اکبر کے اقدامات کے اسباب

لیکن مستقبل کے بیس سال کے اندر ہی مغلوں کی حکومت سب سے برتر ہو گئی۔ مشرق میں بنگال کی سرحد سے لے کر مغرب میں قندھار اور شمال میں کشمیر سے لے کر جنوب میں دریائے نربدا تک سارے علاقوں نے ایک بادشاہ کی قوت کا لوہا مان لیا اور ہر جگہ ایک ہی نظام سلطنت کا سایہ رہا۔ اس بھاری بھر کم سلطنت کی بنیاد ایسی فوجی آمریت پر تھی جس کو برقرار رکھنے کے لیے سلطنت کی دائمی توسیع ضروری تھی۔ علاوہ اس کے اس زبردست سلطنت کے وجود کا انحصار اک زبردست فوج پر تھا اور یہ فوج تعداد میں برابر بڑھتی رہتی تھی اس فوج میں ہزاروں بہادر سپاہی اور قابل قدر افسر تھے جن کو بے کام رکھنا اندرونی انتظام اور سکون سلطنت کے لیے خطرناک تھا۔ علاوہ بریں کام میں لگائے رکھنے کا خیال اکبر کی دکنی پالیسی کی تشکیل کا ایک سبب تھا۔

ایک دوسرا جذبہ بھی ممکن ہے اکبر کے دل میں رہا ہو کہ اس کو چکرورتین[7] کا

اعزاز حاصل کرنا تھا۔ اس کے سامنے ان ہندو حکمرانوں کی مثالیں تھیں جنہوں نے شمال کی تسخیر کے بعد جنوب کا رُخ کیا تھا۔ اگر یہ سوچا جائے کہ ہندو حکمرانوں کی مثال عہد ماضی کی داستان تھی تو علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی مثالیں بہت پرانی نہ تھیں اور اکبر ان دونوں سے کسی خداداد قابلیت میں کم نہ تھا۔

علاوہ اس خیال کے جو کسی شمالی حکمراں کو جنوب کی تسخیر کا پیدا ہوتا ہے اکبر کو ایک احساس یہ بھی تھا کہ وہ منجانب غیبی قوت اس امر پر مامور تھا کہ ہر ملک میں اس کو صالح حکومت قائم کرنا ہے۔ اس کے نزدیک مغل گورنمنٹ اچھی گورنمنٹ ہے۔ اس نظریہ کے تحت اس کی جدوجہد کا احمد نگر ایک موزوں میدان عمل تھا۔

احمد نگر میں بدنظمی

مرتضٰی نظام شاہ کے پاگل پن نے حکومت میں جماعتی جھگڑوں کو تقویت پہنچائی۔ حسین اور اسماعیل کے سریع الزوال اثر نے قتل عام و غارت گری شہر اور احمد نگر کی حکومت کا ایسا رواج ہو گیا جیسے امن و آشتی دنیا سے اٹھ گئی ہے[8] اپنے مخبوط الحواس بھائی کے مظالم سے بچنے کے لیے برہان ثانی نے بھاگ کر اکبر کے یہاں پناہ لی۔ اسی طرح سے اور بھی افسروں نے مغل دربار کو آماجگاہ بنایا۔ احمد نگر میں انتشار اور ایک حق دار کا دربار میں موجود ہونا، اس کی امداد کے لیے درخواست کرنا یہ سب ایسی باتیں تھیں جنہوں نے مغلیہ شہنشاہ کو احمد نگر کے معاملات میں دخل اندازی کا معقول بہانہ پیدا کر دیا۔

برہان کی سرتابی

اکبر کو خیال تھا کہ برہان ثانی کی امداد کر کے وہ اپنی برتری دکن میں زیادہ موثر طریقہ سے قائم کر سکے گا۔ لیکن جس کی پشت پناہی وہ کرتا رہا تھا وہ اتنا اطاعت شعار ثابت نہ ہوا جتنی امید تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے اکبر کی اطاعت سے انکار کر دیا اور خاندیش کا حکمراں جو اس کا ہمسایہ تھا اس کی بھی دوستانہ رائے سے گریز

کرنے لگا۔ علاوہ اس کے جب مغل سفیر فیضی، برہان ثانی کے دربار میں پہنچا تو اس کے ساتھ بھی نہ صرف نامعقول برتاؤ سے پیش آیا بلکہ بادشاہ کو مناسب تحائف بھیجنے سے اس نے انکار کر دیا۔[10] اس کی یہ حرکت اکبر کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ برہان ثانی کے انتقال کے بعد جو خانگی جھگڑے احمد نگر میں پیدا ہوئے انہوں نے اکبر کی مزید ہمت افزائی کی۔ چنانچہ اس نے زبردست فوج شاہزادہ مراد کی قیادت میں بھیج دی۔ شہزادے نے احمد نگر کو گھیرا اور برار[11] کی علیحدگی حاصل کر لی۔

برابر کا الحاق و نتائج

برار کا الحاق مغلوں کی مستقبل کی پالیسی کا پیش خیمہ ہے۔ اس نے شمال و جنوب کی رکاوٹ ختم کر دی۔ اسی نے شاہ پرستوں کو نظام شاہی حکمرانوں سے متواتر اور مسلسل جھگڑوں میں لگا دیا۔ سیاسی شہرت قائم رکھنے کا مغلیہ ذہنیت کو احساس تیز تر ہوا اس لیے احمد نگر کے وجود کا پورا اختتام اب صرف وقتی سوال تھا۔ مراد کی کارگزاری کی تکمیل کے لیے اکبر خود 1595ء میں دکن آیا۔ اس نے خاندیش ختم کیا برار پر قبضہ کیا، بالا گھاٹ کو مغلیہ سلطنت کا جزو بنایا۔ ایک فوری ضرورت نے اکبر کو شمال واپس آنے پر مجبور کیا وہ دکن میں اپنا کام ناتمام چھوڑ کر چلا آیا۔

عنبر کی بغاوت

مقبوضہ علاقوں کے الحاق نے مغلوں کو مجبور کیا کہ احمد نگر کے بعض حصوں کو چند حوصلہ مند سرداروں کے سپرد کریں ایسے لوگوں میں دو آدمی عنبر اور راجو نامی ہوئے۔ اپنی برتری کے لیے دونوں لڑنے لگے۔ عنبر نے اپنی دانشمندی و شجاعت سے اپنے حریف کو شکست دی۔ اپنے مقبوضات مضبوط کیے احمد نگر کی قسمت کو بیدار کیا اور نام نہاد شخص کو مرتضی ثانی کے لقب سے تخت[13] پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد اس نے شمال سے آنے والے حملہ آوروں کو خاندیش بھگا دیا۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں ملک عنبر ایسے حاضر دماغ و خوش تدبیر آدمی اور مغل کے کام چور سپہ سالاروں میں برابر جنگ رہی۔ خان خاناں، خان جہاں، عزیز کوکہ، ہر ایک نے باری باری اپنی دانشوری کو آزمایا، لیکن بہادر حبشی نے ان سب کو شکست دی۔ بالآخر شاہزادہ شاہجہاں دکن بھیجا گیا دو جنگوں کے بعد اپنے اس خاندانی وقار کو بحال کرنے میں وہ کامیاب ہوا جو اس کے بغاوت کے زمانے میں دوبارہ کمزور ہو گیا تھا۔ ملک عنبر کا انتقال 1626ء میں ہوا اس وقت مغل کے دکنی مقبوضات میں خاندیش، برار، قلعہ احمد نگر اور بالا گھاٹ کے حصے بھی شامل تھے۔

مرتضیٰ ثانی اور فتح خاں

ملک عنبر کی جگہ اس کے لڑکے فتح خان نے لے لی۔ لیکن مرتضیٰ ثانی کو اس پر اعتماد نہ تھا۔ غلط فہمی اس وقت زیادہ ہوئی جب فتح خان، خان جہاں کو گرفتار نہ کر سکا۔ اگر آخر الذکر کو اس وقت شاہجہاں کے تعاقب کی بھاگ دوڑ اور شدید برسات نے خستہ حال کر دیا تھا[14] دار السلطنت میں جب وہ واپس آیا تو مرتضیٰ ثانی نے اسے ستار کے قلعہ میں قید کر دیا لیکن فتح خان نے پہرہ دار کو رشوت دے کر راہِ فرار اختیار کی۔ سیدھے احمد نگر کے مغل سپہ سالار، سپہ دار خان کے یہاں پہنچا۔ یہاں اس کا خیر مقدم کیا گیا[15] جلد ہی ایک زبردست فوج تیار کر کے وہ مرتضیٰ ثانی سے جنگ کرنے کو بڑھا۔ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہو گیا۔ اس بار اس کو قلعہ دولت آباد میں قید کیا گیا۔ مرتضیٰ ثانی نے مقرب خان کو سپہ سالار مقرر کیا اور اخلاص خان کو پیشوا۔[16]

خان جہاں کی دغابازی

مہابت خان کی بغاوت اور جہانگیر کے بعد نور جہاں و آصف خان کی حاسدانہ رقابت سے جو مغلیہ سرکار میں ہلچل پیدا ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر جب مرتضیٰ ثانی، خان جہاں نائب سلطان کو ملانے میں کامیاب ہوا۔ آخر الذکر بالا گھاٹ اور دکن[17] کے دوسرے مغلیہ مقبوضات سے دستبردار ہو گیا۔ مغلوں کی قلمرو، اب

صرف قلعہ تک محدود رہ گئی جس کو سپہ دار خان نے ہاتھ سے جانے نہ دیا، جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا، تو اس نے خان جہاں کو دکن کی نظامت پر مستقل کر کے حکم دیا کہ کھوئے ہوئے علاقہ واپس لیے جائیں۔ لیکن آخر الذکر دفع الوقتی سے کام لیتا رہا اس لیے اُسے معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ زیادہ پر جوش افسر خان زماں، مہابت خان کو تعینات کیا گیا۔

لیکن ناظموں کی تبدیلی سے بھی صورت بہتر نہ ہوئی۔ حسب معمول مہم اور گفت و شنید کا سلسلہ دکن میں جاری رہا۔ علاوہ بریں مغلوں کی مداخلت بیجا کی روک تھام کے لیے مرتضٰی ثانی کی امداد اس کے پڑوسی کرتے رہے۔ احمد نگر کا وجود بیجا پور اور گولکنڈہ دونوں کے لیے بہت اہم تھا باوجود دونوں کی باہمی دشمنی کے ہم دیکھتے ہیں کہ مشترکہ دشمن سے جنگ کرنے میں ایک بار سے زیادہ دونوں متحد ہو گئے تھے لیکن یہ جتھے زیادہ تر وقتی تھے بنتے ہی بگڑ بھی گئے۔ شکوک، دھمکیاں۔ اگر سالمیت کے لیے نہ سہی مگر ظاہری ٹھاٹ باٹ بر قرار رکھنے میں احمد نگر کی امداد بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں نے کی۔ اول الذکر کا ہاتھ اس مدد میں زیادہ تھا دراصل اسی خارج الاصل امداد نے احمد نگر کے آخری اختتام کو عرصہ تک چلایا۔

خان جہاں کی بغاوت

خان جہاں کو ہٹا کر فور اُرادت[19] خان کو دکن کا ناظم بنایا گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد خان جہاں مغلیہ دربار سے بھاگ کر مرتضٰی ثانی کے پاس پناہ کے لیے پہنچا۔ اس باغی کے دولت آباد پہنچنے اور گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم نے شاہ جہاں کے لیے صورت حال ناقابل برداشت بنا دی۔ مغل سلطنت پر دو طرح سے شبہ پڑنے لگی۔ نظام شاہ نے خفیہ طور پر بالا گھاٹ قبضہ میں کر لیا۔ اور اب اعلانیہ خان جہاں کی امداد کر کے شاہی اقتدار کو پیغام جنگ دے رہا تھا۔ شاہجہاں کے لیے مناسب اور ضروری وقت آگیا کہ مرتضٰی خان کی بے باکی پر سبق دے۔ احمد نگر کا وجود اب قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

احمد نگر کی سلطنت کا رقبہ شاہجہاں کے منصوبے

اس وقت اورنگ آباد کا پورا صوبہ جالنا، ناسک تاگلانا اور ضلع کلیان سب اس کے حدود اربعہ میں تھے، اس ناہموار ملک کی جغرافیائی شکل دکنیوں کے لیے کار آمد تھی کیونکہ ان لوگوں کی تربیت خاص طور سے چھاپہ ماروں کی حکمت عملی کے نمونے پر ہوئی تھی۔ اچانک حملے مغل فوج کے لیے شب خون کی طرح تھے۔ ان لوگوں کی تیزی اور ہوشیاری نے شاہی سپہ سالاروں کو چکر میں ڈال دیا۔ میدان جنگ کی اس ناموافق فضا کو دیکھ کر شاہجہاں نے منصوبہ بنایا کہ دشمنوں کو کثرت تعداد سے زیر کیا جائے اور ان کے مختلف فوجی اڈوں پر بیک وقت حملے کیے جائیں۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی فوج اعظم خان (ارادت خان) کی ماتحتی میں اس قصد سے روانہ کی کہ وہ بالا گھاٹ میں داخل ہو کر خان جہاں کو مغلوب کر دے۔ دوسری فوج خواجہ ابوالحسن کی سرکردگی میں ناسک اور سنگم نیر کی غارت گری و تسخیر کے لیے بھیجی گئی۔ ایک اور فوج ناصری خان کی قیادت میں تلنگانہ کی طرف مشرق[20] بھیجی گئی۔

مرہٹوں کی عزت افزائی

شاہی فوجی حکومت میں ایک اہم تحریک یہ ہوئی کہ اپنے فوجی مرہٹہ افسروں کا اعزاز بڑھایا جائے یہ رویہ نظام شاہ کے فوجی افسروں کے لیے ایک طرح کا دعوت نامہ تھا کہ وہ بھی اپنی فوج چھوڑ کر ادھر چلے آئیں اور نظام شاہ کی فوج کمزور ہو جائے چنانچہ شاہجہاں کے دکن آتے ہی کھیلوجی، مالوجی اور اُداجی رام دکھنی، حضوری میں پیش کیے گئے اور شہنشاہ نے ان کو اعزاز و خطابات سے سرفراز فرمایا[21] بعد ازاں بددیانت، جادیو راؤ کے اعزاز بھی دربار شاہ میں حاضر ہوئے ان کو بھی اعزاز بخشا گیا[22] مسلمان افسروں میں جو ادھر سے ٹوٹ کر مغلیہ فوج میں آئے ان میں آتش خان، یاقوت خان اور خداوند خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

دھارور کی تسخیر

اعظم خان نے مہم کی ابتدا نظام شاہیوں کی ایک سخت شکست سے کی۔ اس نے خان جہاں کو احمد نگر سے مار بھگایا اور دھارور کا محاصرہ شروع کیا۔ یہ مقام محاذ جنگ کے لیے اہم تھا کیونکہ اس کی سڑک پار بالا گھاٹ تھا۔ شاہی فوج نے مخالفوں کی تعداد کم کرنا شروع کی۔ دراڑوں کی آڑ سے بندوق چلانے والوں کو نشانہ بنالیا۔ اتفاق سے اسی عالم میں ایک توپ فصیل سے گر پڑی۔ اس افتاد نے محافظ فوجی دستے کو اور بھی کم ہمت بنادیا۔ جب حملہ آوروں کا ایک دستہ سیڑھی اور کمند کا سہارا لیتے ہوئے فصیل پر پہنچنے میں کامیاب ہوا تو محافظ دستہ کے سرغنہ سیدی سلیم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے فوراً ہار مان لی۔[23]

پارندا کی غارت گری

پارندا کی تسخیر کے بعد اعظم خان نے رن دولا خان سے مصالحت کی بات چیت میں بے کار وقت ضائع کیا۔ رن دولا خان عادل شاہی فوج کا سپہ سالار تھا۔ ان اطراف میں وہ سرحدوں کی نگرانی کرنے آیا تھا۔ یہ افواہ سن کر کہ خواص خان بیجاپور کے آمر خان کا رویہ نظام شاہ کی ہمدردی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اعظم خان نے شہنشاہ سے کمک کی درخواست کی۔ اس کے فوراً بعد ہی اس کو آصف خان کا حکم ملا کہ شیخ معین الدین اور شیخ محی الدین کو بہ حفاظت محفوظ راستہ سے یہاں تک پہنچانے کا انتظام کردے۔ یہ ہر دو شیوخ بیجاپور اور گولکنڈہ سے تحفے لے کر آرہے تھے، دکنیوں کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے طے کیا کہ پارندا پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالے۔ اس نے جے سنگھ اور ملتفت خاں کو شہر اور مفصلات کی غارت گری کے لیے روانہ کیا۔ شاہ پرستوں کو مال غنیمت بہت کچھ ملا۔ اس میں سات ہاتھی بھی ہاتھ آئے۔[27]

احمد نگر اور بیجاپور میں مصالحت

پارندا کی غارت گری اور شاہی فوج کے قرب نے مقرب خان کو بدحواس کردیا بڑی گرم جوشی سے رن دولا خان سے امداد کی درخواست کی۔ اس نے احمد

نگر کی خستہ حالی کا ذکر کیا اور لکھا کہ حقیقت میں احمد نگر کا وجود ختم ہو گیا ہے کیونکہ سارا ملک مغلوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ ناسک اور سنگم نیر دونوں کو ابوالحسن نے لوٹ کر قبضے میں کر لیا ہے۔ خبار چاکن اور پونا اب شاہ جی کے ہاتھ میں ہیں، جو فی الحال مغلوں کا حلیف ہے دھارور ختم ہو چکا ہے کارندھار بھی قریب الفتح ہے اور دولت آباد کے ارد گرد شدید قحط کا غلبہ ہے اس کے علاوہ مقرب خان نے لکھا کہ اگر پارندا کو بھی مغلوں کے ہاتھوں جانے دیا گیا تو نظام شاہی خاندان کا خاتمہ مکمل ہو جائے گا۔ اس نے رن دولا کو آگاہ کیا کہ اگر وہ یہ ہونے دیتا ہے تو گویا بیجاپور کے مسخر ہو جانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔[28]

پارندا کا ناکام محاصرہ

رن دولا خان اور مقرب خان کے خط وکتابت کی خبر اعظم خان کو برابر ملتی رہی جب یہ بات اس پر پوری طرح واضح ہو گئی کہ دونوں میں صلح ہو گئی ہے اور خواص خاں نے رن دولا کو حکم دے دیا ہے کہ وہ مقرب خان کی امداد کرے۔ اعظم خاں نے اپنی جگہ پر طے کیا کہ پارندا پر دھاوا بولا جائے۔ اس نے فوراً محاصرہ شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نے کمک کے آجانے کا بھی انتظار نہ کیا۔ قلعہ تین طرف سے گھیرا گیا۔ مختلف فوجی دستے کی ذمہ داری متعدد افسروں میں تقسیم کر دی گئی۔ ایک سخت لڑائی کے بعد قلعہ کی خندق تک رسائی حاصل ہوئی۔ شاہی فوج نے خندق بھرنا شروع کر دی۔ محافظ فوجی دستہ نے اپنی مصیبت میں مقرب خان سے امداد کی درخواست کی۔ اس نے وٹھوجی کو حکم دیا کہ محاصرہ کرنے والے لشکر پر حملہ کر دے۔ اس نے حملہ کر دیا۔ مگر واپس ہونا پڑا۔

اس اثناء میں مغل فوجوں کی رسد میں کمی ہو گئی۔ ضروری ہو گیا کہ چارہ تلاش کرنے والوں کو ٹولیاں بنا کر ان اضلاع میں بھیجی جائیں جو یہاں سے کچھ دور ہیں۔ اس کارگزاری نے دکھنیوں کو اچھا خاصا موقع چارہ جمع کرنے والوں کو پریشان کرنے کا فراہم کر دیا۔ چنانچہ ایک ایسے وقت پر جب ملتفت خان اور

خداوند خاں فوجی دستہ کے ساتھ ایندھن اور چارہ لے کر واپس آرہے تھے
مقرب خان نے ان پر دھاوا بول دیا لیکن اعظم خان کی بروقت آمد نے صورت
حال بدل دی۔ دشمنوں کو زبردست خسارہ اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ چھ سو
اونٹ اور دو سو گھوڑے اور بہت سے بیل مال غنیمت میں شاہی فوج کے ہاتھ
آئے۔

لیکن بایں ہمہ ان صبر آزما حالات میں محاصرہ برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ مغلوں
کو شدید قحط کا بھی سامنا تھا اور دشمن ان کو اپنی جگہ سے ذرا بھی ہٹنے نہ دیتے۔ بیجاپور
کے عملی اتحاد سے نظام شاہی قوت دونی ہو گئی تھی۔ علاوہ ان دقتوں کے ایک بڑی
پریشانی یہ تھی کہ جس کمک کے آنے کی امید کی جاتی تھی وہ بھی نہ آئی۔ اس لیے
اعظم خاں کو مجبوراً پرندا سے ہٹنا پڑا۔ وہ دشمنوں کے نرغہ میں دھاروں کی طرف
واپس ہوا۔ راستہ میں بیک وقت اس کے آگے پیچھے دونوں طرف سے اتحادی
حملے کرتے رہے، بڑے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے وہ منزل مقصود پر پہنچا۔

کندہار کی تسخیر

دھارور میں کچھ دن آرام کرنے کے بعد اعظم خان نے اپنی مہم کی تجدید
کی۔ اس نے ایک اچانک حملہ نظام شاہی افسر بہلول نامی پر کیا۔ بہلول، رندولا سے
الگ ہو گیا تھا۔ اعظم خان کو اس مہم میں نو سو گھوڑے دو سو اونٹ اور بے شمار بیل
مل گئے اس کے بعد وہ امبا واپس آیا۔ اتحادی کاندھار کو چھٹکارا دلانے کے لیے
چل پڑے۔ لیکن اعظم خان نے کامیابی سے ان کے راستے بند کر دیے۔ برخلاف
اس کے ناصری خان جو جانبازی سے کاندھار کا محاصرہ کر رہا تھا۔ اس نے دکنی افسر
سرفراز خان کے اچانک حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ قلعہ کے نیچے خندقوں میں
سرنگ بچھانے کا کام جاری تھا۔ انتیس سرنگوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ منجملہ چھ
مکمل ہو گئی تھیں۔ اعظم خان کے پہنچنے پر تین سرنگوں میں آگ لگائی گئی۔ ایک
بے کار ہوئی۔ بقیہ دو نے فصیل کے باہر کی دھس کو تباہ کر دیا ساتھ ہی ساتھ

نصف فصیل بھی اڑادی گئی۔ قلعہ کی محافظ فوج برابر آتش باری کرتی رہی لیکن حملہ آور بڑھتے رہے یہ سلسلہ جنگ دوپہر سے غروب آفتاب تک جاری رہا لیکن قلعہ میں کوئی شگاف کرنا ناقابل عمل تھا اس لیے حملہ آور مجبوراً واپس ہوئے۔ رات میں خندقوں کا کام شروع کیا گیا۔ بقیہ تین سرنگوں میں آگ لگانے کی تیاری ہوئی۔ قلعہ کے محافظ دستہ نے جب دیکھا کہ اب بغیر ہتھیار ڈالے کوئی چارہ نہیں، تو شرائط کے ساتھ ہار مان لی شاہی فوج نے 7/ مئی 1631ء کو قلعہ اپنے قبضہ[30] میں لے لیا۔

شاہی فوجیں مغربی اضلاع میں

احمد نگر کی مغلیہ مہم کی مکمل تصویر پیش کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دو افسروں کی کارگزاری کا بھی ذکر کیا جائے جو برار اور ناسک بالترتیب بھیجے گئے تھے۔ وزیر خان نے دشمنوں سے بہت جلد برار خالی کرالیا۔ اس کے بعد وہ برہان پور چلا آیا لیکن ابوالحسن کا کام آسان نہ تھا۔ فرمان شاہی کے مطابق اس نے اپنے ماتحت افسروں کو گالنا اور پٹوار کے محلات لوٹنے کے لیے بھیجا۔ مرتضیٰ ثانی نے محل دار خان اور دادا پنڈت کو حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے بھیجا لیکن وہ ہار گئے شاہی فوج نے سنگم نیر تک ان کا پیچھا کیا۔ تخت نشینی کے سال ختم ہونے تک ابوالحسن نے ناسک اور سنگم نیر پر قبضہ کر لیا۔ اسے حکم ملا کہ ناسک شاہ جی کے سپرد کر دے کیونکہ اب وہ مغلوں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ناصری خان[31] کی امداد کے لیے روانہ ہو جائے۔

احمد نگر میں انقلاب

ہنوز یہ وسیع مہم ملک کو تباہ کر رہی تھیں کہ نظام شاہی دربار کے ایک انقلاب نے سلطنت کی بدی پر ہمیشہ کے لیے مہر لگادی۔ اب تک مقرب خان نے مغلوں کی روک تھام قائم رکھی تھی لیکن اس کی کارگزاریوں سے مرتضیٰ ثانی مطمئن نہ تھا۔ علاوہ بریں وہ اپنی بیوی[32] کی اس فرمائش سے بے حد پریشان تھا کہ اپنے سالے

فتح خان کو رہا کردے۔ بیوی کہتی تھی کہ وہ صورت حال میں قابل قبول تبدیلی پیدا کردے گا۔ اس کو خوش کرنے کے لیے مرتضیٰ ثانی نے فتح خان کو آزاد کردیا اس کو وکیل اور پیشوا کے عہدے پر بحال کردیا۔ لیکن فتح خان کی بحالی نے بجائے کسی سرگرمی پیدا کرنے کے جو کچھ مغلوں کے خلاف ہو رہا تھا اس کو بھی ختم کردیا۔ دوسری طرف مقرب خان اپنی معزولی پر دل برداشتہ ہوا۔ اعظم خاں کے ذریعہ اس نے شاہی ملازمت کرلی اس کو رستم خان کا خطاب[33] دیا گیا۔

مرتضیٰ ثانی کی اسیری اور قتل

فتح خان نے مرتضیٰ ثانی کی بے اعتمادی ابھی دل سے دور نہ کی تھی اس نے فوراً موقعہ پاتے ہی بادشاہ کو تخت سے اتار کر قید خانے بھیج دیا۔ اس نے شاہ جہاں کو لکھا کہ میں آپ کی اطاعت قبول کرنے پر تیار ہوں۔ اس کو ہمت افزا جواب ملا لیکن اس کے خلوص کی صداقت کے لیے اپنے قیدی کو قتل کرنے کی شرط بھی لگا گئی۔ اس کو پورا کرنے کے لیے فتح خان نے مرتضیٰ ثانی کو مجبور کیا کہ وہ زہر کا پیالہ پی لے۔ مشہور یہ کیا کہ وہ اپنی فطری موت سے مرا۔ مرتضیٰ کی جگہ اس نے حسین کو تخت پر بٹھایا۔ یہ دس برس کا لڑکا تھا۔[34]

فتح خان کی اطاعت

شاہجہاں نے فتح خان کو حکم دیا کہ وہ نظام شاہ کے سارے جواہرات اور ہاتھی حاضر کرے۔ لیکن فتح خان نے تعمیل ارشاد میں دیر لگائی اس لیے شہنشاہ نے رستم خان اور وزیر خان کو حکم دیا کہ دولت آباد پر حملہ کردیں۔ فتح خان چونک پڑا اور ابوالفتح کو اپنی طرف سے معافی مانگنے کے لیے بھیجا۔ اسی درمیان میں عبدالرسول دربار پہنچا۔ اس نے شہنشاہ کو تیس ہاتھی نو گھوڑے اور آٹھ لاکھ روپے کی مالیت کے جواہرات نذر[36] کیے۔ فتح خان نے شاہجہاں کا خطبہ پڑھا سکہ جات پر اس کا نام لکھوایا۔ شاہجہاں مطمئن ہوا اور 6/ مارچ 1632ء کو برہان پور چھوڑ دیا۔

شاہ جہاں کا شمالی ہند واپس آنا احمد نگر کی تسخیر کی پہلی منزل کا ختم ہونا تھا۔

لیکن جو نتائج حاصل ہوئے تھے ان میں اب تک استقلال نہ تھا، یہ صحیح ہے کہ خان جہاں کی بغاوت ختم کی گئی۔ بالا گھاٹ واپس لیا گیا۔ مغلوں کی برتری بحال ہوئی لیکن حقیقی امن و سکون اب تک قائم نہ ہو سکا۔ بے اطمینانی کی آگ بھی سلگ رہی تھی۔ اب تک جنار اور آس پاس کے اضلاع میں شاہ جی کی حکمرانی تھی۔ مغلوں کی طرف اس کا رجحان اچھا نہ تھا۔ علاوہ بر س فتح خان کی وفاداری ابھی تک مشکوک تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں چھوڑنا زبردست غلطی تھی۔ اس سلسلہ کی آخری بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بیجاپور اپنے مفاد کے پیش نظر احمد نگر کی حکومت کو زندہ کرنے کے لیے امداد کرنے کو تیار تھا۔

شاہجہاں کی واپسی کے اسباب

یہ بات بالکل واضح ہے کہ شاہجہاں پوری طرح صورت حال سے واقف تھا۔ آصف خان کو دکن کا نائب سلطان پیش کرنا اس مصلحت سے تھا کہ سب سے زیادہ بااثر افسر کو وہاں بھیجا جائے۔ لیکن آصف خان نے اس اعزاز کو قبول نہ کیا۔ اس کے بعد شاہجہاں کی نظر انتخاب مہابت خان پر پڑی جو تجربے کار سپاہی بھی تھا اور مغلیہ فوج کا سپہ سالار بھی۔ شاہجہاں کی شمال کی واپسی دو خاص وجہوں سے ہوئی۔ پہلی یہ تھی کہ شدید قحط نے اس کے جملہ ذرائع مجروح کردیے۔ اس کے آدمیوں کو بے چین کردیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کی وفات کا اتنا زیادہ اثر ہوا کہ وہ دکن سے بیزار ہو گیا۔ اب وہاں قیام نہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ انسانی کمزوری اس موقعہ پر غالب آئی ورنہ شاذ و نادر ہی اس نے معاملات کو نامکمل چھوڑا ہو گا۔

گالنا کی تسخیر

خان زمان کو حکم ملا کہ اپنے باپ کے پہنچنے تک وہ بحیثیت قائم مقام فرائض ادا کرتا رہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی پر اس کی آنکھیں بڑی تیزی سے کام کررہی تھیں۔ بادشاہ کے چلے آنے پر خان زماں کو خبر ملی کہ گالنا کے سپہ سالار

محمود خان کی وفاداری سے الگ ہو کر سوچ رہا ہے کہ قلعہ شاہ جی کو سپرد کر دے۔ آخر الذکر اب مغلوں کا جانی دشمن تھا۔ خان جہاں نے میر قاسم ہروی آلنگ کے مغلیہ سپہ سالار کو اس کام کے لیے بھیجا کہ وہ محمود خان کو ترغیب و تدبیر سے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ قلعہ شاہ پرستوں کے سپرد کر دے۔ میر قاسم اس سے دلفریب وعدے کرتا رہا۔ محمود خان نے شاہ جی کے نمائندوں کو برطرف کر دیا۔ اپنے لڑکوں مظفر اور منصور کو اپنے وکیل قاضی ابوالفضل کے ساتھ خان زمان کے پاس بھیجا۔ آخر الذکر نے بڑی عزت سے ان کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے ان کو منصب عطا کرنے کی سفارش کی۔ شاہجہاں نے محمود خان کو چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور گالنا کے قلعہ پر خان زماں نے قبضہ[40] پالیا۔

دولت آباد کی تسخیر

دکن پہنچنے پر مہابت خان نے اپنے کو ایک پیچیدہ صورت حال سے دوچار پایا۔ شاہ جی نے جب شاہجہاں کی اطاعت قبول کی تھی تو کئی محلات ایسے عطا کیے گئے تھے جو فتح خان کی ذاتی ملکیت میں تھے۔ لیکن جب آخر الذکر نے اطاعت قبول کی تو اس کو وہ جائداد پھر دے دی گئی[41] اس نئے انتظام سے شاہ جی آزردہ ہوا۔ اب وہ مغلوں اور فتح خان دونوں سے خفا تھا۔ فتح خان کی عوامی نامقبولیت کا فائدہ اٹھا کر اس نے عادل شاہ کے ایک بااثر وزیر مراری پنڈت سے بات چیت شروع کی اسی پنڈت کی وساطت سے محمود عادل شاہ کو آمادہ کیا کہ وہ دولت آباد کی فتح کے لیے ایک بڑی فوج بھیج دے۔ شاہ جی اور عادل شاہیوں کی متحدہ کوشش اور اپنے افسروں کی ناآسودگی نے فتح خان کو چونکا دیا۔ اُس نے مہابت خان سے درخواست کی کہ وہ اس کو اور دولت آباد کو دشمنوں کے پنجہ سے بچائے۔ مہابت خان نے فوراً لبیک کہا اپنے لڑکے خان زمان کو فتح خان کی امداد کے لیے بھیج دیا۔

شاہی فوج کا آگے بڑھنا اور ان کے روکنے کی کوشش کی ناکامی سے متاثر ہو کر عادل شاہی سپہ سالار ندولا خان نے فتح خان سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔

اس نے وعدہ کیا کہ وہ تین لاکھ ہن اس کو دے گا اور قلعہ کو رسد سے بھر دے گا بشرطیکہ فتح خان اپنی وفاداری کا رُخ بدل دے۔ رندولا خان نے فتح خان پر یہ بات اور واضح کر دی کہ مغل بادشاہ اس کی امداد کی بہ نسبت قلعہ پر قبضہ کرنے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ فتح خان اس کی باتوں میں آگیا اور شاہی فوج سے ناتا توڑ لیا۔ جب اس فریب کاری کی اطلاع مہابت خان کو پہنچی تو اس نے خان زماں کو حکم دیا کہ رندولا خان اور فتح خان کا رابطہ منقطع کر دے اور دشمن جو نظام پور میں پڑا ہے۔ اسے مار بھگائے ساتھ ہی ساتھ دولت آباد کا محاصرہ بھی شروع کر دے۔

اس اثنا میں مہابت خان نے وسیع پیانے پر اپنے لڑکے کی امداد کی۔ بالا گھاٹ میں اپنے پیش روافسروں کی ناکامی سے سبق لیتے ہوئے مہابت خان نے پہلا کام یہ کیا کہ غلہ کی رسد پہنچانے کا مکمل انتظام کیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے شمالی ہند کے بنجاروں کو ہموار کیا۔ ان کو ہاتھی گھوڑے اور اعزازی خلعت بخشے۔ ان کی امداد سے اس نے آگرہ اور گجرات سے رسد بھیجنے کا ایسا سلسلہ قائم کیا جو ہر خطرہ سے پاک تھا اس وقت آگرہ اور گجرات غلہ کی برآمد کے دو خاص مرکز تھے۔

انتظامات کی تکمیل سے مطمئن ہونے پر مہابت خان برہان پور سے چلا اور یکم مارچ 1632ء کو دولت آباد پہنچا۔ قلعہ کا محاصرہ اب پُر زور طریقے پر کیا گیا۔ مختلف فوجی محاذ پر توپیں لگائیں گئیں۔ خوفزدہ ہو کر فتح خان نے حسین نظام شاہ کو کالا کوٹ بھیج دیا خود مہاکوٹ میں رہ گیا۔ عنبر کوٹ دولت آباد کے دوسرے قلعہ جات کو اس نے مستحکم کیا۔ اپنے دکنی افسروں کی مکاری اور رندولا خان شاہ جی کی شر پسند حرکتوں سے نڈر ہو کر مہابت خان نے عنبر کوٹ کو گھیر لیا اور فتح بھی کر لیا۔ بعد ازاں وہ مہاکوٹ کی طرف بڑھا۔

باوجود شاہی فوجوں کے ہاتھ سے متعدد شرمناک شکست پانے کے رندولا خان اور شاہ جی نے ایک بار اور تہیہ کیا کہ محصور فوج کو غلہ پہنچا دیں کیونکہ وہ فاقہ کر رہی تھی۔ مردار جانوروں کی ابلی ہوئی کھال اب ان کی واحد غذا تھی۔ اس لیے

غلہ کے تین ہزار بورے ان کو کرناٹک کے بندوقچیوں کی حفاظت میں بھیجا گیا۔ مہابت خان نے ناصری خان کو حکم دیا کہ غلہ کے محافظ دستے پر حملہ کر دے اور رسد پر قبضہ کر لے۔ محافظ بندوقچی بغیر لڑے ہوئے بھاگ گئے اور شاہی فوج سامان لے کر اپنی قیام گاہ پر آ گئی۔

ان حالات میں مراری پنڈت بیجاپور سے تازہ دم فوج لے کر آ گیا۔ اس کی آمد سے رندولا خان کی ہمت بڑھ گئی۔ چنانچہ کھڑکی اور دولت آباد کے درمیان اس کی نقل و حرکت تیز ہو گئی۔ اس نے کوشش کی کہ مغلیہ فوج کو چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تب ان ٹکڑوں کو شکست دی جائے۔ مگر مہابت خان کی چوکسی نے مغلیہ فوج کو رندولا خان کے پھندے سے بچا لیا۔ اسی درمیان میں مہاکوٹ کے قلعہ میں ایک سرنگ مکمل ہو گئی۔ مہابت خان نے فیصلہ کیا کہ اس میں آگ لگا دی جائے۔ فتح خان پریشان ہو گیا۔ اس نے مہابت خان سے وقفہ کی درخواست کی لیکن جواب میں مہابت خان نے کہلا بھیجا کہ بطور یرغمال نیک چلنی کے ثبوت میں اپنے لڑکے کو بھیج دو۔ جب فتح خان اس مطالبہ کو پورا کرنے میں دفع الوقتی سے کام لینے لگا تو مہابت خان نے حکم دے دیا کہ سرنگ میں آگ لگا دی جائے۔ دھماکہ سے ایک برج اور پندرہ گز قلعہ مسمار ہو گیا۔ شاہی فوج نے اس شگاف سے حملہ کر کے مہاکوٹ کا قلعہ قبضے میں کر لیا۔

مہاکوٹ کی تسخیر اور محافظ دستہ کی مصیبتوں سے مراری کا نہ بچا سکنا فتح خان کو بے انتہا مایوس کن ہوا۔ وبائی بیماری کی ہنگامہ خیزی نے مزاحمت کا سوال باقی نہ رکھا۔ فتح خان نے اپنے لڑکے عبدالرسول کو اپنی طرف سے مہابت خان کے پاس اپنی موجودہ عیارانہ چال چلن کی معافی کے لیے بھیجا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ درخواست بھی کی کہ قلعہ خالی کرنے کے لیے اسے ایک ہفتہ کی مہلت دی جائے۔ مہابت خان نے اس کی درخواستیں منظور کر لیں بلکہ پندرہ لاکھ روپیہ بھی فتح خان کو دیا کہ قلعہ سے جانے میں اس کے اخراجات کی مدد ہو جائے۔ اس کے

علاوہ اس نے فتح خان کے استعمال کے لیے ہاتھی اونٹ اور دوسرے بار برداری کے سامان بھی دیے۔ منظور شدہ معاہدہ کے لحاظ سے فتح خان نے ایک ہفتہ کے بعد قلعہ خالی کر دیا اور شاہی فوج نے 17/جون 1633ء میں اپنا قبضہ جمالیا۔[43]

دولت آباد کو ناصری خان، سید مرتضٰی وغیرہ کے سپرد کر کے مہابت خان ظفر نگر چلا گیا۔ راستے میں عادل شاہی اُس کے میمنہ یا میسرہ پر منڈلاتے اور پریشان کرتے رہے۔ جب وہ ظفر نگر کے قریب پہنچا تو مراری پنڈت کا فرستادہ فرہاد خان اس کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ صلح کی بات چیت کر لے لیکن اس نے بغیر گفتگو کے قاصد کو واپس کر دیا۔[44] ظفر نگر میں اس نے اپنے سپاہیوں کو آرام کرنے کی اجازت دی۔ اس درمیان میں دشمنوں نے دولت آباد واپس لینے کی جان پر کھیل جانے والی آخری کوشش کی۔ انہوں نے سوچا کہ ناصری خان اور اس کے سپاہی تھک گئے ہیں اور دفاعی تعمیرات بے مرمت پڑی ہیں اس لیے قلعہ بآسانی ان کے حملوں سے زیر ہو جائے گا۔ لیکن ناصری خان اس موقعہ پر بھی مردِ میدان ثابت ہوا۔ قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں پر حملے کرتا رہا۔ ان کو شدید نقصانات پہنچائے۔ مہابت خان بھی ظفر نگر سے آگے بڑھا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔[45]

مہابت خان کی بااثر کارکردگی

دولت آبادِ کی مہم اور اس کی تسخیر احمد نگر کے الحاق کی دوری منزل کی نشاندہی کرتی ہے۔ حملے سست رفتار تھے کبھی کبھی مغلیہ فوج کے دکھنی ملازموں کی فریب کاری بھی پیچیدگی پیدا کر دیتی۔ لیکن مہابت خان کی زبردست مستقل مزاجی اور سوجھ بوجھ بڑے کام آئی۔ بڑی سے بڑی دقتوں پر وہ غالب آیا نا موافق حالات میں بھی کامیابی حاصل کرتا رہا اس موقعہ پر اس کی غیر معمولی فوجی فراست انتہائی نقطۂ عروج پر نمایاں ہوئی۔ بڑی مستعدی و ہوشیاری سے اس نے خطرناک مواقع کا پتہ لگایا۔ اپنے کو مضبوط کر کے دشمنوں کے منصوبے بیکار

کر دیے۔ بعض اوقات اس کو بے شمار ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن حالات کو کبھی بے قابو نہ ہونے دیا۔ مراری، اور رندولا خان اور شاہ جی نے ہر ایسی کوشش کی جو دباؤ سے اس کے مقصد کو ختم کرنے کے لیے وہ کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر پورے استقلال سے قائم رہا، جو فتح اس کو حاصل ہوئی اس لحاظ سے عدیم المثال ہے کہ اس کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس سے پیشتر کبھی کسی مغلیہ سپہ سالار نے ایسی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظاہرہ دکن میں نہ کیا تھا۔

دولت آباد کی تسخیر کی خبر ایک ہفتہ میں شاہجہاں کو مل گئی۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ مہابت خان کے لیے اس نے خلعت اعزاز ایک مرصع تلوار دو گھوڑے جس میں ایک کا ساز و سامان نقرئی اور دوسرے کا طلائی۔ ایک نر ہاتھی جس کی ہودج کا کنارہ مخملی اور ایک مادہ ہاتھی بھیجے، ایک اعزازی خلعت ایک گھوڑا اور ایک ہاتھی خان زماں کو عنایت کیے گئے۔ ناصری خان کو خان دوراں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ دوسرے افسروں کو بھی انعام و اعزاز حسب قابلیت عطا ہوئے۔

فتح خان کی سابقہ فریب کاریوں نے مہابت خان کو مشکوک کر دیا تھا۔ برہان پور پہنچ کر اُس نے اسے حراست میں لے لیا۔ شاہجہاں نے مہابت خان کو حکم دیا کہ قیدی اسلام خان کی سرکردگی میں یہاں بھیج دیا جائے۔ آخر الذکر گجرات سے شمال جا رہا تھا۔ فتح خان اور حسین نظام شاہ 21/ ستمبر 1633ء کو آگرہ پہنچے آخر الذکر سید خان جہاں کے سپرد کیا گیا گوالیار کے قلعہ میں اُسے قید کیا جائے یہاں (بہادر نامی اسی خاندان کا ایک دوسرا شخص بھی تھا) جو احمد نگر کی فتح کے وقت قید کیا گیا تھا اور اب یہاں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا فتح خان کے جرائم نظر انداز کیے گئے اس کو جاگیریں واپس کر دی گئیں۔ دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کے گزارے کے لیے مقرر کیے گئے۔[96]

اگرچہ دولت آباد پر قبضہ ایک اشاریہ فتح تھی۔ لیکن پھر بھی تسخیر احمد نگر کی

آخری منزل نہ ثابت ہوئی نئے مفتوحہ علاقہ میں سکون وامن قائم ہوا، بلکہ برخلاف اس کے فوجی قبضہ کی وجہ سے بہت سی برائیاں ملک میں پیدا ہوئیں۔ علاوہ بریں ایسے علاقے ہر وقت موجود اور چکر میں ڈالنے والے دشمن کے ہاتھوں میں تھے مغربی اضلاع خاص کر جنار، پونا، چاکن اور "کون کن" مغل اقتدار سے باہر تھے۔ اس علاقہ میں مرہٹہ کی مستقبل حکومت کے بیج بوئے جارہے تھے جنوب میں اوگیر اور آوسا اُن نظام شاہی حکام کے قبضے میں تھے، جو نئے آنے والوں کے سپرد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انتشار کا مرکز پارندا تھا جو کبھی نظام شاہ کی ملکیت تھا لیکن اب عادل[47] شاہی حکام کے قبضے میں تھا۔

شاہ جی کی نقل وحرکت

مہابت خان نے ایک اور فیصلہ کن کوشش اس کے فتح کرنے کی کی لیکن وہ ناکام ہوا اور شکستہ دل ہو کر مر گیا۔ شاہ جی نے اپنی نقل وحرکت نظام شاہی خاندان کی تجدید کے لیے پھر شروع کی۔ اس سلسلے میں اُس کو نمایاں فائدہ یہ تھا کہ شاہی فوج کمزور تھی۔ شاہزادہ شجاع پہلے ہی جاچکا تھا۔ خان دوراں بھی مالوہ واپس ہو گیا تھا۔ اب مشکل ہی سے کوئی ایسا لائق رہنما رہ گیا تھا جو دکنیوں کی روک تھام یا ان کو مرعوب کر سکے۔ مرتضٰی[48] خان دولت آباد کا ناظم تھا اور اللہ وردی[49] خاں پیانی گھاٹ کا، اگرچہ یہ دونوں اپنی ذاتی بہادری کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایک سپہ سالار کی خصوصیات کی شہرت نہ رکھتا تھا وہ ہمیشہ ماتحتوں کی حیثیت سے کام کرتے رہے کبھی آزاد سپہ سالار نہ تھے۔ برخلاف اس کے شاہ جی یقیناً زیادہ سوجھ بوجھ کا آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمت میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کم رہا ہو۔ علاوہ بریں وہ دکھنی تھا اپنے اہل وطن کی ہمدردی نسبتاً زیادہ کامیابی سے حاصل کر سکتا تھا۔ مغل ان لوگوں کے لیے اجنبی اور ناخواندہ مہمان تھے۔

شاہ جی کا اصل مقصد دولت آباد واپس لینا تھا اس نے ہمسایہ محلوں پر قبضہ کیا

اور اپنے نام و نہاد حکمراں نظام شاہ کی طرف سے مال گزاری وصول کرنے لگا۔ مرتضٰی خان اس حالت میں نہ تھا کہ قلعہ کی محافظت کر سکے یا دشمن کو بھگا سکے لیکن جیسے ہی خان دوراں نے دکن کی خطرناک حالت کی خبر پائی فوراً برہان پور کے لیے چل پڑا۔ مادھو سنگھ اور میر فتح اللہ کو اس شہر کا انتظام سپرد کر کے وہ تیزی سے دولت آباد 27/ جنوری 1635ء کو پہنچا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ دشمن پسپا ہو کر رام دود پہنچ گیا ہے اس لیے وہ یہاں ایک دن آرام کرنے کے لیے رُک گیا۔

دوسرے دن بادشاہ جی کے آدمیوں کے تعاقب میں نکلا۔ اُن کو شیوگاؤں میں پالیا لیکن وہ لوگ منتشر ہو کر بھاگ گئے۔ خان دوران نے ان لوگوں کا بُری طرح پیچھا کیا ان کی قیام گاہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے وہ پتھری گیا اور وہاں سے احمد نگر قلعہ کو اس نے غلہ اور چارہ سے بھر دیا اس کے بعد ہی اسے اطلاع ملی کہ خاں زماں بالا گھاٹ پہنچ گیا اور دولت آباد کی طرف بڑھ رہا ہے جب اس کو پیانی گھاٹ کی نظامت کی تقرری ملی تو وہ احمد نگر چھوڑ کر برہان پور چلا گیا۔

بایں ہمہ شاہ جی کے وسائل ہنوز ختم نہ ہوئے تھے۔ اب بھی وہ مغل علاقوں پر ہمیشہ کی طرح بے باکی کے ساتھ غارت گری کر رہا تھا لیکن یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس کی اس کارگزاری میں عادل شاہ اس کا یار و مددگار تھا۔ علاوہ بریں جھجار سنگھ کی بغاوت اور شاہی فوجوں کا بندیل کھنڈ جانا شاہ جی کے لیے مفید طلب ثابت ہوا۔ عصری مورخ اس کی نقل و حرکت کی تفصیلات نہیں بیان کرتے صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ اس نے بہت زیادہ تکلیف پہنچائی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کو توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ مجبور ہو کر دکن آیا ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال نازک تھی اور خان زماں کے بس میں اس کا علاج نہ تھا۔

شاہجہاں دوسری بار دکن آتا ہے

شاہجہاں 21/ ستمبر 1635ء کو آگرہ سے روانہ ہوا۔ اس کے پیش نظر دو

باتیں تھیں ایک تو یہ کہ اس کے وہ افسر جو بندیل کھنڈ میں مہم سر کرنے گئے تھے ان میں اتحاد عمل پیدا کرانا اور دوسرے یہ کہ دولت آباد پہنچ کر احمد نگر کی تسخیر مکمل کرانا۔ دریائے نربدا کے کنارے ایک مقام ہنڈیا سے اس نے اپنے قاصد عادل شاہ اور قطب شاہ کے پاس روانہ کیے، کہ اگر اس کے مفتوحہ علاقوں میں امن قائم کرتے وقت انہوں نے ساتھ نہ دیا یا مزاحمت کی کوشش کی تو انجام بڑا بھیانک ہوگا۔ دریائے نربدا اس نے 4/ جنوری 1636ء میں پار کیا۔ برہان پور کے قریب اللہ وردی نے اس کا استقبال کیا۔ اپنی شمسی سالگرہ شہر کے باہر منانے کے بعد شاہجہاں دولت آباد روانہ ہوا۔ جب وہ اس شہر کے قریب پہنچا تو خان زماں استقبال کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے چند دکنی افسروں کو حضور شاہ پیش کیا۔ ان میں مبازر خان راد ستر سال، پرتھوی راج راٹھور، راد ہاتھی سنگھ، مالوجی بھونسلا، پرسوجی اور دانش خان حبشی قابل ذکر ہیں۔

اس کے منصوبے

دولت آباد پہنچ کر شاہجہاں نے آخری بار اپنے دار و گیر کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔ ناگہانی صورتوں کے پیش نظر اس نے اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کی۔ بارہ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج خان دوران اور راجا جے سنگھ کی قیادت میں کندہار اور نان ویر روانہ کی، تاکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے متحدہ سرحدوں پر نظر رکھے۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا کے مخدوش مقامات سے امداد طلب ہونے پر کمک کے لیے تیار رہیں اور آوگیر اور راؤسا کو فتح کریں دوسری فوج خان زماں کی قیادت میں احمد نگر اس لیے بھیجی گئی کہ شاہ جی کے محلات جو چمار کنڈہ اور استھائی میں ہیں ان پر قبضہ کیا جائے۔ کون کان کو مطیع کیا جائے اور عادل شاہی سلطنت پر حملہ کرنے کے لیے مزید احکام کا انتظار کرے۔ تیسرا لشکر شائستہ خان کی قیادت میں جنار فتح کرنے کے لیے بھیجا یہ مقام شاہ جی کے اقتدار کا مرکز تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرض اس کے سپرد کیا کہ سنگم نیر، ناسک اور ترمیک پر قبضہ کرلے[51]

شاہ جی بے دخل کر دیا گیا

دو ہزار فوج اللہ وردی کو دے کر شائستہ خان نے اُسے شمال کی طرف روانہ کیا، تا کہ وہ اس علاقہ کے قلعے مسمار کر دے۔ اللہ وردی خان نے چاند دور پر قبضہ کر لیا اور ایک با اثر مرہٹہ سردار ہیمبر راؤ کو ملا لیا۔ اس کو دو ہزار ذات ایک ہزار سوار اور پچاس ہزار روپے دیئے گئے۔ اس کی امداد سے اللہ وردی خان نے کئی ایک قلعہ کے محافظ دستوں کو ملا کر ان سب پر قبضہ کر لیا۔ ان ہی بعض قلعوں میں نظام شاہی خاندان کے لوگ قیام پذیر تھے جب اللہ وردی خان وہاں پہنچا تو انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفتار کر لیے گئے۔[55]

اسی درمیان میں شائستہ خان نے شاہ جی کے آدمیوں کو سنگم نیر، سے مار بھگایا اور وہاں کے باشندوں کو کاشتکاری کی طرف متوجہ کر کے امن کا وعدہ لیا۔ ان اضلاع میں سکون و چین قائم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کے بعد کی۔ جنّار کی طرف بڑھا۔ باقر خان کو بھیجا کہ شاہ جی کی فوج سے یہ علاقہ واپس لے لے۔ جنّار پر دباؤ کم کرنے کے لیے دشمن نے باقر خان کو کون کان کی طرف متوجہ کر لیا۔ لیکن اس طریقہ کار سے قلعہ کی محافظت خطرہ میں پڑ گئی۔ شائستہ خان احمد نگر میں تھا۔ جس وقت ان باتوں کی خبر اسے ہوئی اس نے پانچ سو فوج کا ایک دستہ الگ کر کے جنّار پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ نقل و حرکت کامیاب ہوئی۔ شاہی فوج نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد ہی باقر خان کی نظر بچا کر دشمن جنّار کے سامنے نظر آئے اور انہوں نے کوشش کی کہ اپنے آقا شاہ جی کے خاندان کو آزاد کرا دیں۔ شاہی فوج پر دباؤ پڑا لیکن شائستہ خان کی بروقت آمد نے صورت حال بدل دی۔ اس طرح احمد نگر کے مغربی اضلاع میں مغلوں کا اقتدار کافی بڑھ گیا لیکن خطرہ سے خالی نہ تھا۔

شاہجہاں کی واپسی، اورنگ زیب کی نیابت سلطانی

شاہ عادل کی اطاعت حاصل کرنے کے بعد شہزادہ اورنگ زیب[57] کو دکن کا نائب سلطان بنا کر شاہ جہاں دولت آباد سے چلا آیا۔ شہزادہ کی توجہ کے لیے بہت سی باتیں تھیں شاہ جی اب بھی آزاد تھا۔ ادگیر اور اوسا کے قلعے اب تک دشمن کے ہاتھ میں تھے۔ بیجاپور سے صلح ہو جانے کے بعد خان دوراں نے صلح و آشتی کے ساتھ ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب یہ اسکیم ناکامیاب ہوئی تو اوگیر کی طرف وہ 17/ اگست 1636ء کو بڑھا۔ قلعہ کے نیچے اس نے سرنگ بچھا دی ایک میں آگ بھی لگائی لیکن جو شگاف پیدا ہوا وہ کام کا نہ تھا۔ اس نے دوسری سرنگوں کو آگ نہ دی اس لیے کہ ڈر تھا کہ مبادا عام چڑھائی اس سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے پوتے کو صدمہ پہنچے کیونکہ وہ ہنوز قلعہ میں تھا اس لیے اس نے محافظ دستہ سے ایک نمائندے کو بلایا اور جنگ کی ساری تیاریوں کا اسے معائنہ کرادیا۔ جب یہ نمائندہ واپس ہو کر سپہ سالار کے پاس پہنچا اور خطرے کی نزاکت کا حال بتایا تو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہی طریقہ کار اوسا میں بھی اختیار کیا گیا، وہاں کے کمانڈر بھوج کو مایوسی ہوئی اس نے بھی قلعہ[58] سپرد کر دیا۔

شاہ جی کا گھیراؤ

شاہ جی کے محاصرہ کے لیے اورنگ زیب نے خان زماں کو بھیجا۔ مغلوں سے جنار، چاکن اور پونا لے کر شاہ جی اپنے وطن میں ہمیشہ سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ خان زماں نے جنار پر دھاوا کیا قلعہ کے محاصرہ کے لیے ایک دستہ چھوڑ کر شاہ جی کو پونا سے اکھاڑنے کے لیے خود روانہ ہوا۔ عادل شاہ نے زندولان کو حکم دیا کہ وہ خان زماں کے ساتھ تعاون کرے۔ شمال و جنوب دونوں طرف سے حملے ہوتے ہوئے دیکھ کر شاہ جی ہوشیاری سے شادری پہاڑیوں میں داخل ہو کر کون کن پہنچ گیا۔ یہاں اس نے راستے کی الٹ پھیر کی جن راستوں سے گیا تھا۔ ان ہی سے واپس آیا اور دیش پہنچا۔ ہنوز ان کا پیچھا کرنے والے شادری کے مغرب تلاش کر

رہے تھے۔ بالآخر خان زمان اس راستے کی کھوج لگانے میں کامیاب ہوا اور شاہ جی کا پیچھا ہر جگہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ جی نے ماہولی میں پناہ لی۔

ماہولی کے قلعہ کا محاصرہ مغل اور عادل شاہی فوجوں نے متحد ہو کر کیا۔ محافظ دستہ صرف دو سو آدمیوں کا تھا۔ حملہ روکنا بعید از قیاس تھا۔ پھر بھی شاہ جی نے کوشش کی کہ دھوکہ دھڑی سے کام نکل جائے جب ناکامیاب ہوا تو صلح کی درخواست کی۔ اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ نام نہاد نظام شاہ کو سپرد کر دے۔ احمد نگر کے چھ قلعے جواب تک بھی اس کے ہاتھ میں ہیں ان سے دستبردار ہو جائے اس نے یہ شرطیں مان لیں اس کو اجازت دی گئی کہ وہ عادل شاہ کی ملازمت کرے۔ عادل شاہ نے اس کو پونا اور موپا بطور جاگیر[59] عطا کیے۔

اس طرح چالیس برس کی لڑائی جھگڑے کے بعد دکن میں بالآخر تسلط قائم ہوا۔ شہنشاہ کا اقتدار شک و شبہ سے بالاتر ہوا۔ اس کی سرحدیں مقرر کی گئیں اور دکنی سلطنتوں پر اس کی برتری باقاعدہ قائم ہو گئی[60]۔ اگرچہ اورنگ زیب کی ہشت سالہ نائب سلطانی میں کوئی تعمیری کام نہیں ہوا لیکن مجموعی حیثیت سے ملک میں امن چین قائم رہا۔ دو معرکہ آرائیاں ضرور ہوئیں ایک تو خان دوراں کی قیادت میں گونڈ راجاؤں سے خراج وصول کرنے کے لیے اور دوسری مالوجی اور محمد طاہر خراسانی کی سربراہی میں باگلانا کو زیر کرنے کے لیے، لیکن ان مہموں سے اندرونی امن و چین میں کوئی فرق نہ آیا۔ اپنی مدت نیابت سلطانی میں اورنگ زیب دوبارہ آگرہ گیا۔ ایک مرتبہ 1637ء میں دل رس بانو بیگم سے شادی کرنے اور دوسری مرتبہ اپنی بہن جہاں آرا کی عیادت کے لیے جب وہ 1644ء میں بری طرح جل گئی تھی۔

دکن میں اصلاحات

جب اورنگ زیب دوسری بار دکن کا ناظم ہوا تو اس وقت مفید یا کار آمد اصطلاحات عمل میں آئیں۔ یہاں کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نائب سلطانوں

کا تیزی سے رد بدل اور ان میں سے بعض کے جارحانہ استحصال بالجبر رویہ سے زائد مطالبہ وصول کرنے نے ریاست کا حال تباہ کر دیا۔ زراعت کو کوئی ترقی نہیں دی گئی کاشتکاروں کی تعداد اور ذرائع میں کافی کمی ہوئی مال گذاری بھی کم ہوئی۔ شہزادے کے دیوان مرشد قلی خان نے ان خرابیوں کا علاج بڑی خوبی سے کیا اس نے دل و جان سے اس کام کو ترقی دینے میں حصہ لیا۔

اس نے ٹوڈر مل کے طریقہ کار دکن میں بھی رائج کیے۔ اس سلسلے میں اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ وہ ایران بستیاں پھر سے آباد کرے اور لوگوں کو امن و سکون سے زندگی بسر کرنے کا موقع دے۔ ہر جگہ ہوشیار امین اور ایماندار زمین ناپنے والے بھیجے گئے تا کہ وہ لوگ کھاتہ، کھتونی تیار کریں۔ قابل کاشت اور بنجر زمین کا فرق کریں۔ پانی کے راستوں کا بھی اندراج کریں۔ جہاں کہیں گاؤں کا مکھیا نہ رہ گیا تھا وہاں اس نے ان نئے لوگوں کو یہ منصب دیا جو اپنے کردار سے زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی ہمدردی کے خواہاں تھے غریب رعایا کو شاہی خزانہ سے اس لیے قرض دیا گیا کہ وہ مویشی، بیج اور دوسرے آلات زراعت خرید سکے۔ یہ تقاوی آیندہ موسم بہار میں قسط وار وصول کی جاتی[62]۔ اس طرح نیا صوبہ ترقی کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ کے الحاق کا ذریعہ بن گیا۔

باب 7

بیجاپور اور گولکنڈا

اکبر کے تعلقات عادل شاہ سے

بہمنی سلطنت کے انتشار کے بعد جتنی حکومتیں وجود میں آئیں ان میں سب سے زیادہ پائیدار بیجاپور کی حکومت تھی۔ اس کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ قریب قریب اسی زمانے میں اس کا بھی وجود ہوا جب احمد نگر کی سلطنت ظہور میں آئی۔ اور دو سو سال تک چلتی رہی۔ مغلوں سے اس کو واسطہ تیسرے حکمران علی عادل شاہ کے زمانے میں ہوا۔ ابو الفضل کا بیان ہے کہ خواجہ عبداللہ کی واپسی 1579ء میں ہوئی اور لکھتا ہے کہ اگرچہ عادل شاہ احکام کی پابندی پوری طرح نہ کرتا تھا لیکن دکن کے دوسرے حکمرانوں کی طرح وہ ہوشیار آدمی اور منتخب تحفے بھیجا کرتا تھا۔ اعلیٰ حضرت شہنشاہ نے خواجہ عبداللہ کے ہمراہ حکیم گیلانی کو بھی مخصوص صلاح کار کی حیثیت سے بھیجا۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر وہ ان لوگوں کی باتیں گوش دل سے نہ سنے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی علی عادل شاہ نے حکیم گیلانی کا خیر مقدم کیا اس کو بڑے تزک و اعزاز کے ساتھ بیجاپور لے گیا۔ حکیم کے بعد مغلیہ سلطنت کے دوسرے ایلچی عین

الملک شیرازی کا بھی ایسا ہی استقبال ہوا۔ حکیم علی کو مناسب تحفے دے کر واپس کر دیا گیا لیکن اس کا ہم منصب ہنوز بیجاپور ہی میں تھا کہ 1581ء میں عادل شاہ قتل کر دیا گیا۔

دانیال کی شادی ابراہیم ثانی کی لڑکی سے

اس کی جگہ ابراہیم عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا اس کے سینتالیس سالہ عہد حکومت میں مغلیہ سلطنت اور بیجاپور کی حکومت میں قریب تر رابطے قائم ہوئے کیونکہ مغلوں کی سلطنت کی حدیں زیادہ پھیل گئی تھیں۔ 1600ء میں اکبر نے سرمدی[3] کو ابراہیم ثانی کے دربار میں بھیجا اور تین سال بعد شہزادہ دانیال کی شادی عادل شاہ کی لڑکی سے کی۔ لیکن باوجود مغلیہ شہنشاہ سے دوستی کے اقرار کے ابراہیم ثانی نے ملک عنبر کو پناہ دینے میں تکلف نہ کیا۔ از روئے انصاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیم ثانی نے ابی سینائی خطر پسند کی امداد و ہمت افزائی محض اس لیے کی کہ نظام شاہی خاندان بر قرار ہے یقیناً اس کا یہ رویہ سیاسی اقدام کا نتیجہ فکر تھا۔

جہانگیر اور ابراہیم ثانی

جہانگیر کے عہد میں مغلیہ اور ابراہیم ثانی کے سیاسی تعلقات متلون تھے۔ ابتدائی دور میں آخر الذکر ملک عنبر سے ہمیشہ متحد رہا اس لیے کہ شاہی اقدام کی روک تھام ہوتی رہے۔ اس لیے شاہجہاں پہلی بار دکن میں آیا تو اس نے سب سے پہلے دکھنی جتھاؤں کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے ملک عنبر کو سب سے الگ کر کے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد ہی پھر وہی صورت حال پیدا ہو گئی اور اس کو پیچیدہ حالات درست کرنے کی فکر ہوئی۔

ملک عنبر کے عروج اور حکومت احمد نگر کی تجدید نے اگرچہ مزاحمت کی فوری اقدام سے احمد نگر کو بچا لیا لیکن پھر بھی ان دونوں حکومتوں میں پر سکون

تعلقات پیدا کرنے میں معاون نہ ہوا۔ جب شاہجہاں نے اپنے باپ سے بغاوت کی اور مہابت خان اور شہزادہ پرویز اس کے تعاقب میں دکن پہنچے تو اس وقت بھی بیجا پور اور احمد نگر آپس میں لڑ رہے تھے اور دونوں مغلیہ حکومت سے مصالحت کی فکر میں تھے۔ ملک عنبر سے بے اعتمادی نے مہابت خان کو ابراہیم ثانی سے دوستانہ رویہ کی طرف مائل کیا۔ ابراہیم ثانی نے مغلوں[6] سے جنگی و دفاعی معاہدہ کر لیا۔

اس کے بعد ہی شاہجہاں کی نقل و حرکت بنگال و بہار میں تیز ہوئی اور مہابت خان و شہزادہ پرویز کو حکم ہوا کہ باغی کی سرکوبی کے لیے وہ شمال واپس آئیں۔ ملک عنبر کو پھر موقع مل گیا۔ اس نے عادل شاہی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ملک میں داخل ہوا۔ بدار کو تباہ کرتا ہوا تیزی سے بیجا پور کی طرف کوچ کیا۔ نورس پور میں لوٹ مار مچادی اور قلعہ کا محاصرہ کر دیا۔ لیکن جب اس کا تعاقب ہوا تو وہ پلٹ پڑا۔ اس نے لاری کو شکست دی اور مار ڈالا۔ بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ شعلہ پور پر دھاوا بول دیا۔ اس اثناء میں شہزادہ پرویز اور مہابت خاں پھر دکن واپس آگئے اس لیے ملک عنبر بیجاپور چلا گیا۔ جنار کے قیام میں شاہجہاں نے ابراہیم ثانی سے دوستانہ مراسلات قائم رکھے۔ ابراہیم ثانی اس کو گاہے ماہے روپیہ سامان اور خاص تحائف بھیجتا رہا۔ اس کا انتقال بتاریخ 12 ر ستمبر بروز چہار شنبہ 1627ء میں ہوا۔

ابراہیم ثانی کا انتقال اور محمد کی تخت نشینی

اس کے انتقال کے بعد عمائدین سلطنت نے جانشینی کے مسئلے پر صلاح و مشورہ کیا بالآخر مادر شاہ کے اتفاق رائے سے بڑے صاحبزادے محمد عادل شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا مبارک باد کے پیامات حکمرانوں نے بھی بھیجے۔ چنانچہ شاہجہاں نے بھی افضل خان کو اور محمد قطب شاہ نے شیخ محمد طاہر کو مبارک باد پیش کرنے کے لیے بھیجا۔ مرتضیٰ ثانی نے کوئی سفیر نہ بھیجا۔ اس کی خاموشی شگون بد ثابت ہوئی۔ جب اس نے مہر خاموشی توڑی تو معلوم ہوا کہ وہ شہزادہ درویش محمد

عادل شاہی تخت کے لیے مد مقابل بنانا چاہتا ہے۔ اس نے ایک بڑا لشکر لے کر بیجا پور پر حملہ کر دیا۔ عادل شاہی فوج کو جو اخلاص خان کی قیادت میں مقابلہ کر رہی تھی شکست فاش ہوئی۔

عادل شاہ و مرتضیٰ ثانی میں شاہجہاں کی مصالحت کی کوشش

جب شاہجہاں نے دو بادشاہوں کے لڑنے کی خبر سنی تو اس نے شیخ معین الدین کو آپس میں صلح کرانے کے لیے روانہ کیا۔ دونوں سلطنتوں کے نمائندے بیجاپور میں مصطفیٰ خان کے مکان پر ملے۔ لیکن یہ اجتماع شعلہ پور کے مسئلے پر ختم ہو گیا۔ ہر دو حریف سے کوئی دوسرے کے ہاتھ میں شعلہ پور نہیں دینا چاہتا تھا۔ عادل شاہی نمائندے ابوالفتح بد مزاج آدمی تھا خفا ہو کر پنچایت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پنچایت ختم ہو گئی۔ اس طرح شیخ معین الدین کا مقصد ناکامیاب ہوا۔ احمد نگر اور بیجاپور کے اختلافات اپنی جگہ پر رہے۔ لیکن شاہی سفیر کا عادل شاہ نے اچھا خاصا استقبال کیا[13]۔ اس نے شہنشاہ کے لیے قیمتی تحفے بھیجے۔

مصطفیٰ خان مغلوں کا حمایتی

اس درمیان میں خان جہاں کی بغاوت کے سلسلہ میں شاہجہاں دکن آیا۔ اس نے بڑے پیمانے پر احمد نگر میں اپنی مہم کا آغاز کیا۔ بیجاپور میں دو طاقتور رہنما اس بات میں مختلف الرّائے تھے کہ کہ مغلوں کی مدد کی جائے، یا نہیں۔ مصطفیٰ خان موافق تھا اس لیے وہ نظام شاہ کا سخت دشمن تھا کیونکہ اس کا خسر محمد لاری ملک عنبر کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اس لیے اس نے مغلوں کے اتحاد سے احمد نگر کا وجود ختم کرنے کی وکالت کی۔ لیکن رندولا خان اور بعض دوسرے سربلند امراء نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ ان لوگوں نے عادل شاہ کو بھی مصطفیٰ خان کی رائے سے متفق ہونے کے لیے منع کیا۔ لیکن سردست آخر الذکر اپنے مخالفین کی رائے پر غالب رہا۔ بادشاہ نے رندولا خان کو سرحد پر کوچ کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ شاہی فوج اگر امداد طلب کرے تو وہ مدد کے لیے تیار ہے[14]۔

رندولا خان اور اعظم خان میں گفت و شنید

جب اعظم خان نے دھارور فتح کر لیا تو رندولا خان اور اس کے باپ فرہاد خان نے اعظم خان سے ان علاقوں کی تحلیل کے منصوبہ کے متعلق باتیں کرنی چاہیں، جو شہنشاہ نے عادل شاہ کو دیے تھے۔ ان لوگوں کے عہد و پیان کی آزمائش کرنے کے لیے اعظم خان نے نظام شاہیوں کے تعاقب میں امداد کی فرمائش کی۔ چند روز دھارور میں ان کی امداد کے انتظار میں وہ رکا رہا۔ ان لوگوں کے شکوک رفع کرنے کے لیے اعظم خان نے اس کی بھی اجازت دی کہ پانچ سو آدمی لے کر ملاقات کے لیے آسکتے ہیں۔ ان کے آجانے پر اعظم خان نے شان دار استقبال کیا ان کو چوبیس گھوڑے اور بیس اعزازی خلعت سے سرفراز فرمایا۔[15]

رندولا خان کے مطالبات نامنظور

باضابطہ گفت و شنید کے بعد کو کانفرنس ہوئی اس میں رندولا خان نے اعظم خان سے درخواست کی کہ دھاروار اس کو دے دیا جائے کیونکہ یہ مقام ان پانچ قلعوں میں سے ہے جو نظام شاہی علاقہ میں ہیں اور اس کے دینے کا وعدہ شہنشاہ نے عادل شاہ سے کیا تھا۔ اعظم خان نے یہ درخواست منظور کی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ رندولا خان نے اعظم خان کی اس مہم میں ساتھ نہیں دیا تھا جو نظام شاہیوں کے خلاف اس نے انجام دی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ موجودہ حالات میں دھاروار مغلوں کے لیے بہت اہم تھا۔ لیکن اعظم خان نے اس کی درخواست کو شہنشاہ کے پاس روانہ کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ دشمن کے خلاف مزید جنگ کرنے میں اس کا ساتھ دے لیکن رندولا خان مغلوں کی کوئی مدد نہ کرنا چاہتا تھا اس لیے کانفرس بالکل ناکام رہی۔

رندولا خان اور مقرب خان میں معاہدہ

مقرب خان کا پیچھا کرتا ہوا اعظم خان شاہ گڑھ پہنچا۔ اس نے رندولا خان سے فرمائش کی کہ دشمن کو بالا گھاٹ آنے سے معذور رکھا جائے، لیکن اس نے

اپنی فوج کی قلت کا عذر پیش کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ نل ڈرگ جا کر اپنے کو وہاں تیار کرے گا اور اپنی سرکار کے احکام کا انتظار کرے گا۔

اس درمیان میں مقرب خان نے اس کو لبھاتے ہوئے پیش کش سے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ وعدہ کیا کہ اگر وہ مغلوں کے خلاف اس کی امداد کرے تو اس کے عوض میں شعلہ پور اسے دیا جائے گا۔ اس اثناء میں مصطفیٰ خان کا اثر کم ہو گیا تھا۔ اس کے اور خواص خان غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس اختلاف سے رندولا خان کو موقع مل گیا اس نے خواص خان کو مجبور کیا کہ مقرب خان کی شرائط منظور کر لے۔ اس بدلے ہوئے ماحول کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ معین الدین جو تحائف لے کر بیجاپور سے آ رہا تھا۔ بیدر میں روکا اور قید کر دیا گیا۔ خواص خان نے شاہی پیامبر کو ہر ساز و سامان سے محروم کر دیا بالآخر خواص نے بھاگ کر اپنی جان بچالی۔

مغلوں کی بے خبری میں رندولا خاں کا حملہ

فتح خان کے بر سر اقتدار آنے کے بعد رندولا خاں نے پھر ایک بار اعظم خان سے صلح کی بات چیت کی کہ اگر اس کے آقا کو عفو تقصیر مل جائے تو وہ مغلوں کے خلاف عمر بھر نہ ہو گا۔ نیز یہ کہ شیخ معین الدین کو بیدر سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔ اور وہ سارے تحفے جو شہنشاہ کے ہمراہ تھے واپس کر دیے جائیں گے۔ اس کے قول و فعل کی آزمائش کے لیے اعظم خان نے بھالکی کی تاخت و تاراج کے لیے قدم اٹھائے دیکھنا تھا کہ رندولا خان کا ردعمل کیا ہوتا ہے لیکن جب اعظم خان منجیر ادریا کے کنارے اپنے خیمے نصب کر رہا تھا تو رندولا خان نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ شاہی فوج کے دستہ کا سرغنہ بہادر خان تھا جو زخمی بھی ہوا اور گرفتار بھی۔ بھالکی دو پڑاؤ کے فاصلے پر تھا مگر اعظم خان کو عجلت کے ساتھ اپنی جگہ سے پسپا ہونا پڑا۔ برسات کا زمانہ گزارنے کے لیے وہ ناندیر پسپا ہو گیا۔ اس طرح رندولا خان کی گفت و شنید بار آور نہ ہو سکی اور مغلوں اور بیجاپور کے

تعلقات میں کشیدگی جاری رہی۔

آصف خان کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم

فتح خان کی اطاعت کے بعد ہی شاہجہاں اس قابل ہوا کہ اب عادل شاہ کی طرف توجہ کرے۔ 3/دسمبر 1631ء کو اس نے آصف خان کو بیجاپور پر حملہ کرنے کی اجازت دی۔ عملاً یہ کل فوج وہی تھی جو حال ہی میں احمد نگر کے جنگ میں تھی۔ کاندھار سے بھالکی تک شاہی فوج بغیر کسی مزاحمت کے سرگرم سفر رہی۔ بھالکی میں محافظ دستہ نے کچھ لڑائی کی مگر آسانی سے زیر کر لیا گیا[22]۔ کملاپور میں آصف خان کو عادل شاہ کا قاصد رزاق اللہ ملا۔ یہ قاصد ایک خط لایا تھا جس میں عادل شاہ نے اپنے اعمال پر اظہار تاسف کیا تھا اور عفو تقصیر کی درخواست کی تھی۔ نیز تاوان جنگ ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ رزاق اللہ، عادل شاہ کا معتمد علیہ قاصد نہ تھا۔ اس لیے آصف خان نے اس کے نامہ و پیام کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اس کو یوں ہی چلتا کر دیا۔ بیجاپور کا سفر جاری رہا۔ راستے میں شاہی فوج نے گلبرگہ کو تباہ کر دیا۔ شہر لوٹ لیا گیا۔ انسانوں کو تہ تیغ کیا گیا[24]۔ بھیما پہنچ کر آصف خان نے اپنی تیس ہزار فوج کا جائزہ لیا۔

شاہی فوج کا بغیر مزاحمت بڑھنا

شاہ پرستوں کا پڑاؤ نورس اور شاہ پور کے درمیان تھا۔ یہیں سے انہوں نے بیجاپور کا محاصرہ شروع کیا۔ محاصرین و محصور میں روزانہ جھڑپ ہوتی رہی۔ قلعہ سے مسلسل آتشباری کی وجہ سے مغلیہ فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی درمیان میں عادل شاہ کے بعض افسروں نے حملہ آوروں سے پرامن صلح کی بات چیت شروع کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شیخ دبیر نے خواص خان کی طرف سے پیش قدمی کی اس نے چند شرائط پیش کیں۔ لیکن فوراً ہی سب شرطیں منظور ہوئیں۔ اس کے بعد بیجاپور کے معزز اشخاص نے مصطفیٰ خان سے اصرار کیا کہ وہ درمیان میں پڑ کر مغلوں سے صلح کرادے۔ عام خیال تھا کہ مصطفیٰ خان کا کچھ اثر

مغلوں پر ہے۔[27]

صلح کی بات چیت

واقعہ یہ ہے کہ مصطفیٰ خاں پہلے ہی سے آصف خان سے اس موضوع پر گفت و شنید کر رہا تھا۔ بعض وقت اس نے اپنی تائید میں دلفریب وعدے بھی کیے۔ ایک موقعہ پر تو اس نے اپنے متبنی لڑکے علی رضا کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ وہ شاہی فوج کو خندقوں سے قلعہ میں بلائے گا لیکن باوجود بہت سے حلفیہ وعدوں کے مکر گیا۔ اس کی دورنگی نے آصف خان کو اس پر اعتماد کرنے سے معذور رکھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ جب تک مصطفیٰ خان اور خیریت خان خود ان شرائط کی توثیق کے لیے نہ آئیں گے وہ صلح نہ کرے گا۔ حسب معاہدہ دونوں رات کے وقت قلعہ سے باہر آئے اور پھاٹک پر ناصری[29] خان نے استقبال کیا۔

مصطفیٰ خان شرائط طے کرتا ہے

ایک طول وطویل مباحثہ کے بعد طے ہوا کہ عادل شاہ 40 لاکھ روپیہ تاوان جنگ ادا کرے۔ رقم کی ادائیگی کچھ نقد اور کچھ جواہرات اور کچھ دوسری صورت میں ہو۔ ان شرائط کا ایک مسودہ تیار ہوا۔ مصطفیٰ خان قلعہ میں گیا کہ اپنے آقا کی توثیق حاصل کر کے باقاعدہ سر بہ مہر کر دے۔ آصف خان کا ملازم عبدالریحان مصطفیٰ خان کے ساتھ گیا تاکہ دستاویز واپس لائے، نیک نیتی کے ثبوت میں عادل شاہ نے دو افسر بہادر خان اور یوسف خان جن کو اس کے افسروں نے پہلے کسی موقعہ پر گرفتار کر لیا تھا واپس کر دیئے۔

خواص خان کی فریب کاری

لیکن صلح کی گفت و شنید کو طول دینا خواص خان کا ایام گزاری کے لیے ایک بہانہ تھا۔ وہ مغل لشکر کے صحیح حالات معلوم کرنے کی فکر میں تھا اسے کچھ واقفیت ہو گئی تھی۔ جب اسے شاہی فوجوں کی کمزوری کا یقین ہو گیا تو اس نے وعدہ توڑ دیا اور ان مغلیہ سپاہیوں پر حملہ بھی کر دیا جو شہر میں خرید و فروخت کے

لیے آئے تھے۔

آصف خان کی غلطیاں

آصف خان صلح کا اس لیے خواہشمند تھا کہ اس کی فوج قحط کی وجہ سے خستہ حال تھی رسد کا بغیر مناسب انتظام کیے ہوئے بڑی بیوقوفی سے وہ دشمن کے قلب سلطنت میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک ایسا موقعہ تھا جب اس کی سپہ سالاری کی آزمائش ہوئی اور وہ امتحان میں ناکامیاب رہا۔ مغلیہ فوجوں کے آنے سے پہلے ہی عادل شاہ نے پڑوس کے اضلاع اس لیے تباہ کر دیے کہ محاصرہ کے وقت، شاہی فوج کو غلبہ نہ ملے۔ قحط اتنا شدید تھا کہ ایک سیر غلہ ایک روپیہ کا ملتا تھا اور جانوروں کا چارا بالکل نہ ملتا تھا۔ ان حالات نے خواص خان کے رویہ میں تبدیلی پیدا کی اور اس کو مغلوں کی طاقت سے بے پرواہ کر دیا۔

آصف خان کی پسپائی

جب مصطفیٰ خان کے نمائندے مغلیہ کیمپ سے وطن واپس آرہے تھے تو ان ہی میں سے ایک نے خواص خان کی دوعملی تحریری اطلاع آصف خان کے لیے چھوڑ دی تھی۔ ضرورتوں سے مجبور ہو کر آصف خان نے اپنا خیمہ اٹھایا تاکہ ایسے اضلاع میں جائے جہاں اس کے آدمیوں کو کھانے پینے کا سامان مل سکے۔ راہ سفر میں مغل بے سوچے سمجھے تخت و تاراج کرتے رہے۔ جن مقامات سے وہ گذرے اسے لوٹ مار کر برباد بھی کیا عورتوں اور لڑکوں کو سرے سے غلام بنا لیا[25]۔ اس طرح وہ لوگ اپنی تباہی کا انتقام بے گناہ لوگوں سے لیتے ہوئے اپنے پیچھے مصیبت و ویرانی چھوڑتے ہوئے بیٹر پہنچے۔ بیجاپور کی ایک فوج ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ حملہ شرمناک ناکامی کا نمونہ ثابت ہوا اور عادل شاہ کا سر نیچا بھی نہ کیا جا سکا۔

مہابت خان کا حوصلہ پار ندا فتح کرنے کا

مہابت خان کو دکن کا نائب بنا کر شہنشاہ شمال چلا آیا۔ دولت آباد کے

محاصرے کے وقت رندولا خان اور شاہ جی وغیرہ مستقل طور پر اسے تکلیف پہنچاتے رہے۔ لیکن اس قلعہ کی تسخیر کے بعد پارندا پر قبضہ کرنے کا جذبہ اس پر غالب آیا۔ اگرچہ یہ مقام اصل میں نظام شاہ کی ملکیت میں تھا لیکن اس کے سپہ سالار آقا[37] رضا نے 1632ء میں عادل شاہ کے سپرد کر دیا تھا۔ مہابت خان نے شہنشاہ کو لکھا کہ دولت آباد کی تسخیر نے دکنی حکومتوں میں خوف اور مایوسی کی لہر دوڑا دی ہے اور بیجاپور کو زیر کرنے کا یہ مناسب وقت ہے۔ اس نے یہ بھی درخواست کی کہ اس کے اپنے سپاہی تھک چکے ہیں۔ اگر کوئی شہزادہ تازہ دم افواج لے کر اس مہم کے لیے آجائے تو کامیابی یقینی ہے[38]۔

اس کے غلط اندازے

اس میں کوئی شک نہیں کہ مہابت خان کا اندازہ بالکل غلط تھا۔ اس کی تازہ حاصل کردہ فتوحات اور خاص کر دولت آباد کی نسخہ اہم کارنامے سہی لیکن بیجاپور کی طاقت کا اندازہ اس نے کم کیا اور احمد نگر میں جو کشمکش تھی اس کو بالکل نظر انداز کیا۔ جہاں تک شہنشاہ کا تعلق ہے دکن کے اصل حالات سے باخبر نہ تھا۔ اس نے جائے وقوع پر متعین آدمی کے فیصلے پر پورا اعتماد کیا اور وہ آدمی بھی کون تھا مہابت خان علاوہ بریں آخر الذکر کا حوصلہ مغلیہ شہنشاہیت کی پالیسی سے متفق تھا اس لیے شاہجہاں نے اس کی درخواست ماننے میں تکلف نہ کیا۔

شہزادہ شجاع دکن بھیجا گیا

اسی لحاظ سے شہزادہ شجاع کو دس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کے منصب پر ترقی دے کر ایک متاثر کرنے والی فوج لشکر کے ساتھ دکن بھیجا گیا۔ شہنشاہ نے کامیابی کی دعائیں دیں اور حکم دیا کہ وہ رتھ پر سوار ہو کر محل سے نکلے۔ جن امراء اور منصب داروں کو اس کے ساتھ کیا گیا ان میں سے چند نام قابل ذکر ہیں مثلاً سید خان جہاں، راجہ جے سنگھ، راجہ وٹھل داس اللہ وردی خان اور رشید خان انصاری، ایک ہزار بندوقچی اور بیشمار پیدل سپاہیوں سے اس لشکر کی تکمیل ہوئی۔

مہم کے اخراجات کے لیے ڈھائی لاکھ روپیہ شاہی خزانہ سے پیشگی دیے گئے۔ اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ مالوہ کے خزانے سے لینے کی اجازت[39] دی گئی۔

سیدھا پارندا گیا

جب شہزادہ شجاع دکن گیا تو راستے ہی میں اسے مہابت خان ملا۔ اس نے مشورہ دیا کہ وہ پارندا جائے۔ ملکا پور سے خان زماں بھیجا گیا کہ وہ بیجا پور کے سرحدی علاقوں کو اس لیے برباد کر دے کہ پارندا کمک نہ بھیجی[41] جاسکے۔ دشمن رسد سے محروم ہو جائے۔ اس سلسلے رابطہ کو برہان پور سے برقرار رکھنے کے لیے مہابت خان نے متعدد چوکیاں ظفر نگر، جالنا پور، شاہ گڑھ اور بڈ میں قائم کر دیں۔ ان کی محافظت کے لیے فوجی دستے مقرر کیے گیے۔

شاہ جی کی نقل و حرکات

بد قسمتی سے یہ مہم ابتدا ہی سے پیچیدہ ہوتی گئی۔ شاہ جی نے نظام شاہ کے ایک رشتہ دار کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کو بادشاہ بنا[42] دیا۔ اس کے جھنڈے کے نیچے وہ سب لوگ جمع ہو گئے جن کو قدیم بادشاہ کے خاندان سے اب بھی محبت تھی اور مغلوں سے کینہ تھا۔ شاہ جی اب اس پر تلا ہوا تھا کہ مغلوں کو دکن سے باہر کر دے۔ بیجا پور کے ایک حلیف ہونے کی وجہ سے فطرتاً اس نے اپنی نقل حرکات کا منصوبہ پارندا پر سے ہٹانے کا بنایا۔ اس نے کوشش کی کہ مغلوں کا سلسلہ آمد و رفت ظفر نگر میں ختم ہو جائے لیکن شہزادہ نے خواص خان کو تین ہزار فوج دے کر شاہ جی کو پسپا کرنے اور خبار تک بھگانے اور اس کے گھر چمر گنڈہ کو لوٹ لینے اور سنگم تیر سے اس پر دباؤ ڈالنے کو بھیجا۔

خان زمان کی ناکامی

خان زمان پارندا پہنچا اور ایک ندی پر خیمہ زن ہوا جو قلعہ سے دو میل کے فاصلے پر بہتی تھی۔ اس نے اپنے آدمی ہمسایہ اضلاع میں بھیجے۔ تاکہ وہ جانوروں کا چارہ اور گھاس مہیا کریں۔ اپنے افسروں کو اس نے سرکردگی تقسیم کی۔ اللہ وردی

خان کو قلعہ کے نیچے سرنگ بچھانے اور توپ خانہ نصب کرنے کا کام سپرد کیا۔ محافظ دستہ نے اللہ وردی خان کا راستہ گولہ باری سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بڑی توپوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتا رہا۔ بایں ہمہ اس کامیابی کا موقعہ ہنوز دور ہی تھا کہ مہابت خان نے راجہ وٹھل داس کو خان زمان کی کمک کے لیے بھیجا لیکن حالت نہ بدلی[45]۔

شاہی کیمپ میں رسد کی کمی

آخر کار مہابت خان ملکاپور چھوڑ کر شہزادہ کے ساتھ پارندا گیا۔ ان لوگوں نے قلعہ سے کچھ ہی دور پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ مصلحت یہ تھی کہ پیچھے ہٹنے کا راستہ بھی محفوظ ہے اور محافظ دستہ تک کمک پہنچنے میں رکاوٹ بھی رہے۔ لیکن مغلوں کے ایک ہی جگہ پر اجتماع نے بے انتہا مشکلات پیدا کریں۔ مہابت خان کے حفظ ما تقدم کے باوجود شاہی فوج میں رسد کم ہو گئی، جس کی وجہ سے ضروری ہو گیا کہ چارا جمع کرنے والے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں دور کے مقامات پر بھیجے جائیں۔ یہ تدبیر بھی دشمنوں کو سازگار ہوئی۔ انہوں نے شاہی فوجیوں کو چھاپہ ماروں کے ہتھکنڈے سے پریشان کر دیا یہاں تک کہ شاہی فوج فاقہ زدگی کی حد تک پہنچ گئی۔

مہابت خان بال بال بچ گیا

ایک موقعہ تو ایسا بھی آ گیا کہ دشمنوں کے دس ہزار آدمیوں نے مہابت خان کو گھیر لیا تھا۔ اس کا ہراول دستہ جو مہیش داس راٹھور اور رگھوناتھ بھٹ کی قیادت میں لڑ رہا تھا۔ حملہ کرنے والوں میں وہ کچھ گھر گیا کہ سارا دستہ ختم ہو گیا۔ ایک آدمی بھی جانبر نہ ہوا۔ اس نقصان نے مہابت خان کو پریشان کن حالات میں ڈال دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے خان دوران فوج لے کر اس کی امداد کے لیے بر وقت آ پہنچا۔ اس کی آمد نے دشمن کو شکستہ دل کر دیا۔ وہ منتشر ہو کر بھاگ گئے۔ ایسے اچانک حملے اکثر ہوتے رہے جو شاہی فوج کے لیے پریشانیوں کا سرچشمہ بن گئے۔

پار ندا کے محافظ دستے کا دلیرانہ مقابلہ

علاوہ بریں محافظ دستہ بڑی دلچسپی و چالاکی کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ اس نے قلعہ کے نیچے کی ہر سرنگ کا پتہ چلالیا، یا تو بارود ہٹا کر سرنگوں کو بیکار کر دیا یا ان میں پانی بھر دیا۔ لیکن کچھ دن کے بعد اللہ وردی خان کی بنائی ہوئی ایک سرنگ مکمل ہوئی اور محافظ دستہ کو خبر نہ ہوئی اور وہ شہزادے کی موجودگی میں اڑی۔ اگرچہ اس سے ایک فصیل گر گئی لیکن کام کا شگاف نہ بنا اس ناکامی نے محاصرین کو بددل بنادیا اور اس حربے کا دہرایا جانا بہت دور کی بات ہو گئی۔

مہابت خان کی پسپائی کے اسباب

ان تمام حادثات میں اضافہ بھی ہوا کہ مہابت خان اور خان دوراں میں بڑی بددلی پیدا ہو گئی۔ خان دوراں مہابت خان کی جان بچانے پر شیخی مارا کرتا تھا جس سے مہابت خان میں ترش مزاجی پیدا ہو جاتی تھی۔ اپنی بداخلاقی سے وہ دوسرے افسروں کو بھی رنجیدہ کر دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب اس کے مخالف ہو گئے۔ ان لوگوں نے اس کی کسی اسکیم کو چلنے نہ دیا۔ ان حالات میں کامیابی سے ناامید ہو کر اس نے شہزادے کو مشورہ دیا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ چنانچہ فوج نے خیمہ اکھاڑا اور پیچھے برہان پور چلی آئی۔

اس کی وفات

دولت آباد کی شاندار فتح کے بعد پارندا کی ناکامیابی مہابت خان کے لیے بڑی شرمناک بات تھی۔ شہنشاہ نے سختی سے اس پر نکتہ چینی کی اور شہزادہ شجاع کو حکم دیا کہ سارا[52] لشکر لے کر فوراً آجائے۔ مہابت خان پہلے ہی سے زوال پذیر عمر کی منزل پر تھا۔ اس کھلم کھلا بے عزتی نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ وہ بواسیری ناسور میں مبتلا تھا۔ اس حادثے نے اس زخم کو اور بڑھا دیا۔ اس کے لڑکے خان زمان کا بھاگ کر دربار شاہی میں جانا اس کی دل شکستگی کا باعث ہوا۔ آخر میں اس کا دماغ کام نہ دیتا تھا۔ وہ کوئی بات برداشت نہ کر سکتا پارندا پر دوبارہ

حملہ کرنے کی فکر میں وہ برہان پور کے باہر خیمہ ڈالے پڑا تھا۔ لیکن اس کی بڑھتی ہوئی کمزوری میں مایوسی بڑھتی گئی اسی عالم میں اس نے 4 ہزار اشرفی اپنے آدمیوں میں تقسیم کی اور اپنے ذخیرہ کا باقی حصہ سر بمہر کر کے دربار شاہی میں بھیج دیا۔ اس کی موت نے جلد ہی اس کا شاندار مگر المناک کردار اکتوبر 1634ء میں ختم[53] کر دیا۔

بیجاپور میں انتشار

اس کی موت نے دکن میں سخت بد نظمی پیدا کر دی اور شاہ جی پھر ایک دفعہ سر گرم عمل ہو گیا۔ بیجاپور کے جارحانہ اقدام کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ وجہ تلاش کرنے کے لیے دور نہیں جانا۔ اس وقت مصطفیٰ خان اور خواص خان کی جتھابندی سے سارے علاقہ میں انتشار تھا خواص خان نے گورنمنٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہر ایک سے لڑنے کو تیار تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ مراری پنڈت تھا جس پر اسے اعتماد کلی تھا اور اس کی نظروں میں وہ بڑا معزز تھا۔ اس کے ہاتھ میں بادشاہ صرف ایک شاہ شطرنج کی طرح تھا جو کچھ وہ لکھواتا وہ لکھ دیتا۔ آخر کار اس نے محمد عادل شاہ کو ترغیب دی کہ وہ مصطفیٰ خان کو حکم دے کہ شاہی مہر واپس کر دے جو ابراہیم ثانی کے زمانہ سے اس کے قبضہ میں چلی آ رہی ہے۔ جب اس نے دینے سے انکار کیا تو خواص خان نے اسے قید کر دیا[54]۔

خواص خان کی کوشش شاہجہاں کو ملانے کی

جب شاہجہاں بندیل کھنڈ پہنچا اور اس کے دکن کوچ کرنے کے ارادہ کی خبر خواص خان تک پہنچی تو اس نے شہنشاہ کی خدمت میں شیخ دبیر کو قیمتی تحائف کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نذرانہ میں ایک ایسا نیلم بھی تھا جس کی قیمت تیس ہزار ہن تھی لیکن جب خواص خان کی چیرہ دستی کی خبر اسے ملی تو اس نے شیخ دبیر سے ملنے سے انکار کر دیا[55] ہندیا سے شہنشاہ نے عادل شاہ کے نام ایک فرمان لکھا اور مکرمت خان کے ہاتھ بھیج دیا۔ اس فرمان کے مضامین دلچسپ ہیں۔ کیونکہ اظہار بیان

میں خوش خلقی اور دھمکی، ترغیب وانتباہ کی عجیب وغریب آمیزش ہے۔ ان میں پوری وضاحت کے ساتھ وہ حالات بیان ہوئے ہیں جن سے شاہجہاں کی بیجاپور سے متعلق پالیسی کی تشکیل ہوئی۔ کیسے عادل شاہ کو مراعات عطا کرنے پر رضا مند تھا اور ساتھ ہی ساتھ بشرط ضرورت کیسے وہ بزور شمشیر اپنی رائے منوانے پر تیار تھا۔

خواص خان کا زوال وقتل

قبل اس کے کہ ان معاملات کی مزید تفصیلات بیان کی جائیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کی تاریخ کے چند ایسے واقعات کا ذکر کر دیا جائے جن کے زیر اثر مغلیہ حکومت سے اس کے تعلقات قائم ہوئے۔ مصطفیٰ خان کو قید کرنے کے بعد خواص خان کی زیادتیاں بے حد بڑھ گئیں۔ اس کی مخالفت تیزی سے ہونے لگی۔ چنانچہ ایک جماعت سیدی ریحان بعدہ 'ملقب بہ اخلاص خان کی قیادت میں اعلانیہ اس کی مخالفت کرنے لگی۔ رندولا خان کی عملی امداد سے فائدہ اٹھا کر سیدی ریحان نے خواص خان اور اس کے منظور نظر مراری پنڈت کو قتل کرا دیا۔ خواص خان کے قتل کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ خان قید سے رہا کر کے پیشوا کے عہدے پر مامور کر دیا گیا، لیکن دربار بیجاپور میں فضا کچھ عرصہ تک شک وشبہ سے گراں بار رہی۔

مکرمت خان کی رپورٹ

مکرمت خان جب بیجاپور پہنچا اس کو عجیب صورت حال ملی۔ بایں ہمہ محمد عادل شاہ نے اس کا پر اعزاز استقبال کیا۔ اس کے خیر مقدم کے لیے باڑ کھیدا تک گیا۔[58] اس درمیان میں مصطفیٰ خان کو جیسے ہی اقتدار حاصل ہوا اس نے اپنے داماد ابوالحسن کو شہنشاہ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ روانہ کیا کہ حال میں جو بے وفائی عادل شاہ نے کی ہے اس کی معافی دی جائے۔ ابوالحسن کے ساتھ رندولا خان کا نمائندہ قاضی ابوسعید بھی تھا۔ آصف خان نے ان

لوگوں کو شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا جو تحائف یہ لوک بیجاپور سے لائے تھے وہ بھی نذر کیے[59]۔

بیجاپور کی تباہی و تحقیر

لیکن بیجاپور کے امراء کے معاندانہ رجحان کی اطلاع جو مکرمت خان نے بھیجی تھی اس نے شاہجہاں کا مزاج بدل دیا اور اس نے اپنے افسروں کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا[60]۔ اس حملہ کا مقصد عادل شاہ کو مرعوب و مغلوب کرنا تھا تو اس بد قسمت ملک کو تین مغلیہ فوجی افسروں نے جس طرح غارت و برباد کیا اس سے شاہ جہاں کا مقصد کلیتاً پورا ہو گیا۔ اب رندولا خان اور مصطفیٰ خان دونوں متحد ہو گئے کہ بادشاہ سے صلح کر لی جائے۔ اپنے نمائندوں کو ان لوگوں نے حکم دیا کہ جلد از جلد مغلوں سے معاہدہ کی تکمیل کر لیں۔ لیکن جب آصف خان نے عادل شاہی سفیروں کو پیش کیا (ان میں سے چار مغلیہ دربار میں قیام پذیر تھے) شاہجہاں نے بری طرح عادل شاہ کے بدلتے ہوئے رویہ کی شکایت کی۔ اس کا غصہ اتنا بڑھا کہ اس نے شیخ دبیر اور شاہ داؤد کے قتل کا حکم دے دیا۔ خواص خان نے ان کو شاہی دربار میں بھیجا تھا۔ لیکن آصف خان کی سفارش پر دونوں کی جان بخشی ہوئی۔

ابوالحسن صلح کرنے کی کوشش کرتا ہے

شہنشاہ کے غیظ و غضب سے نڈر ہو کر ابوالحسن اس کو ہر قیمت پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر شاہجہاں صلح کرنے پر راضی ہو گیا۔ حسب ذیل شرائط مرتب ہوئی۔ عادل شاہ کا مغلیہ برتری تسلیم کرنا، بیس لاکھ روپیہ صلح کرنے کی قیمت ادا کرنا گولکنڈہ سے صلح کرنا قطب شاہ اور اپنے نزاعی معاملات کو شہنشاہ کے فیصلہ کے لیے پیش کرنا علاوہ ان شرائط کے شاہجہاں نے بیجاپور کی سرحد متعین کرتے وقت نظام شاہی علاقہ کا ایک جزو عادل شاہ کے حصہ میں دے دیا۔ آخری بات یہ طے ہوئی کہ کوئی حکومت دوسری حکومت کے افسروں

کو ان کے آقا سے بہکانے کی کوشش نہ کرے۔ عادل شاہ اس پر بھی راضی ہوا کہ شاہ جی کی سرکوبی میں مغلوں کا شریک کار رہے گا۔ اگر اوّل الذکر حتار اور ترمیک سے دستبردار نہ ہو جب یہ شرائط طے ہو گئیں تو شاہجہاں نے 6/ مئی 1636ء کو عادل کے پاس پر تقدس ایک فرمان بھیجا جس پر شنگرف میں ٹیوبا ہوا بادشاہ کا پنجہ منقش تھا اور خدا اور رسول کو درمیان میں رکھتے ہوئے شرائط پوری کرنے کی قید تھی۔ اسی سال کی ۱۱/ جولائی کو مکرمت خان بیجاپور سے معہ تحائف حاضر ہوا۔

شاہجہاں پہلی مرتبہ عادل شاہ کے اعمال پر ملامت کرتا ہے

اس کے بعد محمد عادل شاہ اور مغل تعلقات بحیثیت مجموعی پرامن رہے۔ صرف دو موقعے ایسے آئے جب شاہجہاں کو عادل شاہ کی تنبیہ کے لیے کچھ لکھنا پڑا۔ 1642ء میں مصطفیٰ خاں کی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی طاقت پر خفا ہو کر عادل شاہ نے اسے قید کر دیا۔ اس اقدام پر شاہجہاں ناخوش ہوا اس سے کہ مصطفیٰ خان مغلوں کا طرف دار تھا۔ شاہجہاں نے عادل شاہی سفیر مرزا رجب کو روک رکھا۔ اس کے ساتھ مرزا مظفر حسین خوانی کو اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ عادل شاہ مصطفیٰ خان کو رہا کر کے اس کے عہدے پر بحال کر دے۔[65]

دوسری بار

جو صلح محمد عادل شاہ نے اپنی اطاعت پذیری سے مغل شہنشاہ سے خریدی تھی وہ اس کی سلطنت کے لیے بڑی کار ثابت ہوئی۔ شمال کی مداخلت سے مطمئن ہو کر اس نے جنوبی کرناٹک پر قبضہ کر کے مملکت کی توسیع کر لی۔ اس طرح اس کے عہد میں سلطنت بیجاپور بہ لحاظ توسیع، اقتدار، شان و شوکت اپنی بلند ترین منزل پر پہنچ گئی۔ شاہجہاں نے یہ حقیقت تسلیم کر کے اس کو 1648ء میں شاہ کا خطاب عطا کیا۔ اس نئے اعزاز نے بیجاپور کے بادشاہ کے غرور میں بھی اضافہ کر دیا۔ اپنا

دربار قلعہ سے باہر ایک بلند محل میں کرنے لگا۔ ہاتھیوں کی لڑائی کھلے میدان میں دیکھنے لگا اپنے سب سے بڑے اعلیٰ مرتبت شخص کو خان خانان کا خطاب بھی دے دیا۔ اس پر شاہجہاں نے اس کو ایک فہمائشی خط بھیجا۔ محمد عادل شاہ نے چپکے سے سر تسلیم خم کر لیا۔ اپنے بیباک اقدامات سے باز آیا۔ شاہجہاں کی خفگی کا یہ دوسرا موقع تھا۔

بیجاپور پر اورنگ زیب کی چڑھائی

محمد عادل شاہ کا انتقال 4/ نومبر 1665ء کو ہوا۔ اس کی جگہ اس کا لڑکا علی تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں شہزادہ اورنگ زیب دکن کا نائب سلطان تھا۔ اس کی للچائی آنکھیں بیجاپور پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے باپ کو آمادہ کیا کہ اس سلطنت پر حملہ کرنے کی اجازت دے۔ اس لیے کہ نیا حکمران ایک مجہول نسب کا فرد ہے اور ملک میں بڑی بد نظمی پھیلی ہے۔ شاہجہاں راضی ہو گیا۔ بیٹے کو حکم دیا کہ میر جملہ کو ساتھ لے کر بیجاپور کی سرحد پر چڑھائی کرے۔ اگر ممکن ہو تو پورا ملک فتح کر لے ورنہ قدیم احمد نگر کا وہ حصہ ملحق کر لے جو 1636ء کے معاہدہ میں بیجاپور کو دیا گیا تھا۔ بیجاپور کا خاص علاقہ قدیم اس شرط سے چھوڑ دیا جائے کہ حکمران ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان ادا کرے اور شہنشاہ کی برتری تسلیم کرے جس کا مطلب تھا کہ سکہ اسی کے نام سے جاری ہوگا۔ خطبہ بھی اسی کے نام سے مسجد میں پڑھا جائے گا۔ دوسری بات پر عمل کرنے کے لیے اورنگ زیب کو اپنے پرچم کے تلے ایک زبردست فوج جمع کرنے کی ضرورت تھی جو گولکنڈہ فتح کر سکے۔

شہزادہ نے اس مہم کی تیاری کے سلسلے میں عادل شاہی افسروں کو زبردست رشوتیں دے کر اپنی طرف مائل کیا۔ تب وہ بیجاپور میں داخل ہوا۔ بیدر، کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کی مدافعت سدی مرجان نے بڑی بہادری سے کی۔ لیکن جب وہ ایک دھماکے سے زیادہ زخمی ہو گیا تو اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد

کلیانی کا محاصرہ کرنا تھا چار مہینے کے مستقل محاصرہ کے بعد وہ فتح ہو گیا۔ اب بیجاپور کا راستہ صاف تھا۔ لیکن اچانک اورنگ زیب کو لڑائی ختم کرنے کا حکم ملا۔ اس نے عادل شاہ سے ایک معاہدہ کر لیا، جس کی رو سے آخر الذکر وہ رقم ادا کرنے پر راضی ہو گیا جو شہنشاہ نے مقرر کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بیدر، کلیانی، پارندا اور دوسرے نظامی شاہی کون کان کے قلعہ جات اور دانگی کے دوسرے اضلاع سے دستبردار ہونے پر راضی ہو گیا۔

گولکنڈہ

سلطان قلی قطب شاہ آخری افسر اعلیٰ تھا جس نے بہمنی خاندان[71] کی اطاعت کا بوجھ سر سے اتار پھینکا۔ جس خاندان کی بنیاد اس نے ڈالی اگرچہ اس کے افراد ہمت وشجاعت کے لحاظ سے ممتاز نہ تھے اس کا فخر اس خاندان کو ضرور حاصل تھا کہ اس نے فنون لطیفہ کو پروان چڑھایا اس خاندان کے اکثر افراد نفس پرستانہ تعیش کے خوگر تھے۔ یہی رجحان ان کی بردباری اور ہمسایوں کی اطاعت پذیری کی نشان دہی کرتا ہے۔ مغلیہ شہنشاہ سے نیاز مندی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس خاندان کی تاریخ میں بہت کم قطب شاہی حکمرانوں کی فوجی فتوحات نظر آتی ہیں۔ برخلاف اس کے گولکنڈہ کے بادشاہوں کا میدان جنگ سے بھاگنا غیر معمولی بات نہ تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسی ناقابل بیان بات ضرور ہے کہ جب ہم اس خاندان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان سے ہمدردی بھی ہوتی ہے اور ان کی مدح وثنا کو بھی جی چاہتا ہے۔

مغلیہ خاندان سے رابطہ

اکبر کا ہمعصر محمد قلی قطب شاہ اس خاندان کا پانچواں حکمراں تھا اور اگرچہ دکنی مؤرخ مغل اعظم اور اس کے تعلقات کا تذکرہ نہیں کرتے لیکن پھر بھی اکبر نامہ میں جا بجا ان تحفہ جات کا اندراج ملتا ہے جو گول کنڈہ[72] سے آتے رہتے تھے۔ بجائے خود یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ دوستانہ مبادلہ تحفہ جات

عہد متوسط کے بادشاہوں میں تہذیب و اخلاق کا مقدس نمونہ تھا۔ اس سے یہ لازمی نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے کہ یہ رویہ کسی ماتحتی یا اقرار برتری کی نشان دہی کرتا ہے۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں پہلے محمد قلی اور بعد میں اس کے جانشین شاہ ملک عنبر کی امداد مغلوں کے خلاف برابر کرتے رہے۔ انہوں نے زیادہ روپیہ سے اس کی اعانت کی۔ بیجاپور نے فوجی مدد کی یہ صرف شہزادہ شاہجہاں کا دباؤ تھا جس نے دوبار محمد قطب شاہ کو نظام شاہ سے بچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ دکن کی پیچیدہ سیاست میں خود قطب شاہ مبتلا ہونے کے خلاف تھا۔

محمد قطب شاہ

بدقسمتی سے محمد قطب شاہ کے عہد حکومت سے متعلق تفصیلی دستاویزات ہم تک نہیں پہنچیں اور عصری مغلیہ مورخین ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہ لوگ اس سلطنت کے اندرونی تاریخ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ مغلیہ تعلقات کے سلسلے میں صرف یہ ایک اہم بات ملتی ہے کہ 1621ء میں محمد قطب شاہ بیس لاکھ روپیہ بطور خراج ادا کرنے پر راضی ہوا۔ اس لحاظ سے اس کا حصہ سب سے زیادہ تھا کیونکہ بیجاپور کو ایک لاکھ اسی ہزار ادا کرنا پڑا اور احمد نگر کو صرف ایک لاکھ بیس ہزار دینا پڑا۔ جب شہزادہ شاہجہاں نے اس واقعہ کے ایک سال بعد بغاوت کی تو گولکنڈا کے بادشاہ نے نہ صرف اس کو اپنے علاقہ سے گزر جانے کی اجازت دی بلکہ روپیہ سے اس کی امداد بھی کی[73]۔

عبداللہ اور شاہجہاں

محمد قطب شاہ کا انتقال 31/ جنوری 1626ء کو ہوا۔ اس کا جانشین اس کا لڑکا عبداللہ ہوا۔ اس کی عمر تخت نشینی کے وقت گیارہ سال چھ مہینے کی تھی۔ مروجہ دستور کے مطابق ہمعصر بادشاہوں نے اپنے اپنے سفیر مبارک باد پیش کرنے کے لیے بھیجے۔ عادل شاہ ثانی نے شاہ ابوالحسن کو اور مرتضٰی نظام شاہ ثانی نے شاہ میر جعفر کو بھیجا۔ اگرچہ شاہجہاں اس وقت بادشاہ نہ تھا مگر پھر بھی

مرحوم بادشاہ کے احسانات یاد کر کے اس نے اخلاص خان قزوینی کو گولکنڈہ روانہ کیا۔ قزوینی کا یہاں باعزت خیر مقدم ہوا۔ ضروری رسوم ادا کرنے کے بعد اس کو واپس بھیجا گیا۔[74]

عہد نابالغی کا انتظامیہ

سلطان کی نابالغی کے زمانے میں سلطنت کے انتظامات کے لیے افسروں کی ایک کونسل مقرر ہوئی۔ اس کے ممبر ایک دوسرے سے رشک کرتے تھے۔ محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد شاہ محمد کو پیشوا کا منصب ملا۔ لیکن ذمہ داریوں کا تنہا انجام دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے شیخ محمد کو نائب پیشوا کا خطاب دے کر دبیر کا عہدہ دیا گیا۔ منصور ایک ناخواندہ ابی سینا کا رہنے والا میر جملہ بنادیا گیا۔ اس نے برہمنوں کی سرپرستی کی اور ان کو شعبۂ مالیات میں وسیع اختیارات کے ساتھ کام کرنے کی آزادی تھی۔ ان تقررات کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا کہ ان کا اثر قطب شاہ اور مغلیہ شہنشاہ کے تعلقات پر بالواسطہ اثر انداز ہوا۔

محی الدین کی سفارشات

اپنی تخت نشینی کے بعد شاہجہاں نے شیخ محی الدین کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا۔ دار السلطنت کے قریب اس کا استقبال میر قاسم نے کیا۔ قطب شاہ دربار کے دوران قیام شاہ محمد اور اس کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ شاہ محمد اس کے شایان شان برتاؤ نہ کرتا۔ اس کو جلد ہی برطرف کر کے اس عہدہ پر شیخ محمد کو مامور کیا گیا۔ یہ شخص دانشمند بھی تھا اور قابل بھی۔ اس نے سختی سے آداب دربار کی پابندی نافذ کی۔ شیخ محی الدین کو یہ کارگزاری ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بد اخلاقی سے پیش آیا۔ شیخ محمد نے آصف خان کو شیخ محی الدین کی شکایت لکھ بھیجی۔ آخر الذکر کی تنبیہ ہوئی۔ جب شاہجہاں دکن آیا تو وہ وہاں کے سفیر وفا خان کے ساتھ گولکنڈہ سے تحائف لے کر واپس ہوا اور شہنشاہ کی خدمت میں 23/ مارچ 1631ء کو پیش کیا۔

قطب شاہ کا خطرہ سے ہوشیار ہونا اور کھیدیارا کی تسخیر

دکن میں ایک زبردست فوج کی موجودگی اور بالخصوص ناصری کے کاندھار کے محاصرے نے قطب شاہ کو چونکا دیا۔ اس نے آدم خان حبشی ملقب بہ عین الملک اور اللہ قلی ترک سرار کو لاس بھیجا تاکہ یہ لوگ سرحد کی دیکھ بھال اور مغلوں کی مداخلت پر نظر رکھیں۔ لیکن اس علاقے میں کوئی واقعہ ایسا نہ ہوا جو دونوں حکمرانوں کے تعلقات خراب کرے۔ برخلاف اس کے باقر خان نجم ثانی اڑیسہ کے جنگ جو گورنر نے دسمبر 1630ء میں منصور گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قطب شاہی علاقہ میں اندر گھس آنا چاہتا تھا۔ 1631ء میں اس نے چند افسروں کو شکست بھی دی جو اس کے خلاف بھیجے گئے تھے۔ لیکن جب عبداللہ نے اس بات کی اطلاع شاہجہاں کو دی تو اس نے باقر خاں کو سرحد سے واپس چلے آنے کا حکم دیا۔

شاہ علی بیگ گولکنڈہ بھیجا گیا

شاہجہاں نے فوراً وفا خاں کو رخصت کر دیا۔ اس کے ساتھ شاہ علی بیگ کو بھیجا۔ آخرالذکر ایک ہزار فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ راہ سفر میں وفا خان کا اسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ شاہ علی بیگ تنہا حیدر آباد کی طرف چلا۔ دارالسلطنت کے قریب فصیح الدین محمد نے اس کا استقبال کیا۔ 24/ نومبر 1631ء کو وہ شاہ کی حضوری میں پیش ہوا۔ اس نے وہ خط بھی دیا جو شاہجہاں نے بھیجوایا تھا۔ آخرالذکر نے ایک کثیر رقم اور کچھ جواہرات کا قطب شاہ سے مطالبہ کیا تھا۔ عبداللہ بلکہ اس کے جملہ مشیر تعمیل فرمائش میں مذبذب تھے۔ لیکن مغلیہ شہنشاہ کے فوجی اقتدار کا بھی ان کو خوف تھا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس وقت آصف خان کے زیر قیادت ساری فوج بیجاپور کی مہم میں مصروف تھی اور قطب شاہ بڑی دلچسپی سے اس کی کارگزاریوں کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس درمیان میں قطب شاہ کے سفیروں کو وعدوں سے بہلاتا رہا۔ اس کو روکے رہا۔ حالانکہ

شاہجہاں کا بار بار تقاضا ہوا کہ اس کو واپس کر دیا جائے۔ جب قطب شاہ کو بیجاپور میں مغلیہ فوج کی ہزیمت کی اطلاع ہوئی تو اس نے شاہ علی بیگ کو غیر رسمی طور سے رخصت کر دیا۔

گولکنڈا میں جشن اور دوسرے واقعات

شاہجہاں کے شمال واپس جانے پر گولکنڈہ میں بڑا جشن منایا گیا۔ اس کے بعد چار سال تک مغلوں نے بہت کم مداخلت کی۔ عبداللہ خود بھی الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب مہابت خان نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کیا اور محمد عادل شاہ نے دولت آباد کی رہائی کے لیے مدد مانگی تو وہ خاموش[83] رہا۔ برخلاف اس کے قطب شاہ نے مغلیہ پالیسی کے ایک بدنام دشمن خواص خان کے زیر کرنے میں خاص حصہ لیا اور پھر جب عبداللہ خان فیروز جنگ اور خان دوران گولکنڈہ کی سرحد پر جھجار سنگھ کے خلاف تعاقب میں پہنچے اور انہوں نے متوفی باغی کے پس ماندگان کی سپردگی کا مطالبہ کیا تو قطب شاہ نے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس تعمیل حکم میں خوف کار فرما تھا کیونکہ شاہجہاں کے دولت آباد آنے کی خبر گولکنڈہ پہنچ چکی تھی۔

قطب شاہ اور مغلوں کے تعلقات میں تبدیلی

اس طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ مغل اور قطب شاہ کے سیاسی تعلقات میں خوف کا جذبہ دوسرے جذبات سے زیادہ کار فرما تھا۔ لیکن یہ عہد ہی فوجی کار گزاریوں کا تھا اس کے علاوہ کسی بات کی توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔ قطب شاہ معاملات طے کرنے کے لیے تلوار درمیان میں نہ لانا چاہتا تھا۔ اس نے ہمیشہ روپیہ دے کر ناخوشگوار ایام کو دور رکھا۔ شاہجہاں کی نظر میں ایک مرتبہ گولکنڈہ کی دولت آچکی تھی اس لیے اس کے مطالبات کا معیار بلند سے بلند تر اور خوف و ہراس پیدا کرنے کا جذبہ مضبوط تر ہوتا رہا۔ شاہجہاں کے دوسری بار دکن آنے پر دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں ایک نیا رخ دکھائی پڑا۔ اب تک قطب شاہ کے

گاہے ماہے بھیجے ہوئے تحفہ جات پر اس لیے قانع تھا کہ نذرانہ کو وہ اپنی برتری کا اعتراف باضابطہ کی علامت سمجھتا تھا۔ لیکن اب اس سے بھی کچھ زیادہ وصول کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

گولکنڈہ سلطنت کی نوعیت

اس منزل پر پہنچ کرنا مناسب ہوگا اگر سلطنت گولکنڈہ کی سیاسی حیثیت کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے۔ سلطنت قطب شاہی کے پہلے بادشاہ سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے نام پر خطبہ جاری کیا۔ شیعہ مذہب کو سلطنت کا مذہب قرار دیا۔ اس کے جانشینوں نے بھی اس کے نظریے پر عمل کیا۔ برخلاف بیجاپور اور احمد نگر کے حکمرانوں کے ستر ہویں صدی عیسوی کے آغاز تک ایران سے الگ رہے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی سفیر 1603ء میں گولکنڈہ آیا اور اپنے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے لیے ایک تاج لایا۔ آخر الذکر نے پہلے قنبر علی اور بعد میں مہدی قلی سلطان طالش کو شاہ ایران کی خدمت میں اظہار تشکر کے لیے بھیجا بعد ازاں سفراء کے تبادلے کا دونوں درباروں میں ایک سلسلہ جاری رہا۔ دونوں سلطنتوں کے روز افزوں قرب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ میں شاہ ایران کا نام بھی خطبہ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ تبدیلی کب آئی۔ اس کے زمانے کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اس زمانے میں ضرور تھی جب شاہجہاں نے اس کی شکایت کی۔ مختصر یہ ہے کہ گولکنڈہ کی دنیاوی اور روحانی وفاداری شاہ ایران اور مغلوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

شاہجہاں اپنا مذہب عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے

یہ صورت حال شاہجہاں کے لیے نا قابل برداشت ثابت ہوئی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ شاہجہاں سنی تھا۔ اس حیثیت سے اپنے مذہب کے عقائد محکوم سلطنتوں پر مسلط کرنا اس کا فرض تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ صحابی رسول اور تین خلیفہ کی توہین نہ ہو۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہ سیاسی تضاد بھی تھا کہ مغل شہنشاہ کے زیر

سا یہ رہ کر خطبہ شاہ ایران کے نام پڑھا جائے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت سب سے زیادہ مضبوط تھی اس لیے سب کو اس کے زیر اثر رہنا تھا۔ یہ اس زمانے کا سیاسی نظریہ تھا، پھر کیسے ایسی سلطنت سے ہمدردی کی جاسکتی تھی جو خارج الملک ہو۔ لیکن تعجب خیز یہ واقعہ ہے کہ یہ عقیدہ صرف عبداللہ قطب شاہ پر مسلط کیا گیا۔ محمد عادل شاہ سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ حالانکہ اس کا بھی رویہ قطب شاہ کی طرح تھا۔ وجہ تلاش کرنے کے لیے دور نہیں جانا۔ اوّل الذکر مسکین مزاج اور فرمانبردار تھا لہٰذا اس کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا گیا۔

شاہجہاں کے مطالبات

چنانچہ شاہجہاں نربدا کے دوسرے کنارے پر بمقام ہنڈیا پہنچا تو وہاں سے اس نے عبداللطیف گجراتی کو گولکنڈہ روانہ کیا۔ جو خط اس نے بھیجا تھا وہ کافی دلچسپ ہے۔ اس کی ابتداء گول کنڈہ سے شیعہ مذہب ختم کرنے کی باقاعدہ مطالبہ سے ہوتی ہے۔ شہنشاہ کا فرمانا ہے کہ بحیثیت سنی بادشاہ کے میرا فرض ہے کہ مذہبی برگشتگی کا قلع و قمع کردوں۔ اس کے بعد وہ عبداللہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ صحابی رسول کی بے حرمتی وہ روک دے، جو لوگ نہ مانیں ان کو سزا دے ورنہ اس کے ملک پر قبضہ کرلینا وہ اپنا فرض منصبی سمجھے گا۔ خطبہ کے سلسلے میں شہنشاہ کہتا ہے کہ جب تم میرے مقلد ہونے کا اقرار کرتے ہو تو پھر ایرانی بادشاہ کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ اور آخر میں یہ لکھا گیا ہے کہ خراج کا بقایا جواہرات، زیورات اور ڈاک سمندر اور بسرگ جیسے ہاتھیوں سے ادا کیا جائے۔ ایک خاص وقت مقرر کیا جاتا ہے کہ جس میں ان تحفہ جات کا دربار تک پہنچنا ضروری ہے ورنہ جو نقصان تم کو اور تمہاری رعایا کو پہنچے گا اس کی ذمہ داری تمہارے افعال[87] پر ہوگی۔

عبداللہ وفاداری کا ثبوت دیتا ہے

اس فرمان کے اجراء سے پہلے ہی عبداللہ نے اپنے اطاعت پذیر رجحان کا

ثبوت اس تعمیل ارشاد سے دیا جو عبداللہ فیروز جنگ اور خان دوران نے جھجار سنگھ کے تعاقب میں گولکنڈہ کی سرحد پر کیا تھا۔ انہوں نے عبداللہ سے یہ کہا کہ جھجار سنگھ کے ان عزیزوں کو سپرد کر دے جنہوں نے اس کے یہاں پناہ لی ہے۔ عبداللہ نے اس کو عالم خان کے ساتھ بھیج دیا جس نے ان لوگوں کو شاہجہاں کے سامنے برہان پور کے قریب پیش کیا۔ شہنشاہ بے حد خوش ہوا۔ عالم خان کو ایک گھوڑا اور خلعت اعزاز عطا کیا۔ اس کے بعد ہی ملا نفسیائی شیرازی بڑی تیز رفتاری سے نذرانہ لے کر مغل شہنشاہ کے پاس پہنچا اور دولت آباد میں شاہجہاں[89] سے ملا۔

شاہی سفیر کا استقبال

شیخ عبداللطیف 5/ فروری 1636ء کو گولکنڈہ کی سرحد میں داخل ہوا۔ وہاں کریم خان سے ملاقات ہوئی۔ اس کے آگے بڑھا تو میر معزالدین مشرف نے خیر مقدم کیا اور کچھ دور تک اس کے ہمراہ رہا۔ حیدر آباد کے قریب شیخ محمد طاہر نے اس کا استقبال کیا اور اس کو اس مکان تک پہنچایا جو اس کے لیے نامزد تھا۔ بادشاہ کی حضوری میں ۱۱/ فروری کو وہ پیش کیا گیا۔ عبداللہ نے سفیر کی بڑی دھوم دھام کی دعوت کی۔ اس کی خوشنودی کے لیے صرف دلفریب باتیں کرتا رہا۔ اس اثناء میں خان دوراں سرحد پر نمودار ہوا۔ وہاں اس نے کچھ اضلاع میں لوٹ مار کی۔ اس پر قطب شاہ چونک پڑا۔ اس نے ایک دستہ افسروں کا سرحد کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ اور گول کنڈہ قلعہ کی مرمت کا حکم دیا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ ان مقامات پر اسلحہ اور آتش بار سامان پوری طرح بھیج دیے جائیں۔ ماہر توپچی مقرر کیے گئے کہ توپ خانے کو بہتر بنائیں، ان جگہوں پر کافی رسد جمع کر دی گئی تاکہ محاصرے کے وقت محافظ دستہ کو غذائی تکلیف نہ ہو۔ ہر وہ سڑک بند کر دی گئی جو گول کنڈہ جاتی تھی۔ ان پر حفاظت کے لیے پہرے بھی بٹھا دیے گئے[91]۔

عبداللہ شاہجہاں کا حکم مان لیتا ہے

لیکن ایسی وسیع پیمانے کی فوجی تیاریوں نے شاہجہاں[92] کو مرعوب نہ کیا۔ وہ اپنے مطالبات کی تعمیل پر اڑا رہا۔ خاص کر اس بات کے لیے جس کا تعلق خطبہ میں شاہ ایران کا نام ہٹا کر اس کا نام لانا تھا۔ بالآخر بڑے شش و پنج کے بعد عبداللہ شاہی احکام کی تعمیل پر رضا مند ہوا۔ لیکن عوامی ملامت سے اپنے کو بچانے کے لیے اس نے علماء و قضاۃ کی ایک کونسل طلب کی تاکہ ان بزرگوں کی بھی رائے سن لی جائے۔ ان لوگوں نے بالاتفاق ان نفرت انگیز احکام کو مان لینے کی صلاح دی کیونکہ نہ ماننے میں بڑی خوں ریزی کا اندیشہ تھا[93]۔ اس مشورے کی روشنی میں عبداللہ نے حکم دیا کہ شاہجہاں کا نام خطبہ میں شامل کر لیا جائے اور جب تک عبداللطیف کا قیام گولکنڈہ میں رہا بادشاہ ہر جمعہ کو مسجد جاتا تھا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کے احکام کی تعمیل ہوئی یا نہیں۔ شہنشاہ مطمئن ہو گیا۔ خان دوران کو گولکنڈہ کی سرحد سے واپس چلے آنے کا حکم ملا[94]۔

شرائط صلح

26/ مئی 1636ء کو عبداللہ نے عبداللطیف گجراتی کو رخصت کیا۔ اس کے ہمراہ شیخ محمد طاہر کو بھیج دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی دیا جس میں حسب ذیل شرطیں تھیں۔

۱- کہ چاروں طرف خلفاء کا نام ارکان نماز میں لیا جائے۔ خطبہ شہنشاہ کے نام پر پڑھا جائے اور سکہ اسی کے نام مسکوک ہو۔

۲- نویں سنہ جلوس سے عبداللہ سالانہ خراج دو لاکھ ہن ادا کرے۔ رقم مذکورہ بالا کسی ایسے شہزادہ کے پاس جو دکن کا ناظم ہو یا کسی اور امیر کے پاس بھیجی جائے جسے شہنشاہ نامزد کر دے۔ علاوہ بریں آٹھ لاکھ روپیہ بقایا منجملہ بیس لاکھ روپیہ جو اس کے ذمہ آٹھویں جلوس تک واجب الادا ہے۔ یہ رقم بحساب دو لاکھ ہن سال رواں یعنی نویں سال جلوس سے بھیجی جائے گولکنڈہ اور شاہی دربار کے مبادلہ قسطوں کا فرق (بٹہ) شاہی خزانے میں نمائندوں کے ہاتھ بھیجا جائے اس

پر سالہائے آئندہ سے عمل ہو۔

۳- یہ کہ عبداللہ ہمیشہ شہنشاہ کا وفادار رہے گا جیسا کہ عبداللطیف کے سامنے اس نے حلفیہ اقرار کیا ہے اگر اس نے خلاف ورزی کی تو شہنشاہ کو اس کا ملک لے لینے کا حق ہوگا۔

۴- یہ کہ اگر بیجاپور کی طرف سے مداخلت ہو تو شاہی نمائندے اس کی مدد کریں۔ اگر عادل شاہ اس کو مجبور کرے کہ وہ کچھ رقم اس کو دے تو اس کے برابر رقم شاہی خراج سے منہا کرلی جائے۔

تبصرہ

ان شرائط کی سختیاں محتاج بیان نہیں۔ صرف عبداللہ اور اس کے مشیر کاروں کی بُزدلانہ طاعت پذیری اس کی تشریح کرسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ہمعصر ہمسایہ عادل شاہ کی بہ نسبت قطب شاہ زیادہ فرمانبردار تھا۔ باوجود اس کے بیجاپور سے معاہدہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ کیا گیا۔ وہاں کے مذہبی امور میں نہ کوئی دخل دیا گیا اور نہ کوئی مستقل خراج عائد کیا گیا۔ مجموعی حیثیت سے شاہ کے ساتھ بہ نسبت عبداللہ قطب شاہ کے زیادہ اچھا برتاؤ کیا گیا۔ حالانکہ آخرالذکر کرنے شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے اپنی عزت اور مذہبی عقائد کو بھی قربان کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ شرائط تلوار کی نوک پر منظور کرائی گئیں۔

عبداللہ کے تحائف شاہجہاں کے لیے

شاہجہاں نے دولت آباد میں قاصدوں کے آنے کا انتظار کیا۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچے تو شاہ علی بیگ کیمپ کوتوال، مرزا جان قلی اور افضل خان نے ان کا استقبال کیا۔ شیخ طاہر نے شہنشاہ کے حضور وہ نذرانے پیش کیے جو وہ اپنے آقا سے لایا تھا۔ ان تحائف میں جواہرات، قیمتی پتھر کئی ہزار اشرفیاں اور سکے جو شاہجہاں کے نام پر مسکوک تھے۔ سو ہاتھی، پچاس گھوڑے معہ طلائی ساز و سامان

کے شامل تھے۔ان تمام تحائف کی قیمت چھ لاکھ روپیہ تھی۔ قطب شاہی سفیر کو ایک نادر عزت یہ حاصل ہوئی کہ شاہجہاں نے اس کومال خانہ میں بلاکر اپنے جواہرات کاذخیرہ دکھایا۔ وہ شاہی خیمہ کے ساتھ مانڈو تک گیا۔ وہاں سے اسے واپسی کی اجازت ملی۔ اسی کے ساتھ شہنشاہ نے خواجہ طاہر کو بھی بھیجا۔ آخرالذکر راہ سفر میں برہان پور میں پہنچ کر مر گیا۔اس کی جگہ خواجہ زاہد کا تقرر ہوا۔ یہ دونوں دسمبر 1636ء کے اواخر یاسال آئندہ کی جنوری کے اوائل میں گولکنڈہ پہنچے۔خواجہ زاہد نے شہنشاہ کی طرف سے عبداللہ قطب شاہ کوایک ہاتھی معہ طلائی ہووج پیش کیا۔ پچاس پارچہ جات زمرد کی ایک تسبیح بھی نذر کی۔ منجملہ شاہجہاں کی ایک تصویر ایک خوبصورت فریم میں ایک سنہری تختی جس پر معاہدے کی شرائط نقش تھیں، پیش کی گئیں۔ شاہی قاصد چند دنوں کے بعد واپس آیا۔[94]

معاہدہ کی شرطیں

مذکورہ بالا طلائی تختی پر منقوش معاہدہ کی شرطیں اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ پابندی سے زیادہ ان کی عہد شکنی ہوئی۔ اختصار کے ساتھ شرائط حسب ذیل ہیں۔ ''چونکہ تم نے ہمارے احکام کی تعمیل کی اور خطبہ سنی مذہب کے لحاظ سے پڑھا، سکے بھی ہمارے نام پر جاری کیے اور وعدہ کیا ہے کہ ان باتوں پر ہمیشہ عمل ہوتا رہے گا نیز یہ کہ سالانہ خراج معہ دولاکھ ہن جو برابر آٹھ لاکھ روپیہ کے ہوتے ہیں تم نے نظام الملک کو ادا کیا۔ ان کے پیش نظر ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کر کے تم کہ تمہارا ملک بخشتے ہیں۔ مزید برآں ہم خدااور رسول کو درمیان میں رکھ کر وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک تم اور تمہارے جانشین ان شرائط کی پابندی کرتے رہیں گے ہم اور ہمارے لڑکے اور جانشین بھی تمہارے ملک کو نقصان نہ پہنچائیں گے اور یہ کہ جو شرائط اس تختی پر کندہ ہیں ان کے خلاف درزی نہ ہوگی۔ لیکن جیسا کہ بعدازاں گولکنڈہ سے تعلقات کی

تاریخ سے ظاہر ہوگا یہ معاہدہ بادشاہوں کے نزدیک صرف ایک رڈی کاغذ تھا۔

اورنگ زیب اور عبداللہ

اٹھارہ سال تک شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد دکن کے معاملات تھے۔ اورنگ زیب کا رجحان اس کے مستقبل کے منصوبوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے اپنے نمائندہ گولکنڈہ میں رکھے اور جن کو خوش رکھنے کی عبداللہ ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ پہلا نمائندہ بندہ رضائی تھا عبداللہ اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اپنے امراء کو بھی حکم دیا تھا کہ وہ بھی اس کو خوش رکھیں۔ اس نے وہاں بڑی دولت اکٹھا کی اور متکبر بھی ہو گیا۔ علاوہ بر ایں بعض وقت اس نے اس رقم میں بھی خیانت کی جو عبداللہ نے شہزادے کو بھیجی۔ آخر کار عبداللہ نے اس کی شکایت کی۔ اورنگ زیب نے اسے واپس بلا لیا اور قید میں ڈال دیا اس کی جگہ قاضی عزیز کا تقرر ہوا۔[98]

اورنگ زیب کے نائب سلطان ہونے کے صرف ایک ہی سال بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو اس کی تحکم پسندی اور حوصلہ مند مزاج کا غماز ہے۔ 1637ء میں عبداللہ قطب شاہ نے ملا مقیم کو شہزادے کی خدمت میں دولت آباد بھیجا۔ اور اپنی طرف سے تین ہاتھی معہ نقرئی ہودج اور کچھ تحفے بھیجے، لیکن اورنگ زیب نے قبول کرنے سے انکار کیا کہ یہ تحفہ جات اس کو توقع کے خلاف تھے۔ اس انکار نے عبداللہ کو مجبور کیا کہ وہ دو ہاتھی، ایک لاکھ ہن مقررہ خراج سے اور ایک بڑا ہیرا جو وہ پہلے شہنشاہ کو بھیجنا چاہتا تھا یہ سب اس نے اورنگ زیب کو بھیج دیے۔ اس بار شہزادہ نے مطمئن ہو کر تحفے قبول کیے۔ اس طرح سے گولکنڈہ کے بادشاہ کی کھال ہر ادنیٰ موقعہ اور ہر بہانہ سے کھینچی گئی۔

میر حفیظ اللہ کی سفارت

1637ء کی ابتدائی جولائی میں ایک شاہی سفیر میر حفیظ اللہ گولکنڈہ پہنچا۔

حسب معمول اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ 28/ جولائی کو وہ بادشاہ کی حضوری میں پیش کیا گیا۔ اس نے چند میناکاری کے برتن اپنے آقا کی طرف سے عبداللہ قطب شاہ کو نذر کیے۔ پیشوا شیخ محمد نے اس کی بڑی شاندار دعوت کی۔ اس کی واپسی حسب ہدایت شاہجہاں آنے والے نومبر میں ہوئی۔ قطب شاہ نے اس کو 4 ہزار ہن اور ایک ہیرا ساٹھ رتی وزن کا بادشاہ کے لیے دیے۔ لیکن بدقسمتی سے عبداللہ کے سفیر مرزا محمد جوہر کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے میر حفیظ اللہ کو رکنا پڑا۔ اور وہ جنوری 1638ء سے پہلے روانہ نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ مرزا ناصر تھا۔ اس کے بعد 1640ء میں شافیہ شاہجہاں کا سفیر ہو کر آیا۔ دس مہینے کے قیام کے بعد دسمبر میں اسے واپس جانے کی اجازت ملی۔ میر فصیح الدین اس کے ساتھ شہزادے اورنگ زیب کے پاس گیا۔ دو لاکھ ہن اور قیمتی تحفے اس کے لیے بھی لے گیا۔[100]

1640ء میں نظام الدین احمد عبداللہ قطب شاہ کی اپنی تاریخ ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سے گولکنڈہ سلطنت کی اطلاعات منتشر صورت میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ دہلی اور حیدرآباد درباروں کے تعلقات رسمی طور پر قائم تھے، حقیقتاً خوشگوار نہ تھے۔ برابر بقایا خراج کی شکایت اور ادائیگی نہ ہونے پر سخت گیری کی دھمکی دی جاتی تھی۔ چنانچہ جب شائستہ خان دکن کا ناظم تھا اور اس نے بھی واجب الادا بقایا کی یاددہانی کے لیے عبداللہ کو لکھا، عبداللہ نے جواب میں لکھا کہ بقایا ادا کرنے کا میں خاص خیال رکھوں گا۔ فی الحال دو لاکھ ہن بھیجے جا رہے ہیں باقی رقم بھی جلد ہی ادا کر دی جائے گی۔ واضح رہے کہ بقایا صرف زر مبادلہ کی قیمت کے اختلاف کی وجہ سے تھا۔[102]

اورنگ زیب کی نیابت سلطانی دوسری بار

جب اورنگ زیب دوسری بار 1653ء دکن میں نائب سلطان ہو کر آیا تو اس کا رویہ قطب شاہ کے ساتھ اور سخت ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ بقایا فوراً ادا کیا جائے

ورنہ وہ اپنے علاقہ کا ایک حصہ چھوڑ دے۔ جیسے کہ سالانہ باج گزاری کا بوجھ دو لاکھ ہن کافی نہ تھا۔ شہزادے نے اب اس بقایا کا تقاضا کیا جو زر مبادلہ کی قیمت کی کمی بیشی سے گزشتہ تمام سال میں ہوا تھا۔ اس طرح قطب شاہ کے کاندھے پر بیس لاکھ روپیہ کا مزید بار ڈالا گیا۔ ایک اور بھی وجہ شکایت کی یہ پیدا کی گئی کہ بغیر اجازت عبداللہ نے کرناٹک کا علاقہ کیوں فتح کیا؟ ان سب باتوں کو ہوا دینا میر جملہ کا معاملہ تھا۔

گولکنڈہ پر چڑھائی

ظاہر ہے عبداللہ قطب شاہ ان بعید از قیاس مطالبات کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے شہنشاہ اور شاہزادہ دونوں کا عتاب نازل ہوا۔ نازک صورت اس وقت پیدا ہوئی جب 21/ نومبر 1655ء میں میر جملہ کے خاندان اور اس کے لڑکے محمد امین کو نافرمانبرداری کے الزام میں اس نے قید کر دیا۔ اورنگ زیب نے فوراً اس بات کی شکایت اپنے باپ سے کرتے ہوئے گولکنڈہ سے جنگ کی منظوری کی درخواست کی۔ شاہی احکام کی منظوری کی امید پر اس نے اپنے بیٹے محمد سلطان کو ناندار میں فوج اکٹھا کرنے کا حکم دیا۔ اس درمیان میں اس نے اپنے باپ کا فرمان عبداللہ قطب شاہ کے پاس بھیجا۔ اس کو حکم دیا گیا کہ میر جملہ کے خاندان کو رہا کر دے اور اس کو شاہی دربار تک آنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ اس لیے کہ وہ 5 ہزار کا منصب دار ہے۔ قطب شاہ نے ان احکام پر توجہ نہ کی۔ اورنگ زیب نے اپنے لڑکے کو گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ محمد امین کو رہا کر کے اس کے پاس بھیج دیا گیا تھا لیکن پھر بھی شہزادے محمد نے چڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ وہ حیدر آباد پہنچ گیا اس کو لوٹا مارا اور غارت کیا۔

عبداللہ گولکنڈہ بھاگ گیا اپنے کو قلعہ میں اس نے محفوظ کر لیا وہ روزانہ شہزادے محمد کے پاس سفیر بھیجتا تھا۔ اطاعت اور صلح کی درخواست کرتا تھا۔ لیکن

آخر الذکر بغیر باپ کے آئے ہوئے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب 6/ فروری 1656ء کو آیا اور اس نے گولکنڈہ کا محاصرہ کرنا شروع کیا۔ اس درمیان میں عبداللہ نے ایک طرف تو اورنگ زیب کو راضی کرنے کی پوری کوشش کی اور دوسری طرف شہنشاہ اور اس کے ولی عہد دارا کو خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ باوجود اورنگ زیب کے اس پر جوش درخواست کے کہ گولکنڈہ کا الحاق کر لیا جائے ۔ شاہجہاں نے لڑائی ختم کرنے اور صلح کا حکم دیا۔ بادشاہ کے حکم بجا آوری کے پیش نظر اورنگ زیب نے 3/ مارچ کو محاصرہ اٹھا لیا لیکن باوجود 1656ء کے معاہدہ کے گولکنڈہ اور دہلی میں کشمکش جاری رہی۔ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شاہانہ پالیسی آگے[103] بڑھائی۔

باب 8

ماوراالنہر

<u>مغلان اعظم کے حوصلے</u>

آباو اجداد کے ممالک واپس لینے کے خواب نے ہندوستان کے مغلیہ حکمرانوں کے خیال کو 16 ویں اور سترہویں صدی میں مشتعل کر دیا۔ چونکہ ان لوگوں کی رگوں میں تیمور کا خون تھا۔ اسی لیے انہوں نے خیال کیا کہ ماوراالنہر ان کا قانونی ورثہ تھا۔ شمال کے اس بنجر علاقہ کو انہوں نے ہمیشہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ سمرقند اور بخارا کو واپس لینے کے لیے بابر نے اپنے مذہبی[1] شعور کو بھی قربان کر دینے میں دریغ نہ کیا۔ ہمایوں کی نقل و حرکت بدخشاں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اکبر کو عبداللہ خان ازبک ایسے زبردست حکمراں کا سامنا تھا اس لیے وہ صوبہ کابل سے آگے قدم نہ اٹھا سکا اور جب دکنی لڑائیوں سے اسے فرصت ہوئی تو اس کا ذہن اپنے بیٹے کی بغاوت پر مرکوز ہو گیا۔ جہانگیر نے ورثہ میں باپ[2] کا حوصلہ پایا تھا لیکن عملی ذہانت نہ ملی تھی۔ پہلے خسرو کی بغاوت اور اس کے بعد اندرونی معاملات کی محویت نے باہر کے کسی علاقہ کو قبضہ میں لانے کی اجازت نہ دی۔ اس لیے اس کے عہد حکومت میں ماوراالنہر کے دوسرے حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔

استراخانان

اس وقت یہ ملک استر خانان کی زیر حکومت تھا۔ یہ لوگ چنگیز خان کی اولاد کی ایک شاخ میں سے تھے۔ دو صدی تک یہ گمنامی میں رہے۔ آخر کار ان کے افتراق یا غالباً روسی امراء کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لیے کوئی نئی سرزمین تلاش کریں۔ اور یار محمد خان معہ اپنے لڑکے جانی خان کے ترک وطن کر کے ماوراالنہر[3] چلا گیا۔ یہاں ان کا خیر مقدم شیبانی اسکندر خاں نے کیا اور اپنی لڑکی زہرہ خانم کی شادی 1567ء میں یار محمد سے کر دی۔ اس کے بعد سے استر خانیوں نے اپنے کو اس نئے وطن کی سیاست سے وابستہ رکھا۔ قسمت کی بہت سی الٹ پھیر کے بعد یار محمد کے ایک پوتے کا پوتا امام قلی 1611ء میں سمرقند کے تخت کا مالک ہو گیا۔ شاہانہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد امام قلی نے اپنے بھائی نظر محمد سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا۔ س کو[5] بلخ کا علاقہ سپرد کیا۔

امام قلی کا رویہ جہانگیر کے ساتھ

جب شاہ عباس اول نے قندھار فتح کیا 1622ء امام قلی نے عبدالرحیم خواجہ کو مغلیہ دربار میں بھیجا اور پیشکش میں کہلا بھیجا کہ اگر شہزادہ شاہجہاں کی قیادت میں اس صوبہ کو آپ واپس لینا چاہیں تو میں اتحاد عمل کے لیے تیار ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے متحدہ فوجوں سے خراسان فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں اس نے بتایا کہ مفتوحہ علاقہ دونوں شرکت کرنے والی جماعتوں میں تقسیم ہو جائے۔ لیکن یہ منصوبہ کبھی عمل میں نہ آ سکا۔ عبدالرحیم لاہور میں ٹھہرا رہا اور جہانگیر کے انتقال کے بعد کے واقعات دیکھنا چاہتا تھا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد آگرہ آیا۔ بہت اعزاز کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا۔ نئے شہنشاہ نے اس کا اتنا احترام کیا کہ اس کی سفارش پر عبداللہ خان فیروز جنگ کی خطائیں معاف کر کے باعزت اس کی جگہ پر بحال کر دیا[6]۔

نظر محمد کا کابل پر حملہ

امام قلی ایک صلح پسند بادشاہ تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہ کی کہ مغل شہنشاہ کے تعلقات خراب ہوں۔ لیکن اس کا بھائی نظر محمد بے قرار امنگوں کا آدمی تھا۔ بلخ کا باج گزار علاقہ اس کی تگ ودو کے لیے بہت کم تھا۔ لیکن اپنے فراخ دل بھائی یا طاقت ور شاہ ایران سے ٹکر لینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اتفاق سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک ایسا طوفان آیا کہ اس کو بڑا اچھا موقعہ اپنے علاقہ میں اضافہ کرنے کا ملا۔ جہانگیر کے جانشینی کے لیے شہریار اور داور بخش نے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ مغلیہ دربار انتشار کا مرکز بن گیا۔ علاوہ بریں اس موقعہ پر مغلیہ اقتدار کابل میں بڑی نیچی سطح پر آ گیا تھا کیونکہ سرحدی قبائل نے مغلیہ فوج پر ایک مصیبت ڈھا دی تھی۔ ان حالات میں باوجود بڑے بھائی کی مخالفت ونصیحت کے نظر محمد نے کابل فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

اس نے اپنے لڑکے عبدالعزیز کو اس کے اتالیق عبدالرحمٰن بی کے ہمراہ بطور ہراول بھیجا۔ وہ کوچ کرتے ہوئے ضحاک تک پہنچے اور مغلیہ سپہ سالار خنجر خان کو قریب قریب اچانک پالیا لیکن آخر الذکر نے اطمینان سے قلعہ کے تحفظ کا انتظام کیا اور جب ازبک کا ہراول دستہ قلعہ کے پھاٹک سے قریب ہوا، تو باہر نکل کر اس نے سب کو مار بھگایا۔ دوسرے روز یعنی 8/ مئی 1628ء کو نظر محمد خاص لشکر لے کر اپنے بیٹے کی کمک کو آ گیا۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کی ناکامیاب کوشش کی۔ اس ناکامی نے اس مشتعل کر دیا۔ اس نے اپنے افسروں کی بری طرح خبر لی۔ ایک بار پھر اس نے اپنی فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ایک بڑے پیمانے پر حملہ کیا۔ لیکن خنجر خان نے اسے شدید نقصانات کے ساتھ پسپا کر دیا۔ اب چونکہ ضحاک میں ذرا بھی وقت ضائع کرنے کا موقع نہ تھا اس نے اس اس مقام کی تسخیر اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جب تک کابل نہ فتح کر لے۔ نظر محمد نے محاصرہ اٹھالیا اور آگے بڑھ گیا۔

جب اس نے دیکھا کہ غوربند اور چاری کاراں کے راستے اس کے لیے بند ہو گئے ہیں تو وہ سیاہ سنگ کے راستے سے برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا۔ عیاری اور طاقت کے ساتھ وہ پام غان میں داخل ہوا اور بے رحمی کے ساتھ پورے ضلع کو برباد کر دیا۔ دوسرے کوچ میں وہ کابل سے دس میل کے فاصلے پر رک گیا۔ یہاں سے اس نے شاہی حکام کو خطوط بھیجے۔ ان سے دلفریب انعامات کا وعدہ کیا اور خوفناک انتقام کی دھمکی بھی دی۔ اس کے قاصد نظر خواجہ اور کل بابا محافظ دستہ کے نمایندوں سے دہلی دروازہ پر ملے۔ انہوں نے خط کا مذاق اڑایا اور صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہٹیں گے۔ شہنشاہ کی وفاداری کا اظہار کیا اور قاصدوں کو جواب دیا کہ وہ اپنے آقا سے واپس جانے کی درخواست کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اس شاہی فوج کے ہاتھوں ان کا برا انجام ہو، جو تیزی سے کمک کے لیے آ رہی ہے۔

لیکن اس انتباہ کا اثر نظر محمد پر کچھ نہ ہوا۔ کیونکہ اس کا ارادہ تھا کہ ہندوستانی کمک کی آمد سے پہلے ہی اپنا کام مکمل کر لے۔ وہ شہر کابل کی طرف اس لیے بڑھا کہ قلعہ کا محاصرہ کرے۔ 29/ مئی 1628ء اس کے خبر رساں سپاہی نہر فتح کے کنارے اور بی بی ماہ رو پر نظر آئے۔ شاہی فوجیوں نے دیہہ افغانان کے ٹیلے اور مہدی خواجہ کے مقبرے پر اپنے کو اس طرح جما لیا کہ مخالف فوج کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ ملے۔ دونوں فوجوں میں دن بھر جھڑپیں ہوتی رہیں۔ شام کو مغل قلعہ میں چلے گئے۔ اب راستہ صاف دیکھ کر نظر محمد شہر میں داخل ہو گیا اپنے قیام کے لیے اس نے عبدالرحمٰن بیگ ترنابی کا گھر منتخب کیا۔ یہ مقام قلعہ کے شمال میں تھا۔

دوسرے دن اس نے خندقوں سے قلعہ کے محاصرہ کی ابتدا کی محافظ دستہ حملہ آوروں پر زبردست آتشباری کر کے ڈرانے کی کوشش کی لیکن دشمن بے خوف و ہراس خندقوں کا جال پھیلاتا رہا۔ آخر کار وہ قلعہ کی خندق کے بہت

قریب پہنچ گیا اس نے توپ لگا کر قلعہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس یورش نے محافظ دستے کو ڈرا دیا۔ کیونکہ وہ لوگ محاصرہ کے لیے پوری طرح تیار نہ تھے نہ اتنے آدمی تھے نہ غلہ تھا کہ صورت حال برقرار رکھی جائے۔ روز بروز حالت نازک ہوتی جاتی تھی۔ آخر کار خواجہ ابوالحسن کا ایک مقلد میر موسیٰ قلعے سے باہر نکلا۔ محمد باقی نے قلماق کی خندقوں کو بے کار کر دیا بڑی تعداد میں ازبکوں کو قتل اور ان کے توپ خان کو پامال کر دیا۔

شاہجہاں کا اقدام

اس درمیان میں کابل کے حملے کی خبر بڑی تیزی سے دربار میں پہنچی۔ 27/ جو 1628ء کو شہنشاہ نے مہابت خان کو حکم دیا کہ فوراً محافظ دستہ کی کمک کے لیے روانہ ہو جائے۔ لیکن کابل کے نئے گورنر لشکر خان نے جس نے حال ہی میں اپنا عہدہ سنبھالا تھا راستہ میں خبر سنی تو اپنی رفتار تیز کر کے وہ پیشاور پہنچا۔ اپنے لڑکے سزاوار خان کو ایک فوجی دستہ دے کر آگے بھیجا۔ ظفر خان کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ جائے۔ لشکر خان خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ خطرناک صورت حال کو محسوس کر کے اس نے مہابت خان کے آنے کا انتظار نہ کیا۔ جلال آباد کی طرف بڑھتا گیا وہاں سے نیرولا پہنچا۔ یہاں ظفر خان کے آدمی اس کو مل گئے۔ انہوں نے آرام کرنے کی رائے دی یہ تجویز اس نے رد کر دی اور گندامک کی طرف بڑھا۔ یہاں پہنچ کر وہ دو روز اس لیے رکا کہ اپنا بندوبست مکمل کرے۔

نظر محمد کی پسپائی

یہ سن کر کہ شاہی فوج کابل سے چوبیس میل کے فاصلے پر "باریک آب" پہنچ آئی ہے نظر محمد نے محاصرہ اٹھا لیا۔ بلگرام کی طرف واپس ہوا تا کہ لشکر خان سے جنگ کرے۔ آخر الذکر بلخ کے سردار سے تیغ آزمائی کا بے حد مشتاق تھا۔ فوراً ہراول دستہ سے جا ملا۔ لشکر خان کی تیزی نے نظر محمد کو خوف زدہ کر دیا اور اب اپنی نازک حالت کا اسے احساس ہوا۔ وہ ایک غیر ملک میں تھا اس کی فوج

سمندری قزاقوں اور کرائے کے سپاہیوں کا اجتماع تھی جو صرف اسے لیے جمع ہو گئے تھے کہ غارت گری کا زرین موقعہ تھا۔ محاصرہ شروع ہوتے ہی اس میں سے بہت سے لوگ اپنی لالچ آسودہ کرنے کے لیے ادھر ادھر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظر محمد کی فوج خالی ہو گئی۔ ایسی فوج لے کر مغلوں کی منظّم و مرتب فوج کا مقابلہ کرنا شکست سے ہمکنار ہونا تھا۔ علاوہ بریں ضحاک کی چوکی اب تک مقابلہ کر رہی تھی اور اگر شکست اس کو ہوتی تو محافظ دستہ اس کے پسپا ہونے کا راستہ بھی کاٹ دیتا۔ ان سب باتوں کو سوچ کر نظر محمد نے فیصلہ کیا کہ جنگ کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ 28/اگست 1628ء کو اپنے ملک کی طرف واپس ہو گیا۔ لشکر خان ایک ہفتہ بعد[8] کابل میں داخل ہوا۔

نظر محمد کے پسپا ہونے کی خبر مہابت خان کو سر ہند میں دی گئی۔ وہ یہاں رک گیا کہ شہنشاہ کا حکم اب کیا ہوتا ہے۔ شہنشاہ نے اسے واپس آنے کا حکم دیا اور معتقد خان کو مرحوم بادشاہ کے حرم کو لانے کے لیے لاہور بھیجا۔ حملہ آوروں کی عائد کردہ مصیبتوں سے ساکنان کابل کو چھٹکارا دلانے کے لیے شہنشاہ نے ایک لاکھ روپیہ حاجت مندوں اور غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجا۔

کابل پر نظر محمد کے ناکام حملے کے باوجود اس کے بھائی امام قلی سے دوستانہ تعلقات رکھنے میں شاہجہاں کو کوئی امر مانع نہ ہوا۔ چنانچہ 3/نومبر 1628ء کو اس نے حکیم حاذق کو سفارتی مقصد کے ساتھ بخارا کے دربار میں بھیجا۔ اس کے ساتھ محمد صدیق خواجہ ابن متوفی عبدالرحیم خواجہ بھی گیا۔ جو تحفہ جات بھیجے گئے ان میں جواہرات اور دوسرے ہندوستانی مالیتی ڈیڑھ لاکھ روپیہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ 30 ہزار روپیہ صدیق خواجہ کو اور دس ہزار روپیہ اس کے چچا حسن خواجہ کو بھیجے گئے۔

امام قلی کے پاس سفیر بھیجا گیا

امام قلی کو جو خط بھیجا گیا اس میں کئی باتوں کا ذکر آتا ہے مثلاً جہانگیر کے نام

جو خط امام قلی نے بھیجا تھا اس کی رسید عبدالرحیم خواجہ کا رک جانا، اس کا آگرہ پہنچنا، اس کی وفات، بعد ازاں یہ بھی لکھا ہے کہ شہنشاہ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی ایک سفیر بھیجنا چاہتے تھے لیکن خواجہ کی اچانک موت نے معذور رکھا۔ کابل پر نظر محمد کا بے وجہ حملہ کرنا اور شاہی افواج کے ہاتھوں اس کے ہار جانے کا ذکر کرنے کے بعد یہ خط اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اگر اس کی (نظر محمد کی) ناعاقبت اندیشی سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو تو اس کے دور کرنے اور دونوں حکومتوں میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لیے وہ حکیم حاذق کو روانہ کر رہا ہے[9]۔

شاہجہاں کے یہ عمل ور جحان جو ایسے موقع پر ظہور میں آئے بڑی دور اندیشی پر مبنی تھے۔ شمالی سرحد پر امن کی ضرورت تھی اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ نظر محمد اپنی خطر پسندی کا اعادہ کرے۔ مغلوں اور ماوراالنہر کے حکمرانوں کے دیرینہ خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنے کی خواہش اور امام قلی کو خوش اخلاقی سے خط لکھنے سے شاہجہاں کا مقصد یہ تھا کہ نظر محمد اپنی قوم میں چشم ملامت سے دیکھا جائے اور وہ کوئی ہمدردی یا امداد بخارا دربار سے نہ حاصل کر سکے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ تحریر اس کے لیے آگاہی کا بھی کام دے۔ دہشت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے مئی 1629ء میں شاہی افواج نے اس استراخانی سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا جو بامیان[10] میں تھی۔

نظر محمد صلح کرتا ہے

اس تحریک کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ نظر محمد خاموش ہو گیا۔ کہہ سکتے ہیں کہ مغل شہنشاہ کے لیے اس نے منفی رویہ اختیار کر لیا۔ لیکن یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی کہ بعد میں اس نے دوستانہ تعلقات کیوں قائم کیے۔ 1632ء میں اس نے وقاص حاجی کو مغل دربار میں بھیجا۔ وہ اسی سال کی 8/جولائی کو دربار میں حاضر ہوا۔ شہر آگرہ کے باہر اس کا استقبال معتمد خان نے کیا۔ اس کو شہنشاہ کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوئی۔ اس سفیر نے اپنے آقا کی طرف سے

شاہجہاں کو گھوڑے، اونٹ، اور بلخ کی دوسری چیزیں نذر کیں۔ ان سب کی قیمت 15 ہزار روپیہ تھی۔ شہنشاہ نے اس دن اس کو ایک اعزازی خلعت، ایک جواہرات سے مرصع تلوار قیمتی چار ہزار روپیہ عنایت کی[10]۔

تربیت خان کا مقصد

دوسرے سال فروری 1633ء میں شاہجہاں نے تربیت خان کو بطور جوابی سفیر نظر محمد کے دربار بھیجا۔ اس موقع پر جو خط اس کو بھیجا گیا اس میں دکنی فتوحات کا مختصر تذکرہ ہے۔ وہاں کے متعدد قلعہ جات پر قبضہ کرنے کا بھی ذکر اختصار کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد شاہجہاں اس کی مبارک باد کو قبول کرتا ہے جو اس کی تخت نشینی کے سلسلے میں کسی قدر تاخیر سے پہنچی اور اس عفو تقصیر کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو کابل پر حملہ کرنے کے سلسلے میں سفیر نے زبانی پیش کی۔ اس کے بعد شاہجہاں نظر محمد پر اعتراض کرتے ہوئے شکایت کرتا ہے کہ میری تخت نشینی کی خبر سننے کے بعد تم نے کابل پر بلاوجہ حملہ کیا اپنے ہی ہم مذہب کے ملک پر حملہ کرنا نامعقول رویہ تھا خط ختم ہونے کے بعد ہی ہگلی کی تسخیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے[12]۔

شاہجہاں کا کابل جانا

اس کے بعد کے چھ سالوں تک سفیروں کا تبادلہ دونوں درباروں میں اکثر ہوا۔ فروری 1639ء میں شاہجہاں لاہور سے کابل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل مقصد ماوراالنہر کی سڑکوں اور دوسرے خبر رسانی کے رابطوں کا پتہ چلانا تھا۔ اس نے اپنے جانے سے پہلے شہزادہ دارا کو ایک بڑی فوج اور محاصرہ کرنے والی توپوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ توشیر اپر شاہجہاں نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس پچاس ہزار فوج ہے۔ کابل پہنچ کر سعید خان کو حکم دیا کہ ان سرحدی قبائل کو زیر کرے جن کو کاہ مرد کے گورنر پلنگ توش نے نظر محمد کے ارشارے پر اپنالیا تھا۔ شاہجہاں کی کابل میں موجودگی اور اس کے جارحانہ انداز نے فطری

طور پر امام قلی اور نظر محمد کو چونکا دیا۔ ان لوگوں نے کم مایہ تحفے اور خراسان فتح کرنے میں اپنے اتحاد عمل پیش کرنے کے لیے اپنے سفیر بھیجے۔ لیکن ابھی اس اقدام کا معقول وقت نہ آیا تھا۔ اس لیے قاصدوں کو موافق جوابات دے کر شاہجہاں 15/ اگست 1639ء کو لاہور واپس آیا۔

ماوراءالنہر میں سیاسی انقلابات

لیکن چند مہینوں میں ماوراالنہر کے سیاسی معاملات پر دور رس انقلابات اثر انداز ہوئے۔ ان سے باخبر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ مغل شہنشاہ کے اس رجحان کی تشکیل کا اندازہ ہو سکے جو استراخانیوں سے وابستہ تھا۔ طولانی حکومت جو قدرت نے زیادہ لوگوں کو اس ملک میں عطا نہیں کی وہ امام قلی کو نصیب ہوئی۔ بالآخر وہ آشوب چشم میں مبتلا ہوا اور تھوڑے ہی دن میں اندھا گیا۔ بھائی کی بد قسمتی نظر محمد کی خوش قسمتی ہو گئی۔ اس نے انتظامی امور کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ امام قلی اپنے بھائی کی موافقت میں دستبردار ہونے کے خلاف نہ تھا لیکن جب اس نے اپنے حکام سے مشورہ کیا تو انہوں نے نظر محمد سے سخت تنفر کا اظہار کیا۔ اس کے بعد امام قلی نے جواب میں لکھا کہ ابھی کچھ دن تک انتظار کرو۔

لیکن نظر محمد بے چین تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے قاصد کو روک لیا اور اپنے لڑکے عبدالعزیز کو حصار اور سمرقند فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ بخارا کے امرا کو قابو میں لانا آسان ہے۔ لیکن آخر الذکر اپنے جوش و خروش میں امام قلی کو سمرقند لائے تاکہ نظر محمد کے منصوبے ختم ہو جائیں۔ بد قسمتی سے حصار جلد ہی فتح ہو گیا۔ اور اندھے حکمران کے ساتھیوں کا جوش بلبلے کی طرح ختم ہو گیا ان میں سے بہتوں کو نظر محمد نے ملا لیا اور امام قلی قریب قریب تنہا رہ گیا۔ بھائی کے سامنے سر جھکانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ 31/ اکتوبر 1641ء کو نظر محمد کے نام سے خطبہ پڑھا گیا۔

تین دن بعد امام قلی حج کے لیے مکہ روانہ ہوا۔ وہ ہندوستان ہو کر جانا چاہتا تھا

مگر جب نظر محمد نے اس راستہ سے جانے کی اجازت نہ دی تو وہ خراسان ہو کر گیا۔ نظر محمد کا کمینہ پن نہیں ختم ہوا اس نے اپنے بھائی کی ساری املاک ضبط کر لی۔ اس کی بیوی اے خانم کو روک لیا۔ شکاری کتے کی طرح مرتے دم تک اس کا پیچھا کرتا رہا اور آخر میں شاہ ایران سے قاصدوں کے ذریعہ یہ التماس کی کہ امام قلی کی امداد نہ کی جائے۔ شاہ ایران نے اس التماس پر اعتنانہ کی۔ اس نے پناہ گزیں کا خیر مقدم کیا۔ حسن سلوک سے پیش آیا۔ اس کے حصول مقصد میں ہر طرح کی مدد کی۔ امام قلی نے 62 سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں انتقال[15] کیا۔

نظر محمد نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگرچہ وہ اپنے بھائی کی سلطنت پر قابض ہو گیا ہے لیکن اس کو وہ عزت نصیب نہیں ہوئی جو عوام مین اس کے بھائی کی تھی۔ انتظامی امور کی سخت گیری نے لوگوں کو اس سے بیزار کر دیا۔ اس نے نااہل افسروں کو برطرف کر دیا۔ یہ بھی کوشش کی کہ جاگیر دارانہ نظام ختم کر کے اس کی جگہ نقد روپیہ دے دیا جایا کرے۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ سیورغال اپنے ہاتھ میں لے کر مذہبی پیشواؤں کو بھی ناراض کر دیا۔ اس کے خلاف جذبات بڑی تیزی سے مشتعل ہوئے لیکن مخالفت اس وقت تک پس پردہ بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے خوارزم کے حکمران اسفندیار خان کے مرنے کے بعد خوارزم فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی۔ اس کے لڑکے بہرام سلطان کے اتالیق بافیوض نے تاشقند میں فوراً علم بغاوت بلند کیا۔ یہ تحریک اس آگ کی ابتدا ثابت ہوئی جو اس کی ساری سلطنت میں پھیل گئی۔

نظر محمد نے اپنے دیوان بیگی عبدالرحمٰن کو بغاوت ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ تاشقند پہنچ کر اس نے عیاری سے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ سن کر بافیوض خوبند پہنچا اور امام قلی کے ایک پوتے سنجر کے 'خان' ہونے کا اعلان کر دیا۔ نظر محمد نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے عبدالعزیز کو روانہ کیا۔ عبدالعزیز خجد روانہ ہوا۔ اس نے 15 دن تک قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں میں جھگڑا

شروع ہو گیا۔ بخارا کی فوج باغیوں کی تحریک سے متفق ہو گئی اور عبدالعزیز سے مطالبہ کیا کہ ان کی مخالف بلخی فوج کو برخواست کر دے اور اپنے کو خان بخارا ہونے کا اعلان کر دے۔ عبدالعزیز نے چاروناچار یہ تجویز مان لی۔ اپریل 1645ء میں اس کے نام سے "اور تپا میں" خطبہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد وہ سمرقند چلا آیا۔

نظر محمد کا زوال

ان حالات کی اطلاع نظر محمد کو قرشی میں ملی۔ چونکہ عبدالعزیز اور اس کے جنگجو ساتھیوں نے پہلے ہی بخارا لوٹ لیا تھا اس لیے پناہ لینے کے لیے وہ بلخ گیا۔ عبدالعزیز بخارا اور سمرقند کی خانیت" سے آسودہ نہ ہوا اس نے چاہا کہ اپنے باپ سے جتنا علاقہ وہ چھین جھپٹ کر لے سکے لے لے۔ چنانچہ اس نے حصار اور "چار جو، کی تسخیر کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ نظر محمد نے ان مقامات کو بچانے کے لیے سبحان قلی اور عبدالرحیم کو بھیجا لیکن اسی درمیان میں کاہ مرد پر مغلوں کے قبضہ کر لینے سے اس کے سامنے ایک نیا خطرہ آ گیا۔ اس نے سبحان قلی اور عبدالرحیم دونوں کو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے واپس بلا لیا۔

شاہجہان کی پیش قدمی

ماوراء النہر کے تنازعات پر مغلیہ شہنشاہ معاندانہ مسرت سے نظریں ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنے آباواجداد کے ملک لینے کا منصوبہ اس طرح تیار کیا کہ پہلے وہ بدخشاں پر قبضہ کر لے۔ اس ارادہ کے تحت 28/ مارچ 1645ء کو اس نے اصالت خان کو کابل بھیجا تاکہ وہ امیر الامراء علی مردان خان کے مشورے سے مناسب انتظام کرے۔ دوسرے افسروں کا ایک حصہ بھی ساتھ ہی روانہ کیا۔ ان میں سے بعض افسروں کے نام یہ ہیں۔ مثلاً بہادر خان، رستم خان، قلیچ خان، نجابت خان نظر بہادر، رائے سنگھ وغیرہ۔ ان کے بھیجنے کا منشاء یہ تھا کہ وہ امیر الامراء کی مدد کریں، کیونکہ اسی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اپنے لحاظ سے موقع و محل وانتظام مرتب[17] کر لے۔

کاہمرد کی فتح اور شکست

جون 1645ء کی ابتداء میں غور بند کے تھانیدار خلیل بیگ نے کابل آکر اصالت خان کو بتایا کہ کاہمرد کی تسخیر اس وقت آسان ہے کیونکہ اس کا سپہ سالار تروی خان، عبدالعزیز خان سے حصار بچانے کی مہم پر سبحان قلی کے امداد کے لیے گیا ہے۔ محافظ دستہ کی تعداد بہت کم ہوئی ہے۔ امیر الامراء کے مشورہ سے اصالت خان نے ایک ہزار فوج خلیل بیگ کے زیر قیادت کر دی۔ وہ کاہمرد پہنچا اور بغیر زیادہ کاوش کے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اپنی ناتجربہ کاری و غرور سے اس نے قلعہ کو پوری فوجی حفاظت سے محفوظ نہ کیا۔ صرف پچاس سوار اور چند بندوقچی چھوڑ کر ضحاک واپس چلا گیا۔ اس درمیان میں جب نظر محمد نے مغلیہ جارحانہ اقدام کی خبر سنی تو اس نے اپنے افسروں کو مدافعت کے لیے روانہ کیا۔ عبد الرحمٰن اور تروی علی نے مختصر سے محافظ دستہ کو بھگا کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے پسپا ہونے والوں پر حملہ کر کے اکثر سپاہیوں کو مجروح کر دیا۔

اصالت علی کی ناکام کوشش

آنے والے واقعات کی نوعیت سے بے خبری میں اصالت علی کاہمرد کی فوری تسخیر سے پر ہمت ہو کر 2/اگست 1645ء کو بدخشاں کی مہم کے لیے کابل سے چل پڑا۔ ایک ہفتہ بعد علی مردان اپنی فوج لے کر اس کی امداد کو گیا۔ اس نے ہندوستان سے مزید کمک آنے کا بھی انتظار نہ کیا کیونکہ اس نے سوچا کہ یہ کمک بہت دیر میں آئے گی۔ راستہ میں ان کو کاہمرد نکل جانے کی خبر ملی لیکن وہ لوگ غور بند کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ اس مقام پر خلیل بیگ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مہم جاری رکھنے کی ناممکنات پر زور دیا کیونکہ بدخشاں کی سڑکیں تنگ اور غذا اور چارہ حاصل کرنے کی صورتیں ناپید ہیں۔ شاہی فوج موسم سرما کی آمد سے خوفزدہ تھی اس لیے سرحد کے بعض علاقوں پر لوٹ مار کر کے وہ لوگ کابل واپس چلے آئے۔

جگت سنگھ کی تگ ودو

اس کے بعد راجہ جگت سنگھ نے مغل عظمت کی بحالی کے لیے ایک مردانہ وار کوشش کی۔ امیر الامراء کی اجازت سے 15/ اگتوبر 1645ء کو کابل روانہ ہوا اور تل کی تنگ گھاٹی سے خوست میں داخل ہوا۔ اس کے بعد وہ سراب کی طرف چل پڑا۔ یہاں زبردست برفباری نے اسے تین دن روک رکھا۔ مقامی باشندوں کی تجویز سے "سراب" اور اندر آب" کے درمیان اس نے ایک جگہ منتخب کی ایک لکڑی کا قلعہ اور پتھر کی فصیل بنائی، دو کنویں بنائے تاکہ پانی کی رسد پوری طرح رہے۔ ابھی مشکل سے یہ تیاریاں مکمل ہوئی تھیں کہ کفش قلماق ایک زبردست فوج لے کر راجہ کو بھگانے کے لیے آگیا۔ لیکن راجہ بڑی بہادری سے لڑا۔ اس نے قلعہ بچالیا دشمنوں کو بھگا کر پنج[18] شیر واپس آیا۔

اپنے مقبوضات بچانے کی نظر محمد کی کوشش

اس زمانے میں نظر محمد بڑی دشواریوں میں تھا۔ اس کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ دراصل امن و چین ماوراالنہر میں مفقود ہو گیا تھا۔ غارت گروں کا جتھا ملک بھر میں اپنا کام کر رہا تھا۔ اپنی ستم گری میں وہ لوگ نہ عمر کا خیال کرتے تھے نہ مذہب کا۔ ایمان دار اور بے ایمان میں فرق بھی نہ کرتے تھے۔ حصار میں انہوں نے سید ابراہیم، ایک گوشہ نشین درویش کو معہ چار سو طلبا کے قتل کر دیا۔ بے حیائی سے قرآن مجید بھی جلاتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چنگیز خان کا دور پھر آگیا۔ بایں ہمہ حصار واپس لینے کی ایک آخری کوشش نظر محمد نے کی۔ اپنی ساری فوج وہاں بھیج دی۔ اس کے لڑکے عبد العزیز نے بھی مقبوضات کے لیے ایسا ہی کیا۔

مخالف فوجیں حصار قلعہ سے چند میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہوئیں۔ ایک غیر فیصلہ کن لڑائی سے دونوں طرف کی فوجوں میں بد دلی کی ایک نمایاں لہر پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ماوراالنہر کی "خانیت" معلق رہی۔ دونوں جماعتوں نے اپنے افسروں سے درخواست کی کہ وہ جلد سے جلد اس محاذ پر آجائیں کیونکہ یہ طے تھا

کہ اس دوڑ میں جیتنے والا ہی تاج و تخت کا مالک ہوگا۔ عبدالعزیز بڑی تیزی سے حصار کی طرف روانہ ہوا اس کی فوج کی اکثریت نے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ نظر محمد اپنے دوستوں کی احتیاطی رائے پر عمل کر کے بلخ میں رکا رہا۔ اس نے موقعہ کھو دیا عبدالعزیز نے اپنے تارہ دم سپاہیوں کی مدد سے ترمذ کا محاصرہ کیا۔ اسی مقام پر بلخ کے بعض سر بر آوردہ خواجگان نظر محمد کی طرف سے پیغام صلح لے کر آئے۔ عبدالعزیز اس پر راضی ہو گیا کہ بلخ اس کے باپ کے قبضے میں رہے۔ وہ بخارا کی طرف واپس گیا۔ لیکن یہ وقتی صلح تھی نظر محمد نے اپنی سلامتی کو خطرے میں دیکھ کر شاہجہاں سے امداد کی درخواست کی[19]۔

نظر محمد کا سفیر

11 / جنوری 1656ء کو اس کا سفیر نظر بی حضور شہنشاہ پیش کیا گیا اس نے اپنے آقا کا خط اور ساتھ ہی ساتھ وہ تحفے جو شہنشاہ کی خدمت میں بھیجے گئے پیش کیے۔ شاہجہاں خط پڑھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کیونکہ ایک ایسا موقعہ آ گیا تھا کہ وہ دنیا پر یہ ظاہر کر سکے کہ طاقتور کے مقابلے میں کمزور کی مدد کرنی چاہیے لیکن دراصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے خاندان کی ایک دیرینہ تمنا کا تصور کر رہا تھا۔ یہ تمنا اس کا نامور جد امجد اکبر بھی پوری نہ کر سکا تھا۔ موقع آ گیا تھا کہ اس کی شہنشاہیت نیک ارادوں کے سائے میں بڑھے اور کامیابی کی اس کو ساری امیدیں تھیں لیکن بد قسمتی سے ان مشکلات کا اندازہ اس نے بالکل غلط کیا جو تیمور کے ملک واپس لینے کی راہ میں حائل تھے۔ عین الخیال کی شان و شوکت نے اس کی آنکھوں کی چوندھیا دیا۔

شاہجہان کا جواب

اس نے فوراً نظر محمد کو جواب بھیجا جس میں اس کے خط پانے کی رسید تھی۔ لیکن عبارت کے مبہم ہونے اور ماورالنہر کی صحیح سیاسی حالت پر اس کی خاموشی کی شکایت بھی تھی۔ لیکن یہ معلوم کر کے یہ نظر محمد کے پاس بجز بلخ کے اب کچھ

نہیں اور اس ملک میں بغاوت کے شدید آثار پیدا ہو گئے ہیں شہنشاہ نے اپنا فرض سمجھا کہ بہ لحاظ دیرینہ دوستانہ تعلقات اور مذہبی یگانگت کے اس کی امداد کو چل پڑے۔ چنانچہ اس خیال سے اس نے لاہور چھوڑا کابل پہنچا۔ جہاں سے اس نے شہزادے مراد کو ایک زبردست فوج کے ساتھ بدخشاں بھیجا تاکہ غارت گروں سے ملک کو نجات دلائے اور اس کی (نظر محمد کی) ہدایات کا انتظار کرے۔ اس طرح امید سے بھی زیادہ[21] امداد کی درخواست پر شہنشاہ نے تیز رفتاری سے جواب دیا۔

مراد کی مہم

حقیقتاً شاہجہاں کو فی الحال اپنی فتح میں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ قاصد کے آتے ہی اس نے بڑے پیمانے پر تیاریوں کا حکم دیا۔ خوش قسمتی سے سلطنت میں اس وقت کامل سکون تھا۔ شہزادہ مراد اس مہم کا سپہ سالار تھا۔ اس کے ساتھ پچاس ہزار سوار دس ہزار پیدل مع بندوق اور توپ چلانے والوں کے تھے۔ قریب قریب حکومت کے سارے مشہور فوجی افسران اس کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے۔ فوج حسب دستور سات حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ قلب فوج کا سپہ سالار شہزادہ تھا۔ اس کی نیابت میں علی مراد خان اور نجابت خان وغیرہ تھے۔ اور قلیج خان شاہ بیگ خان، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ وغیرہ کے زیر قیادت میمنہ تھا اور میسرہ کی لگام رستم خان، دولت خان وغیرہ کے ہاتھ میں تھی۔ داہنا فوجی دستہ اصالت خان، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ وغیرہ کے سپرد تھا اور بائیں پہلو پر ایک دستہ خلیل اللہ خان، راجہ پہاڑ سنگھ کی ماتحتی میں تھا۔ ہراول دستہ بہادر خان، وٹھل داس راؤ ستر سال ہاوا کی زیر نگرانی تھا اور قلب کا اگلا حصہ مرزا نوروز اور لہراسپ خان وغیرہ کے ہاتھ میں تھا۔ قلب کے اگلے دستے کو چھوڑ کر تخمیناً 2208، افسر ساری فوج میں تھے۔ یہ رعب دار فوج ۱۱ر فروری 1646ء کو کابل روانہ کی گئی۔

فوج کی ہدایات

حسب معمول شہنشاہ نے جنگ کرنے کی تفصیلات بتائیں۔ فوج کو کھکھروں کے علاقہ سے گزرنا ہے اور اٹک اور حسن ابدال ہو کر جانا ہے۔ کیونکہ ان اضلاع میں غذا اور چارہ کا کافی ذخیرہ مہیا ہو سکتا ہے۔ موسم بہار کی ابتدا میں جب کابل کی سڑک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتی ہے اس وقت شہزادہ اور اس کی فوج کا ایک حصہ پیشاور کے راستہ سے جائیں اور دوسرا حصہ زیرین بنگش ہو کر گزرے۔ کابل میں دونوں حصوں کے یکجا ہونے پر قولیج خان، خلیل اللہ اور مرزا نوزاد، کاہ مرد اور غور، پر حملہ کریں۔ وہاں سے پوری فوج بدخشاں میں داخل ہو۔ اس پر اور بلخ پر قبضہ کرے۔

اس فوجی ہدایات سے شاہجہاں کا اصل مقصد نمایاں ہوتا ہے یہ بالکل واضح ہے کہ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر سارا ماورالنہر قبضے میں آئے تو کم سے کم بدخشاں ضرور فتح ہو جائے۔ غالباً وہ اس پر رضامند تھا کہ بلخ نظر محمد کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔ آخر الذکر سے امید کی جاتی ہے کہ مغل شہنشاہ کی برتری تسلیم کرے گا لیکن اس کے افسروں کی بد دلی اور شہزادے کی ناعاقبت اندیشی نے سارا منصوبہ تباہ کر دیا۔

بد قسمتی سے شہزادہ مراد ابتدا ہی سے اپنے باپ کی طرح مہم کا دلدادہ نہ تھا۔ وہ سست رفتاری کے ساتھ روانہ ہوا۔ جس پر بادشاہ نے تیز رفتاری سے چلنے کی تنبیہ کی وہ 15/ مئی 1646ء کو کابل پہنچا اور 9 دن بعد بہادر خان اور اصالت خان کی قیادت میں ایک دستہ اس لیے روانہ کیا کہ تل سے برف ہٹا دے۔ خود وہ 26/ مئی کو کابل سے روانہ ہوا تین منزلیں طے کرنے کے بعد وہ چاری کراں پہنچا اس مقام سے قلیج خان اور دوسرے لوگ بھیجے گئے کہ غوری اور کاہ مرد پر قبضہ کریں۔ شاہزادہ خود بدخشاں کے لیے روانہ ہو گیا۔

قلیج خان کی کامیابی

قلیج خان اور اس کے فوجی ایک بڑے تنگ راستہ سے چلے یہ ممکن نہ تھا کہ پوری فوج ساتھ چل سکے اس لیے کئی حصوں میں تقسیم کردی گئی وہ غوربند پہنچا۔ پنج شیر کی نشیبی زمین سے داخل ہوئے اور کابل کی سرحد 13/ جون کو پار کیا۔ سرحد پر قلیج خان کو بلخ سے آتے ہوئے سرداروں سے معلوم ہوا کہ ماہ مرد کے محافظ دستے کو شاہی فوج کو نقل و حرکت کی کوئی خبر نہیں ان کے ڈرانے کے لیے قلیج خان نے خلیل بیگ کو احدیوں اور بندوقچیوں کا ایک دستہ دے کر محافظ دستہ پر اچانک حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ خلیل بیگ کے قلعہ تک آنے کا علم کسی کو نہ ہوا۔ محافظ دستہ نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے۔ قلیج خان 16/ جون کو یہاں پہنچا۔ دو روز کے قیام کے بعد غوری کی طرف بڑھا یہ مقام بھی کسی سخت لڑائی کے بغیر فتح ہو گیا[23]۔

اس اثناء میں شہزادہ مراد درۂ تل کی طرف بڑھا اور اصالت خان کی ماتحتی میں ایک دستہ فوجی دیکھ بھال کے لیے بھیجا۔ آخر الذکر نے پہاڑی پر چڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ راہ نشیب ڈیڑھ گز برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ علی مراد علی خان کے آدمیوں کو سڑک صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ سڑک اتنی چوڑی ضرور ہے کہ ایک بار برداری کا اونٹ اس پر سے گذر جائے۔ یہ کام آہستہ آہستہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 15/ جون سے پہلے شاہ پرست پہاڑی پار کر کے سراب داخل نہ ہو سکے۔ یہاں خسرو پناہ لینے کے لیے شہزادہ کے پاس آیا۔ پہلے اصالت خان نے اس کا خیر مقدم کیا۔ شہزادہ مراد نے اس کو دربار بھیج دیا۔

قندوز پر قبضہ

اب ساری فوج یکجا ہو کر چل پڑی۔ سراب اور ڈیہہ تاجیکان سے گزرتے ہوئے نارن پہنچی۔ یہاں سے ایک دستہ اصالت خان کی قیادت میں آگے روانہ کیا گیا کہ وہ دشمنوں سے قلعہ قندوز چھین لے۔ شاہ محمد قطغان نے جی بھر کر ضلع کو لوٹا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے مغلوں کی پیش قدمی کے خوف سے قلعہ

خالی کر گیا۔ اصالت خان کا راستہ بالکل صاف تھا۔ اس نے 22/جون کو قندوز پر قبضہ کر لیا۔ شہنشاہ نے راجا راج روپ کو وہاں کا سپہ سالار بنا دیا۔ باشندوں کی ہمت افزائی اور قبائل کی غارت گری کی تلافی کے لیے پچاس ہزار روپیہ ان لوگوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

شاہجہان کی ہدایات مراد کو

اس طرح بدخشان شاہ پرستوں کے قبضہ میں آگیا اور وہ بلخ کی مشرقی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں شہزادہ مراد کو شہنشاہ کا خط ملا۔ اس میں حکم تھا کہ نظر محمد سے اچھا سلوک کیا جائے۔ اگر وہ معقول و فرمانبردار رہے تو اس کو بلخ دے دیا جائے۔ مزید یہ کہ اگر نظر محمد کا ارادہ سمرقند بخارا کے لیے جنگ کرنے کا ہو تو شہزادہ کو اجازت ہے کہ وہ ہر طرح کی امداد کرے۔ اس طرح شہنشاہ نے اپنے کو ایک پوشیدہ اشارہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو بلخ پر قبضہ کیا جائے اور اگر قابل عمل ہو، تو آمو کے اس پار بھی شمشیر زنی کی جائے۔ اس خط کے ساتھ ایک دوسرا خط نظر محمد کے نام تھا اور حکم تھا کہ اس کو پہنچا دیا جائے۔

جب شہزادہ مراد اور علی مراد خان خلم پہنچے تو انہوں نے اسحاق بیگ کو شہنشاہ کے خط کے ساتھ نظر محمد کے پاس روانہ کیا۔ آخر الذکر نے بظاہر بڑی خندہ پیشانی سے نامہ بر کا خیر مقدم کیا مگر خط کا مضمون پڑھ کر دراصل وہ بہت پریشان ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو مایوسی حق بجانب تھی۔ اس نے مغلوں کو اپنی مدد کے لیے دعوت دی تھی لیکن اب اس کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ آخر الذکر اس کی تکلیفات کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ بدخشاں کے تسلط نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور شہزادہ مراد کا اتنی زبردست فوج کے ساتھ بڑھنے سے یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی دوستانہ پہلو نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک حد تک اس کی گھبراہٹ بلا وجہ تھی۔ اس کے مشیر کار جو مغلوں کے دشمن تھے انہوں نے اس خطرہ کا احساس بڑھا دیا۔ اگر وہ بلخ میں قیام کرتا تو ممکن ہے اس

کی گھبراہٹ اور بے چارگی میں کچھ کمی آجاتی جو بعد میں اس کے فرار ہونے پر آئی۔

نظر محمد کی سراسیمگی

اسحاق بیگ نے نظر محمد کے دربار کی سراسیمگی دیکھی، بلکہ اس کے بعض ساتھیوں کی مغلوں کے خلاف حقارت آمیز باتیں بھی سنیں۔ اس نے شہزادے سے استدعا کی کہ وہ فوراً بلخ آجائے۔ راستے میں نظر محمد کے فرستادہ چہ چک بیگ وغیرہ شہزادے کو ملے۔ اپنے آقا کا ایک خط اسے دیا۔ اس میں درخواست تھی کہ تین دن کا وقت دیا جائے کہ میں مکہ جانے کی تیاری کرلوں۔ لیکن شہزادے اور علی مردان خان نے اس کو نظر محمد کی چالبازی سمجھی اس لیے وہ لوگ سیدھے بلخ چل پڑے شہر سے چار میل کے فاصلہ پر قیام کیا۔ اسحاق بیگ نے واپس ہو کر اپنی اس خبر کی تصدیق کی جو اس نے بھیجی تھی۔ اس کے بعد ہی بہرام اور سبحان قلی معہ بلخ کے امراء کی ایک جماعت کے شہزادے مراد کی خدمت میں آئے۔ آخر الذکر بڑے تپاک سے ملا۔

نظر محمد کا فرار ہونا

2ر جولائی بروز جمعرات شہزادہ نے بلخ کے لیے کوچ کیا۔ اس نے توپ خانے رستم خاں اور میر قاسم کی معیت میں آگے روانہ کیا۔ حکم دیا کہ بلخ کے قلعہ میں داخل ہو جائیں۔ شہزادہ نے چار طاق کے جلکاشتر خاور پھاٹک کے سامنے اپنا خیمہ نصب کیا اپنی فوج کو ہوشیار رہنے کا حکم دیا۔ ایک بار پھر اسحاق بیگ کو نظر محمد کے پاس بھیجا گیا کہ سمجھا بجھا کر اسے شہزادہ سے ملنے پر تیار کرے۔ لیکن مغل فوج کے رویہ نے اسے خوفزدہ کر دیا اور اس نے خفیہ طور پر قلعہ سے بچ کر نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنی نقل و حرکت کو راز رکھنے اور شبہ دور کرنے کے لیے اس نے ظاہر کیا کہ جتنا بھی ممکن ہے میں اپنا بیش قیمت خزانہ لیے جارہا ہوں۔ اگرچہ بعد میں اپنے لڑکوں سبحان قلی اور قتلق محمد کے ساتھ موقع پر جا کر جتنا ممکن تھا

اپنا بیش قیمت خزانہ لے گیا۔ اگرچہ رستم خان قلعہ میں داخل ہو چکا تھا لیکن اس نے آٹھوں پھاٹک پر پہرہ نہیں لگایا۔ نظر محمد ایک ایسے دروازے سے نکل گیا جو اس کے آدمیوں کی نگرانی میں تھا۔

بلخ پر قبضہ

اس کے فرار کی خبر تیزی سے شہر میں پھیلی۔ لوگوں میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی۔ بدکار جماعت نے آزاد ہو کر لوٹ مار شروع کر دی۔ بہت کچھ نظر محمد کا خزانہ اس کے ہاتھ آ گیا لیکن دوسرے دن جب خلیل اللہ خان اور ملتفت خاں کو کچھ امن قائم کرنے کا موقعہ ملا تو انہوں نے ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ کے جواہرات، زیورات پچیس ہزار گھوڑے اور تین سو نر اور مادہ اونٹ مملوکہ نظر محمد ازبکوں کی دست برد سے بچالیا۔ نظر محمد کے دو لڑکے بہرام اور عبدالرحیم معہ اہل و عیال لہراسپ کے سپرد کیے گئے۔ شکر اللہ عرب کو شہر کو توال مقرر کیا گیا۔ 7/جولائی 1646ء کو شہزادہ شہر میں داخل ہوا۔ ترمذ کا قلعہ بھی قبضے میں آ گیا۔ بلخ کی تسخیر مکمل ہو گئی۔

نظر محمد کا تعاقب

نظر محمد کے فرار ہونے کی خبر ملتے ہی شہزادے مراد نے بہادر خان اور اصالت خان کو پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے شہر خان میں اسے جا لیا۔ ایک تیز جھڑپ کے بعد اسے شکست ہوئی۔ وہ اندخد کی طرف بھاگا سبحان قلی کے ہمراہ اس کے ماننے والے کچھ لوگ اس کا ساتھ چھوڑ کر بخارا چلے گئے۔ اندخد پر اس کو تین سو کا ایک فوجی دستہ مل گیا۔ اس کے ساتھ وہ مرد کی طرف بڑھا۔ خراسان میں داخل ہوا اور مشہد پہنچا۔ وہاں کے ناظم مرتضیٰ قلی خان نے اس کے گھر پر پہرہ لگا دیا۔ نظر محمد کو بڑا رنج ہوا۔ بادشاہ کے مروّجہ خط کا انتظار کیے بغیر وہ اصفہان روانہ ہو گیا۔

شاہجہاں کی مسرت

جب شاہجہاں کو بلخ فتح ہونے کی خبر ملی تو وہ بے حد مسرور ہوا۔ آٹھ دن جشن منائے جانے کا حکم صادر ہوا۔ سمرقند اور بخارا کی تسخیر اس کو قریب قریب یقینی معلوم ہوئی۔ درباریوں نے مبارک بادیں پیش کیں۔ شعراء نے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مناسب تاریخی مصرعے نظم کیے۔ سب میں زیادہ بہتر ناصرائے شیرازی کی نظم تھی۔ شہنشاہ نے کافی تعریف کی۔ احکام صادر ہوئے، کہ جن افسروں نے اپنے فرائض ہمت و استقلال سے ادا کیے ان کو انعامات دیے جائیں۔ بہادر خان، اصلالت خان، مہیش داس راٹھور، روپ سنگھ راٹھور پر شہنشاہ کی خاص نظر عنایت ہوئی ان لوگوں کو اعلیٰ منصب پر مامور کیا گیا[24]۔

مراد واپس آنے کی درخواست کرتا ہے

ابھی مشکل سے جشن ختم ہوا تھا اور نئے مفتوحہ ملاقات کا بندوبست بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ شہزادہ مراد کے واپس آنے کی تکلیف دہ درخواست پر شاہجہان کو تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا۔ شہزادہ نے باپ سے درخواست کی تھی کہ اس کو اجازت دی جائے کہ یہاں کا نظام کسی افسر کے سپرد کر کے وہ بلخ سے واپس ہو جائے۔ شہنشاہ نے شہزادے کو اس بے تکی درخواست پر بہت ڈانٹا۔ حکم دیا کہ وہ جہاں ہے وہیں رہے اور ملک کے انتظام کی دیکھ بھال کرے۔ علاوہ بریں شاہجہاں نے شہزادہ مراد کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا کہ اس کا ارادہ سمرقند اور بخارا کی فتح کے بعد اسے ماورالنہر میں نائب بادشاہ بنانے کا ہے لیکن یہ دلکش موقعہ اس کو متاثر نہ کر سکا وہ جوان اور زود رنج تھا۔ اس میں مستقل مصائب برداشت کرنے بلکہ ان کے امید افزا نتائج سے فائدہ اٹھانے کی بھی صلاحیت اس میں نہ تھی۔

وہ بار بار درخواست کرتا رہا اور اپنے باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ بغیر ایک بار اس کو دیکھے وہ بلخ میں نہیں رہ سکتا۔ بغیر جواب کا انتظار کیے اس نے شابر خان، اصالت خان اور خلیل اللہ کو بھی بلا لیا۔ جو ان دونوں کی امداد کے لیے وہاں گیا تھا۔ شہزادہ نے طے کر لیا تھا کہ ان دونوں کو بلخ کی سرکار سپرد کر کے اپنے باپ

کے پاس چلا آئے۔ اس معاملہ میں اور بہت سے افسران بھی اس کی ہمت افزائی کر رہے تھے جو اس غیر مہمان نواز سر زمین پر سرکاری خدمات انجام دینے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے کہ جتنا غارتگروں کی لوٹ مار تکلیف دہ تھی اتنا ہی موسم کی بے رحمی دل آزار تھی۔ علاوہ بریں ان میں سے بہتوں کو شروع میں یہ خیال تھا کہ یہ مہم اپنی نوعیت کے لحاظ سے عارضی ہے اور جب ان کو محسوس ہوا کہ شہنشاہ چاہتا ہے کہ مستقل طور پر یہ لوگ یہیں پر رہیں تو ان کو بے اطمینانی ہوئی، شکایتیں کرنے لگے۔

سعد اللہ خان کا مقصد

شاہجہان نے سعد اللہ کو بھیجا کہ وہ شہزادے کو اس احمقانہ خواہش سے باز رکھے اور افسروں میں نظم وضبط قائم کرے۔ لیکن شہزادہ مراد اپنی ضد پر اٹل رہا۔ اس نے وزیر اعظم کی رائے کی کوئی وقعت نہ کی۔ اس کو سپہ سالاری کے عہدہ سے الگ کر دیا گیا۔ بلخ کی گورنمنٹ کے لیے نئے انتظامات کیے گئے بہادر خان اور اصلالت خان کو بلخ کا بندوبست لامحدود اختیارات کے ساتھ سپرد کر دیا گیا اور رستم خان کو اندخود، کا انتظام سپرد کیا گیا۔ بلخ کے مروّجہ نخالص اور جھوٹے سکوں کے بجائے نئے اور خالص سکے رائج کیے گئے۔ ہر وہ بات کی گئی جس سے وہاں کے باشندوں کو یقین آجائے کہ نووارد یہاں رہنے کے لیے آئے ہیں۔ 22 دن میں سعد اللہ اپنا کام کر کے 6/ ستمبر کو کابل واپس آیا۔

تبصرہ

مغل شہنشاہ کی پر پیچ حکمت عملی پر یہاں اختصار کے ساتھ کچھ کہنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ شاہجہاں نے بدخشان پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور یہ معلوم تھا کہ نظر محمد اور شاہ ایران میں دوستانہ مراسم ہیں اس لیے اس نے جان نثار خان کو شاہ ایران کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ اس کی غیر جانب داری حاصل ہو جائے۔ بڑی دور اندیشی سے اس نے یہ موقعہ شاہ عباس ثانی کی تخت نشینی کی

تہنیت کا نکالا۔ ہنوز سفیر اصفہان راستہ ہی میں تھا کہ واقعات مذکورہ بالا بلخ میں ظہور پذیر ہوئے۔ نظر محمد اپنا وطن مغلوں کے لیے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لیکن بات بنانے یا ظاہر داری کے لیے شاہجہاں نے ایک خط لکھ کر میر عزیز کو نظر محمد کے پاس ایران بھیجا۔

اس خط کا مضمون قابل توجہ ہے۔ اس کی ابتدا اس حوالہ سے ہوتی ہے جب شہزادہ مراد بلخ کے قریب پہنچا تو نظر محمد نے سبحان قلی اور بہرام سلطان اور دیگر عمائدین کو شہزادہ مراد سے ملاقات کے لیے بھیجا تھا۔ دوسرے اقتباس طرز معذرت کا بہت دلچسپ نمونہ ہے۔ لکھتا ہے کہ "جب شہزادہ بلخ کے سامنے خیمہ زن ہوا تو اپنی نوجوانی و ناتجربہ کاری اور ہمراہی بزرگوں کی کاہلی و غفلت کے زیر اثر بعض نامناسب باتیں بھی کیں۔ مثلاً رستم خان کا قلعہ میں آپ (نظر محمد) کی موجودگی میں داخل ہونا اس قسم کی باتیں آپ کے لیے سراسیمگی و تکلیف کا باعث ہوئی ہوں گی مجھے یہ باتیں سن کر بڑا رنج ہوا۔ لیکن میں امید کرتا تھا کہ آپ ہمارے یہاں آئیں گے۔ کہیں اور نہ جائیں گے...... مگر مرضی مولا از ہمہ اولیٰ...... میں چاہتا تھا کہ دل آزار و تکلیف دہ لوگوں سے بلخ کو پاک کر کے آپ کے سپرد کر دوں بلکہ ایک دوستانہ انداز پر یہ خط ختم ہوتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ جہاں کہیں آپ کے اہل و عیال کو روانہ کر دوں[27]۔

لیکن یہ پر خلوص دوستی کا اظہار اور گہرا لگاؤ، بالکل رسمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہ واقعات کی بدلتی ہوئی کروٹ سے خوش تھا اور خط مذکورہ بالا کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نظر محمد کا مفرور ہو کر ایران جانا اس کے نزدیک نظر محمد کے ملک پر قبضہ کرنے کا اچھا خاصا جواز تھا۔ ماضی کے پاکیزہ ارادوں کا مذکور ضرور ہے مگر مستقبل کے لیے امید افزا بات نہیں۔ بالفاظ دیگر اگر شاہجہاں کے دل میں کوئی جذبہ فیض تھا تو اس نے صاف نظر محمد کو لکھا ہوتا کہ تمہارا ملک تم کو واپس مل جائے گا۔ اگر تم اپنے وطن واپس چلے آؤ۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں

لکھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ لکھا کہ تمہارے اہل و عیال کو واپس کر دیا جائے گا۔ خط جو شاہجہاں نے شاہ عباس ثانی کو ارسلاں بیگ سے بھجوایا تھا اس کی دو طرفی حکمت عملی کا غماز ہے۔

بلخ میں مشکلات

بلخ و بدخشاں کا فتح کرنا کافی آسان تھا لیکن ان علاقوں پر حکمرانی مغلیہ افسروں کو دعوت آزمائش تھی، انہوں نے محسوس کیا کہ ایک پوری قوم ان سے برسرپیکار ہے۔ باوجود کثرت تعداد بہتر تنظیم و تربیت کے دغاباز ازبکوں کو قابو میں لانا ناممکن تھا۔ سرحدی چوکیاں ازبکوں کے تاخت و تاراج کے لیے کھلی تھیں۔ اکثر شاہ پرست جیسے محاصرہ کے عالم میں زندگی بسر کرتے دشمنوں سے اکثر لڑائیاں ہوتیں۔ مگر بغیر کسی فیصلہ کے ان منتشر لڑائیوں کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری ہے مگر صورت حال پر پوری گرفت رکھنے کے لیے ایک مختصر ساخاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

مغلیہ صوبہ کابل شمال میں ہندوکش پہاڑ کی طرف پھیلا تھا اس کی سرحدی چوکی کی بامیان پہاڑ کے اس پار تھی۔ بلخ اور بدخشان کی فتوحات سے مغلیہ سرحدیں ہامون کے جنوبی ساحل سے سلسلہ بہ سلسلہ ابی پنجہ تک پھیل گئی۔ بلخ کا صوبہ میدان اور ہموار زمین پر مشتمل تھا لیکن بدخشاں میں جا بجا پہاڑیاں اور ڈھال کی طرف جانے والے تیز رفتار چشمے رواں دواں تھے۔ ان دونوں صوبوں کی مدافعت کا انتظام شاہی فوجوں نے جس انداز سے کیا وہ جنگ کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ انہوں نے تین چوکیاں ایسی دو قطاروں میں قائم کیں جو متوازی تھیں۔ ایک حضرت امام سے بدخشاں کی مغربی سرحد ہوتی ہوئی ہندوکش میں خان جان اور اندراب تک پہنچتی تھی اور دوسری جو پہلی سے لمبائی میں کم تھی اندخو سے شابر غان ہوتی ہوئی بوندی ترکستان کی شاخوں میں ساریل پر ختم ہوتی تھی۔ آخرالذکر قطار کے پار مغربی چوکی پر میمنہ میں تھی۔ اس طرح ان دو قطاروں کے درمیان

بلخ بالکل محفوظ تھا۔

اس نظم و نسق میں یہ کمی تھی کہ اگرچہ مغربی سرحد کے تحفظ کے لیے کافی احتیاطی تدبیریں کی گئیں تھیں اور اندرونی امن کے لیے بھی لیکن جانب شمال جو مقامات دریائے ہامون میں دشمنوں کے حملے کے لیے زیادہ کھلے ہوئے تھے۔ ان کی محافظت پر توجہ نہ کی۔ مشکل ہی سے کوئی مضبوط چوکی وہاں رہی ہو گی۔ آغچہ، خلم اور قندوز بہت دور جنوب میں تھے۔ اس طرح ازبکوں کی آوارہ گرد جماعت اور دوسرے قبائل کے لیے بلخ میں داخل ہو کر مغل افسروں کو پریشان کرنے کے لیے راستہ کھلا تھا۔ علاوہ بریں مفتوحہ علاقوں کے باشندے بذات خود قواعد و ضوابط کے پابند شہری نہ تھے۔ بہ نسبت نوواردوں کے وہ اپنے شمالی بھائیوں سے زیادہ ہم خیال و ہم مذاق تھے۔

قبائل کا خروج

شاہ پرستوں کی مشکلات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ تسخیر مکمل ہونے سے پہلے قندوز پر ازبکوں کے ایک جتھا نے حملہ بھی کیا اور راجہ راج روپ نے پسپا کر دیا تھا۔ اس طرح دونوں قطاروں کی ہر چوکی ازبکوں کے خوف یا غارت گری کے لیے کھلی تھی۔ مغرب میں ان کو لوٹ مار کا سلسلہ شابرغان اور مشرق میں خان جان تک تھا۔ وہ بلخ کی سرحد تک دھاوا کر کے بدخشاں کے شمالی اضلاع سے اکثر مویشی پکڑ لے جاتے تھے۔ مثلاً رستخ، قندوزا اور خان آباد سے شاہی فوجیوں کی تکلیف میں موسم سرما نے اپنی فطری لوازمات سے اضافہ کر دیا تھا۔ علاوہ بریں یہ لوگ اپنے دشمنوں کی سی نقل و حرکت میں تیزی نہ کر سکتے تھے۔ اکثر اوقات تو بہت تھوڑے سے دشمنوں کو ہلاک کر سکے۔

کوئی اعلیٰ سپہ سالار نہ تھا

مغلوں کے انتظام میں ایک اور کمی تھی جس نے ان کے انتظام کو کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی غیر معمولی سپہ سالار نہ تھا، بہادر خان،

اصالت خان، قلیچ خان عملی اعتبار سے ایک ہی قماش کے عہدہ دار تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انفرادی طور پر ان میں سے ہر ایک بہادر، قابل اور جفاکش تھا لیکن وہ سب مل کر ایک مشترکہ منصوبہ نہ بنا سکے۔ شاہجہان کو اس کا احساس تھا اسی لیے وہ اس پر مصر تھا کہ مراد وہیں رہے۔ وہ علی مردان خان کو نائب بادشاہ بنا سکتا تھا۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ وہ بلخ کے باشندوں میں ہر دل عزیز نہ ہو سکے گا۔ بالآخر ملک کو مختلف افسروں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اچھا تھا کہ شاہجہاں بلخ اپنی فوجیں ہٹالیتا اور اس علاقہ کو اس کی قسمت کے سپرد کر دیتا۔ لیکن اولوالعزی نے اس کو دور اندیشی اور چوکسی سے معذور رکھا۔ شہرت و سطوت کے ایک غلط تصور نے اس کو مائل کیا کہ وہ بھرپور کوشش کر کے اپنے آباد اجداد کے ملک میں اپنا پرچم لہراتا رہے۔

اس لحاظ سے اس نے شہزادہ اورنگ زیب کا تقرر کیا کہ بلخ میں نظم و نسق قائم کرنے کی مہم کا انتظام کرے شہنشاہ نے وسیع پیمانے پر تیاری کی۔ کثیر رقم کابل منتقل کی اور پشاور سے کابل تک مناسب مقامات پر فوجیں اس کے لیے اکٹھا کر دیں کہ اس طرح تیار رہیں کہ جب کوچ کا حکم دیا جائے وہ فوراً متحرک ہو جائیں 7/اپریل 1647ء کو شہزادہ کابل سے کاہ مرد روانہ ہوا۔ دائرہ غاز پر قتلق محمد کی قیادت میں استر خانیوں نے راستہ روکا لیکن ایک مختصر جھڑپ کے بعد بھاگ گئے۔ وہ لوگ شاہی فوج کے ارد گرد منڈلاتے رہے تاکہ اس کی رفتار سست کر دیں۔ لیکن شہزادہ اورنگ زیب اور علی مردان خان ان کو پسپا کر کے اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے رہے یہ لوگ 25/مئی کو بلخ پہنچے۔

عبدالعزیز پوری طرح ماوراالنہر میں جم گیا تھا اور جب اس نے سنا کہ جنوب سے ایک زبردست فوج آرہی ہے تو اس نے طے کیا کہ ایک پرزور کوشش کر کے مغلوں کو بلخ سے باہر کر دیا جائے۔ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار فوج اکٹھا کی اور چھاونی ڈالی۔ قتلق محمد کی سپردگی میں ایک فوجی دستہ اس نے مغلوں کو روکنے کے

لیے بھیجا اور دوسرے دستہ کو بیگ اغلی کے سپرد کر کے حکم دیا کہ وہ دریا پار کرے، آقچہ جا کر اپنا محاذ بلخ اور انخود چو کی کے درمیان قائم کرے۔ جب بہادر خان نے سنا کہ کالف پر بیگ اغلی نے دریا پار کر لیا ہے تو وہ آگے بڑھا کہ مار بھگائے لیکن شہزادہ اورنگ زیب نے اس کو واپس بلا لیا۔

31/ مئی 1647ء کو شہزادہ ساری فوج لے کر دشمن کو شکست دینے کے لیے آگے بڑھا۔ شاہی فوج بہت احتیاط کے ساتھ بڑھی۔ بہادر خان ہراول دستہ کا سردار تھا اورنگ زیب ایک ہاتھی پر سوار قلب فوج سے حکم دے رہا تھا۔ اس کے ارد گرد سامان اور پیش خدمت تھے علی مردان خان پچھلے حصے کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ پیدل بندوقچیوں کی مدد سے توپ خانے نے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کیا۔ منڈلاتے ہوئے ازبکوں سے مسلسل لڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے قتلق محمد کا خیمہ لوٹ لیا۔ آخر الذکر دائرہ غازمیں شکست اٹھانے پر بیگ اغلی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ لیکن دشمن نے بائیں بازو پر حملہ کیا جو ایک بوڑھے اور ضعیف الارادہ افسر سعید خان بہادر ظفر جنگ کی زیر قیادت کام کر رہا تھا۔ شاہی فوج ازبکوں کے دباؤ سے ہار گئی لیکن اورنگ زیب بر وقت ان کی امداد کو پہنچا اور فوج کو استحصال کلی سے بچا لیا۔

بیشمار پریشانیوں میں بھی مغل فوج صبر و سکون کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ علی مردان خان کی قابلیت اور فوجی شعور نے کئی مرتبہ ان کو مصیبت سے بچا لیا۔ بالآخر پاشائی کے قریب پہنچے یہاں اورنگ زیب نے دشمنوں کے خیمہ پر قبضہ کر لیا اور ان کاشتکاروں کو رہا کیا جو ابتک قید میں پڑے تھے۔ اس درمیان میں سبحان قلی بلخ پر حملہ کرنے کے لیے زبردست فوج کے ساتھ بڑھا۔ اس لیے 5/ جون کو اورنگ زیب پاشائی سے واپس آیا اور دو دن بعد بخارا کی مکمل فوج سے اس نے مقابلہ کیا۔ عبدالعزیز، سبحان قلی بیگ اغلی اور دوسرے سر بر آوردہ افسران موجود تھے۔ تین طرف سے شاہی فوج پر حملہ کیا گیا لیکن توپ اور بندوق بازی و

برتر تنظیم نے مغلوں کو پھر فتحیاب بنایا۔ ۱۱ر جون کو اورنگ زیب خیریت سے بلخ واپس آیا۔

اورنگ زیب کی ہیبت ناک جگر داری نے دشمنوں کے دل ہلا دیے۔ اور اب عبدالعزیز صلح کی تمنا کرنے لگا۔ اورنگ زیب کو شکست دینے کی توقع خام خیالی تھی۔ ٹھنڈے دل سے شہزادے کے جنگ کرنے کا ایک جاذب توجہ ثبوت عبدالعزیز نے بچشم خود دیکھا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن عین لڑائی میں وقت نماز مغرب آ گیا جنگ اپنے پورے شباب پر تھی اورنگ زیب نے میدان جنگ میں جانماز بچھائی۔ بارگاہ رب العزت میں سر تسلیم خم کیا اور نہایت اطمینان سے نماز ادا کی۔ اس عالم میں بھی بغیر زرہ بکتر کے وہ ویسا ہی رہا جیسا کہ دوران جنگ میں تھا۔ بخارا کی فوج نے یہ منظر بچشم حیرت دیکھا۔ عبدالعزیز نے مردانہ وار داد شجاعت دی۔ لڑائی بند کرا دی، بآواز بلند کہا "ایسے آدمی سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔"

لیکن عبدالعزیز کی جنگ بندی میں صرف اورنگ زیب کی بہادری ہی کار فرمانہ تھی۔ اس کی اپنی فوج جو زیادہ تر آوارہ گرد قبائل پر مشتمل تھی مغلیہ جنگ سے ناکامیابی پر کم ہوتی چلی گئی۔ ترکمان بالخصوص گھوڑے بیچ کر دریائے ہامون کے پار چلے گئے۔ اس سے بھی متاثر ہو کر اورنگ زیب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ بخارا اس کے چھوٹے بھائی سبحان قلی کے سپرد کر دیا جائے۔ جب اورنگ زیب نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ اس مسئلے کو شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرے گا تو عبدالعزیز اپنے وطن چلا گیا۔ اس درمیان میں بلخ کے سابق بادشاہ نے بھی شاہجہاں سے ایسی ہی درخواست کی۔

شابرغان سے پسپا ہو کر نظر محمد، اصفہان گیا۔ اس کا شاہانہ خیر مقدم شاہ ایران نے کیا۔ شاہ عباس ثانی نے کئی دعوتیں اپنے مہمان کے اعزاز میں کیں تاکہ اس کا غم غلط ہو جائے لیکن آخر الذکر اپنے دغاباز آدمیوں سے انتقام کے

لیے بے چین تھا۔ اس نے شاہ ایران سے امداد کی متعدد درخواستیں کیں۔ شاہ عباس ثانی نے اس کے ساتھ سارو خان طالش کو معہ خراسانی و عراقی فوجیں روانہ کیں اس درمیان میں نظر محمد کو بعض ازبک سرداروں کے پیام ملے۔ اس لیے اس نے ایرانی سپہ سالار کو پیچھے چھوڑ کر مرد کی طرف کوچ کیا۔ وہاں کے ناظم علی قلی خان سے رنجش تھی اس لیے شہر میں داخل ہونے کے بجائے آٹھ میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا۔

یہاں کفش قلماق اس کو ملا۔ اس نے بخارا پر جلدی حملہ کرنے سے روکا اور ازبک دوستوں کی دغابازی سے بھی آگاہ کیا۔ بتایا کہ وہ لوگ اسے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ نظر محمد نے اپنا ارادہ ترک کیا۔ کفش قلماق کے ساتھ مارو چاق گیا۔ یہاں بہت سے قلماق قبیلے کے لوگ اس جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے۔ ان حلیفوں کی مدد سے اس نے پے در پے حملے مغلوں کو ان کی سرحدی چوکی چاۓ چاکتو اور میمنہ سے ہٹانے کے لیے کیے۔ لیکن ہر بار شرمناک شکست ہوئی۔ اس خبر نے کہ اورنگ زیب ایک زبردست فوج کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس کی ہمت پست کر دی اور نظر محمد بل چراغ بھاگ گیا۔ بایں ہمہ جب اس نے سنا کہ عبدالعزیز حملہ آوروں کو پسپا کرنے کے لیے بڑھ رہا ہے تو اس نے قتلق محمد کی قیادت میں بلخ پر حملہ کے لیے کچھ فوج بھیجی لیکن یہ فوج بھی عبدالعزیز کے سپاہیوں کے ساتھ ہو گئی۔

نظر محمد بجز اس کے کچھ نہ کر سکا کہ عبدالعزیز اور اورنگ زیب کی لڑائی کے فیصلے کا انتظار کرے اپنے لڑکے کی ناکامی پر اس نے ملک کی بحالی کے لیے گفت و شنید شروع کی۔ شاہجہاں کو اب بلخ پر قبضہ رکھنا محال نظر آیا بہت غور و خوض کے بعد اس نے نظر محمد کو اس کے لڑکے سبحان قلی پر ترجیح دی۔ شہنشاہ نے اس کے لڑکے سے کہا کہ سب سے پہلے نظر محمد سے معافی اور عاجزانہ اطاعت طلب کرے۔ نظر محمد گفت و شنید بڑھاتا رہا۔ آخر میں اپنے پوتوں کو بھیجا اور علالت کی

بنا پر اپنی معذرت پیش کی۔ اورنگ زیب کو اس پر قناعت کرنی پڑی۔ کیونکہ موسم سرما قریب تھا اور فوج کو فاقہ کا سامنا تھا۔ 3/اکتوبر 1647ء کو اسنے بلخ چھوڑ دیا۔

نظر محمد کے آخری ایام

نظر محمد کی قسمت کا مختصر خال یہاں بیان کرنا مناسب ہو گا۔ اپنی سلطنت واپس پانے کے بعد وہ اپنے لڑکے عبدالعزیز کے ہاتھوں امن چین سے نہ رہا بلخ کے باشندے کچھ عرصہ تک اس کے وفادار رہے بالآخر مسلسل جھگڑوں سے تنگ آکر وہ لوگ اس کے بیٹے کے ساتھ ہو گئے۔ آخر کار نظر محمد نے جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اپنے آخری ایام کو سکون کے ساتھ گزارنے کے لیے اس نے مدینہ منورہ جانے کا ارادہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑکوں سے مصالحت کرے اور انہیں دعائے خیر دے لیکن سبحان قلی نے پدرانہ شفقت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دل شکستہ نظر محمد اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ دوران سفر بمقام سمنان 1650ء میں اس کا انتقال ہوا۔ لیکن جب وہ بلخ میں صاحب اختیار رہا مغل بادشاہ سے اس نے دوستانہ مراسم قائم رکھے۔ کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ برابر اس کے سفیر مغلیہ دربار میں آتے رہے۔

انجام

اس کے بعد ہی مغل دربار اور سیاست سے ماورالنہر کی تاریخ کی دلچسپی کم ہو گئی۔ بابر کی مہم پسندی کے بعد یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی جو کسی مغل اعظم نے تیمور کے مقبوضات حاصل کرنے کے لیے کی۔ اس کوشش کی ناکامی کی پہلی وجہ ملک میں زندگی بسر کرنے اور صبر آزما موسم سے گریز تھا۔ بابر کے افسروں کے مزاج و مذاق کا یہ براہ راست برعکس تھے وہ لوگ جفاکش تھے۔ جنگجو چمڑے کے لباس میں رہتے تھے۔ ہندوستان کے تپتے ہوئے میدانوں میں اپنی جسمانی قوت گنوانا پسند نہ کرتے۔ اسی لیے شاہجہاں کے افسروں کے حلیہ کا بیان ان مناسب الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ ”زرد رو اشخاص ململ کے لباس میں بلخ پر مغلوں کا قبضہ

قائم نہ رہنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مقامی باشندوں کی ہمدردی ان کو حاصل نہ تھی ماوراالنہر کے باشندے اس وقت بھی قبائلی سطح کی تہذیب پر تھے اور وہ بری طرح اپنے سرداروں سے وابستہ تھے یہی خیال تھا جس نے شاہجہاں کو بدخشان کا انتظام نجابت خان کے سپرد کرنے پر مائل کیا کیونکہ ایک زمانے میں اس کے آباو اجداد یہاں حکمراں تھے۔ آخری وجہ یہ ہے کہ ازبکوں اور چغتائیوں میں ہمیشہ سے مخالفت رہی اس لیے شاہی فوج کو پوری قوم سے مقابلہ کرنا پڑا۔ فطرتاً وہ وہاں دیر تک نہ ٹھہر سکے، اس لیے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش مغل بادشاہ کے لیے گراں ثابت ہوئی۔

باب 9

ایران سے تعلقات

جب ہم عظیم مغلوں کی خارجہ پالیسی کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب ان کے ماوراالنہر اور ایران کے تعلقات سے ہوتا ہے۔ اول الذکر کا بیان گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ اب آخر الذکر کی باری ہے۔ ایران کے بارے میں اگرچہ چغتائی حکمران دوستی اور خیر سگالی کا اظہار کرتے رہے اور باوجود اسکے کہ صفوی حکمرانوں نے بھی اسی قسم کا رویہ رکھا لیکن پھر بھی کافی ایسی شہادتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے رشک بھی کرتے تھے اور کسی کو کسی پر اعتماد نہ تھا۔ دربار ایران ہر جگہ ہندوستانی حکمرانوں کے بلند بانگ القاب کو دل سے نہیں مانتا۔ ان کا رویہ سرپرستانہ تھا۔ عصری مراسلات میں اس احسان کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جو شاہ اسمٰعیل نے بابر کے ساتھ کیا تھا اور اس پناہ کا بھی جو شاہ طہماسپ نے ہمایوں کو دی تھی۔ برخلاف اس کے شاہان مغلیہ اپنے کو شاہ ایران سے بالاو برتر تصور کرتے رہے کیونکہ ان کی سلطنت بھی وسیع تھی اور نیک نامی کی وجہ دولت بھی زیادہ تھی۔ سفیروں کے مسلسل تبادلے کے پس پشت خفیہ اطلاعات حاصل کرنے کے علاوہ یہ خواہش تھی کہ سلطنت دوسری سلطنت کو اپنی شان و شوکت سے مرعوب کرتی رہے۔

قندھار کا سوال

صفوی اور چغتائی خاندان کے خوشگوار تعلقات میں کبھی کبھی قندھار پر قبضہ کے لیے مزاحمت کی وجہ سے بدمزگی پیدا ہوئی شاہ اسمٰعیل قندھار لینے کا خواہشمند تھا لیکن اس پر بابر[2] نے قبضہ کر لیا۔ لیکن اکبر نے خفیہ طور[3] پر واپس لے لیا۔ اس صفوی خاندان کا سب سے زبردست بادشاہ شاہ عباس اول جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا مقصد قندھار کا حکمت عملی سے واپس لے لینا قرار دیا۔ خوش بیانی اور قاصدوں کی فرستادگی سے جہانگیر کا شک و شبہ دور کرتا رہا اپنے خلوص اور خوش نیتی کا یقین دلاتا رہا۔ اور یہ بھی ہوا کہ اس کا سفیر زنبل بیگ ہنوز مغلیہ دربار ہی میں تھا کہ اس نے قندھار کی دفاعی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اچانک اس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ زخم پر نمک چھڑکنے کے لیے اس نے جہانگیر کو ایک خط میں لکھا جس میں اپنی اس کارگزاری کا جواز بھی پیش کیا۔ اور مختلف بہانے بھی کیے۔

شاہ عباس اول اور شاہجہاں کے ذاتی تعلقات

اس کے بعد کچھ عرصہ تک دونوں دربار کے تعلقات کشیدہ رہے لیکن ذاتی و غیر سرکار مراسلات کا سلسلہ شاہجہان اور شاہ عباس اول میں قائم رہا اوّل الذکر کا آخری خط اپنے باپ کی اطاعت قبول کرنے کے بعد کا ہے، لیکن جب شاہ نے شہزادہ پرویز کے انتقال کی خبر سنی تو اس نے تعزیت کے لیے جہانگیر کے پاس ایک سفیر بھیجنے کا قصد کیا۔ اس مقصد[5] کے لیے اس نے پختہ بیگ کو منتخب کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ سفیر ایران سے روانہ ہو، خبر پہنچی کہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں جب مغل دربار کے انتشار کی خبر ملی تو شاہ عباس اول نے بحری بیگ کے ہاتھ شاہ جہاں کو خط بھیجا جس میں لکھا کہ اگر ضروری ہو تو میں امداد کے لیے تیار ہوں۔ اس نامہ بر کا استقبال آگرہ سے باہر معتقد خان نے کیا۔ اس کو دربار میں شرف حضوری[6] 5/ جنوری 1629ء کو نصیب ہوا۔

محمد علی بیگ اور میر بار کہ

ہنوز بحری بیگ ہندوستان پہنچا بھی نہ تھا۔ سفر ہی میں تھا کہ شاہ عباس اول کا انتقال 9/ جنوری 1629ء کو ماز ندران میں ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا پوتا سام مرزا بد نصیب صفی مرزا کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ نئے بادشاہ نے تخت نشینی کے بعد اپنے باپ کا لقب اختیار کیا، تاریخ میں وہ شاہ صفی کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنے عہد کے رسم و رواج کے لحاظ سے شاہ نے اولین فرصت میں شاہجہاں کی تہنیت کے لیے ایک قاصد روانہ کیا۔ اس کام کے لیے اس نے محمد علی بیگ کا انتخاب کر کے آگرہ بھیجا۔ اس اثناء میں شاہجہان کو شاہ عباس کے انتقال کی خبر مل چکی تھی اس لیے میر بار کہ کو بالکل ایسے ہی مقصد[8] کے لیے ایران بھیجا دونوں قاصد غالباً ایک ہی وقت میں ایک راستہ سے گزرے۔

شاہ کے نام شاہجہاں کا خط

اس خط میں شاہجہاں نے بحری بیگ کے آنے کی رسید بھیجی۔ شاہ صفی کی تخت نشینی پر مبارک باد دی۔ مرحوم بادشاہ سے اپنے دوستانہ مراسم کا ذکر کیا اور حریفوں اور دشمنوں سے مہلت پانے اور تخت نشین ہونے کا ذکر کیا اور گویا اس امداد کے جواب میں جو مرحوم شاہ نے پیش کی تھی۔ شاہجہان نے لکھا کہ وہ استحکام سلطنت میں شاہ صفی کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ خط کا خاتمہ دوستانہ مشورے پر ہوا۔ شاہ کو نصیحت کی گئی کہ وہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتا رہے۔ میر بار کہ کو شاہ کے شرف حضوری حاصل کرنے کے لیے اصفہان میں ٹھہرنا پڑا کیونکہ شاہ ترکوں سے مصروف پیکار تھا۔ اس کی واپسی پر ہندوستانی قاصد نے وہ تحفے پیش کیے جو وہ اپنے آقا کی طرف سے لے گیا تھا۔ شاہجہاں نے اپنے خط میں درخواست کی تھی کہ قاصد کو جلد از جلد واپس ہونے کی اجازت دی جائے مگر باوجود اس طلب و تقاضا کے بھی میر بار کہ کو ایک سال سے زیادہ دربار اصفہان میں روکا گیا۔

محمد علی بیگ کا خیر مقدم

جس زمانے میں محمد علی بیگ آگرہ آیا اس زمانے میں شاہجہاں، خان جہاں لودی کی بغاوت فرد کرنے کے سلسلے میں دکن گیا ہوا تھا۔ لیکن جیسے ہی شہنشاہ کو اس کے آنے کی خبر ملی اس نے قاصد کے دکن تک سفر کا فوراً انتظام کرا دیا کیونکہ وہ اس کو اپنی واپسی تک رو کے رہنے کی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ مکرمت خان برہان پور سے ایک خلعت اعزازی کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ جہاں کہیں وہ راہ سفر میں ملے خلعت سے سرفراز کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہدایت کی گئی کہ محمد علی کو مانڈو لانے کی کوشش کرے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے معتقد خان ناظم مالوہ کو متعین کیا گیا۔

مانڈو میں کچھ آرام کرنے کے بعد محمد علی بیگ دکن روانہ ہوا برہان پور کے قریب افضل خان اور صادق خان نے اس کا استقبال کیا۔ جب وہ مغل شہنشاہ کی حضوری میں پیش ہوا تو اس نے شاہ کا خط دیا۔ اسی دن شہنشاہ نے اس کو بیس ہزار روپیہ کے تحائف بطور انعام عطا کیے۔ 6/جون بعد محمد علی بیگ نے وہ تحفے شہنشاہ کی نذر کیے جو ایران سے لایا تھا ان کی قیمت تین لاکھ روپیہ تھی۔ ایرانی قاصد پر شاہجہاں نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی تاکہ اپنی عظمت کا سکہ جما سکے۔ 19/ستمبر 1631ء تک محمد علی بیگ برہان پور میں قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد اس سے آگرہ واپس جانے کو کہا گیا تاکہ سفر کی تیاری کر سکے۔ لیکن میر بارکہ کی واپسی (جون 30/1632ء) تک محمد علی بیگ کو واپس جانے کی رخصت[11] نہ ملی۔

قوشانج کا زمیندار مغل دربار آتا ہے

اس اثناء میں قندھار میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو بظاہر تو نہیں لیکن بباطن مغل شہنشاہ اور شاہ کے خوشگوار رشتوں میں خلل انداز ہو سکتا تھا۔ شاہ عباس اول نے جب سے قندھار پر حملہ کیا تھا شیر خان ترین اسی وقت سے ناظم خوشانج رہا۔ شاہ عباس اس کا بہت خیال کرتا تھا۔ شاہ عباس اول کے مرنے کے بعد وہ منحرف ہو

گیا۔ ہندوستان اور ایران کے درمیان آنے جانے والے سوداگروں پر دست درازی کرنے لگا۔ قندھار کے ناظم علی مردان خان ایسے موقعہ کی تاک میں تھا جس سے شیر خان کی سرکوبی کر سکے۔ جب 31-1630ء میں اس نے اپنا شہر چھوڑ کر سیوی کو لوٹنے کا ارادہ کیا تو مردان خان ایک ہزار فوج لے کر گیا اور خوشانج پر قبضہ کر لیا۔ شیر خان نے مقابلہ کیا۔ جنگ ہوئی وہ ہار کر "دوکی" بھاگ گیا۔ اس کے بعد وہ ملتان کے ناظم احمد بیگ خان سے ملا۔ جس نے اس کی درخواست دربار کو بھیجی۔ یہ درخواست منظور ہوئی شیر خان شہنشاہ سے 13/ مارچ 1632ء کو ملا۔ اس کو پنجاب[12] میں ایک جاگیر عطا کی گئی۔

صفدر خان ایران بھیجا گیا

صفدر خان ایرانی دربار میں متبادل سفیر تھا۔ 16/ مئی 1633ء کو آگرہ سے وہ ایران کے لیے روانہ ہوا۔ اپنے ساتھ شاہ ایران کے لیے 4 لاکھ روپے کے تحفے لے گیا۔ ایرانی دربار کی تمیز و تہذیب کی نزاکتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے شاہجہاں نے محمد علی بیگ کی سفارت تسلیم کی۔ شاہ کو خیر خواہ اور قابل اشخاص کی قدر کرنے کی رائے دی۔ بادشاہ کے فرائض بیان کیے خان جہان کی بغاوت قطب الملک کی اطاعت، عادل شاہ سے جنگ، ہگلی کی تسخیر، پرتگالیوں کے جڑ سے اکھاڑے جانے کے تذکرے پر خط ختم ہوا۔ حسب معمول سفیر کی جلد واپسی کی درخواست بھی اس خط میں تھی۔

ایران میں اس کا استقبال

جب صفدر خان اصفہان پہنچا تو اسی زمانے میں شاہ صفی اروان[14] کے خلاف مہم سر کر کے کامیاب ہوا تھا۔ سفیر کو شرف باریابی کاشان میں ہوئی۔ شاہجہاں کی تجویز کے خلاف اس کو زیادہ روکا گیا۔ اس کا قیام کار آمد ثابت ہوا۔ وہ شاہ صفی کے پیچھے سایے کی طرح لگا رہا اور اس نے اپنے آقا کے لیے وہی کام کیا جو زنبل بیگ نے ہندوستان میں عہد جہانگیر میں کیا تھا۔ بالفاظ دیگر اس نے شاہجہاں کو شاہ صفی

کی سیاسی مصروفیات کی ساری خبریں بہم پہنچائیں۔

شاہ عباس اول کے انتقال کے بعد کے واقعات

شاہ عباس اول کے مرتے ہی ایران کی داخلی و خارجی سکون کا نظام ٹوٹ گیا۔ دشمنوں نے اپنی جارحانہ ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ مغرب میں مراد چہارم ترکی کا "جنگ جو سلطان" اور مشرق میں ازبک اور استراخان مستقل خطرہ میں تھے۔ آخرالذکر کو خراسان کے صوبہ داروں نے متعدد بار پسپا کر دیا تھا لیکن مراد چہارم زیادہ طاقت ور اور زیادہ ضدّی تھا 1630ء میں وہ کردستان میں داخل ہوا ایران کی ایک فوج کو شکست دے کر ہمہ دان پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے ہی سال بغداد پر اس نے ایک ناکام حملہ کیا۔ 4 سال بعد اروان (1635ء) لے لیا حالانکہ شاہ نے آیندہ سال کے موسم بہار میں واپس بھی لے لیا۔

لیکن اروان کی واپسی مغربی سرحد پر جنگ کا خاتمہ نہ ثابت ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کردستان کے ناظم احمد بیگ خان اردلان نے ترکوں کی امداد سے بڑا انتشار پیدا کر دیا لیکن باغی اور اس کے حلیف کو ایران کی ایک فوج نے شکست دی۔ احمد بیگ خان مارا گیا۔ اس کے بعد ہی خبر ملی کہ مراد چہارم بغداد پر اور خراسان پر ازبک حملہ کرنے والے ہیں۔ اسی زمانے میں ترکوں نے اروان واپس لینے کے لیے اروان پر ایک ناکامیاب حملہ کیا۔ یہ سیاسی خلل اندازیاں شاہ صفی کی زبردست پریشانی کا سرچشمہ رہی ہوں گی اور ان ہی سے ان کے دربار کی بھی فضا پراگندہ رہی ہوگی۔ تمام بدلتے ہوئے حالات صفدر خان نے اپنے آقا کو بالتفصیل لکھے۔

جس زمانے میں شاہ صفی دشمنوں سے برسرپیکار تھا اسی زمانے میں ہندوستانی سفیر مرزا حسین، اس کے دربار میں آیا جو خط وہ لایا تھا اس میں دولت آباد کی فتح جھجار سنگھ کی بغاوت کا انسداد، بیجاپور پر حملہ اور عادل شاہ کی اطاعت پذیری اور اس کا بیس لاکھ روپیہ ادا کرنے کا وعدہ اور قطب شاہ کا چالیس لاکھ روپے ادا کرنے

کاغذ کورہ شاہ سے کیا گیا تھا۔ خط کے اختتام پر شاہجہاں نے اورنگ زیب کو دکن کا نائب سلطان بنانے کا اور اس کے آگرہ واپس آنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ سیاق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حسین جو خط لایا تھا اس کا مقصد شاہ کو ہندوستانی شہنشاہ کی دوستی کا یقین دلانا تھا لیکن حقیقت میں اس کا مقصد اس خبر کی توثیق کرنا تھا جو صفدر خان سے ملی تھی۔

علی مردان کا سراسیمہ ہونا

دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت چند ہندوستانی افسران بالخصوص قلیج خان نے علی مردان خان سے قندھار سے دستبرداری کی گفت و شنید شروع کی تھی۔ آخرالذکر نئے وزیر سارو تقی کی انتظامی سخت گیری پر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ سارو تقی نے شاہ کو باخبر کیا کہ علی مردان کے ذمہ مال گذاری کی کثیر رقم واجب الادا ہے۔ علی مروان خان دربار میں حساب فہمی کے لیے طلب کیا گیا تھا لیکن وہ ٹال مٹول کرتا اور بہانے بناتا رہا[19]۔ جب زیادہ دباؤ پڑا تو اس نے کھلم کھلا وزیر اعظم پر اپنی کم اعتمادی کا اعلان کر دیا لیکن یہ وعدہ کیا کہ بارہ ہزار تومان سالانہ ادا کیا کرے گا۔ بشرطیکہ وہ آزاد رکھا جائے۔ اس نے اپنے بیٹے محمد علی بیگ کو حاضر دربار کر دیا لیکن شاہ کو اطمینان نہ ہوا۔ حالانکہ جانی خان قرچی باسی کہتا ہی رہا کہ ناظم قندھار کیساتھ سخت گیری نہ کی جائے لیکن اس نے سیاپوش قلار اقصی کو علی مروان کی جگہ کام کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اسی کو حکم دیا گیا کہ جس طرح ممکن ہو علی مردان خان کو حاضر کر دے۔

مغل افسروں سے امداد کی اپیل

اتنے بڑے لشکر کے ساتھ سیاپوش کی آمد نے مردان خان کو جان بازی پر مائل کر دیا۔ اس پریشانی میں ایک اضافہ یہ بھی ہوا کہ محافظ فوج بالاتفاق اس کی وفادار نہ رہی۔ بعض قزلباش سپاہیوں سے علیحدہ ہو کر سیاپوش سے جا ملے۔ ان حالات میں مقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہ رہ گیا۔ شام کے انتظام کے ڈر سے اس

نے قندھار کے ایک سربر آوردہ زمیندار ملک مغدود کی یہ تجویز رد کر دی۔ اسی لحاظ سے اس نے معذور کے بھائی کامران کو عوض خان قاقشال سپاہ سالار غزنی او سعید خان ناظم کابل کی خدمت میں روانہ کی تاکہ وہ ان لوگوں سے ایسے نازک وقت پر امداد طلب کرے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے شاہجہان کو بھی ایک خط لکھا کہ اگر وہ ایک افسر کے ساتھ کوئی معقول لشکر ذمہ داری لینے کے لیے بھیج دے تو وہ اس کے سپرد قندھار کر دے لیکن بعد میں جب علی مردان خان کی حالت نازک ہوئی تو اس نے بڑے جوش کے ساتھ سعید خان اور قلی خان سے دوبارہ اپیل کی۔

قندھار کی سپردگی

14/ فروری 1638ء کو عوض خان ایک ہزار فوج لے کر غزنی سے روانہ ہوا بارہ دن میں قندھار پہنچا۔ علی مردان خان نے فوراً اس کو قلعہ میں داخل کر لیا۔ 28/ فروری کو شاہجہان کے نام سے خطبہ پڑھا اور 9/ مئی مسکوک مہریں ایک عجز نامہ کے ساتھ عوض خان کے پہنچ آنے کے متعلق دربار روانہ کیا۔ اس درمیان میں سعید خان کابل سے چل کر قلات غلزائے پہنچ گیا۔ اس پر قبضہ کر کے قندھار کی طرف بڑھا، جہاں عوض خان کے آنے کے 4 روز بعد وہ پہنچا۔

فوج میں انتشار

اس درمیان میں محافظ فوج برگشتہ ہو گئی۔ ان میں سے بعضوں نے علی مردان خان کے رویہ پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ یہ لوگ سیاپوش سے خفیہ طور پر خط و کتابت بھی کر رہے تھے۔ اس مخالف جماعت کا سرگروہ قندھار کا قاضی محمد امین تھا۔ اس نے علی مردان خان کو رائے دی کہ مکاری و دغابازی سے وہ عوض خان کو قتل کر دے۔ اس کا سر شاہ کے پاس بھیج دے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں سے علی مردان بہت متاثر ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا افسر مشہد قلی، علی مردان کے پاس آگیا۔ جس سے اس نے اپنی دماغی کشمکش کا ذکر کیا۔ اس افسر نے رائے بدلنے کی مخالفت کی۔ اس نے سمجھایا کہ معاملات اس حد تک پہنچ چکے

ہیں کہ آپ کا اب رویہ تبدیل کرنا بیکار ہے۔ اس رات علی مردان آرام کی نیند سویا اور صبح کو قندھار شاہی فوج کو باقاعدہ سپرد کر دیا[22]۔ بایں ہمہ سیاوش کی موجودگی علی مردان خان کے لیے بھیانک خواب بن گئی تھی۔ وہ متفکرانہ انداز میں کابل اور ملتان سے آنے والی کمک کا انتظار کرتا رہا۔

شاہجہاں کی ہیجان خیز خبر مسرت

جب قلیچ خان اور سعید خان کے مراسلات اور علی مردان کے خطوط شاہجہان کو ملے تو وہ بہت خوش ہوا۔ دکن کی شاندار فتوحات کے بعد قندھار پر قبضہ کو اس نے اپنی فتوحات کا سر تاج سمجھا۔ اس نے سعید خان کو فوری حکم بھیجا کہ علی مردان خان کی امداد کے لیے روانہ ہو جائے۔ 5 لاکھ روپیہ کابل کے خزانے سے لے لے۔ ایک لاکھ علی مردان خان کو دے دو لاکھ اپنے پاس رکھے اور بقیہ دو لاکھ ملازموں میں تقسیم کر دے۔ مزید بر آں اسے حکم دیا کہ ملک مغدود اور اس کے بھائی اور علی مردان کے دوسرے ماننے والوں کو بھرپور انعامات دیے جائیں۔

قندھار کی مدافعت کے انتظامات

قندھار کی مدافعت کے انتظامات مکمل کرنے کے لیے شہنشاہ نے قلیچ خان کو 5 ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔ اسی کو قلعہ کی مدافعت بھی سپرد کر دی۔ یوسف خان تاشقندی، ناظم بھکر اور جان نثار ناظم، ناظم سیستان قندھار کو محافظ دستہ کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا کہ اگر ایرانی سپاہ قندھار واپس لینے کی کوشش کرے تو محافظ دستہ کی لوگ مدد کریں۔ مزید احتیاطی اقدام کے سلسلے میں شاہزادہ شجاع کو 12 ہزار ذات اور ساٹھ ہزار سوار کا منصب دار بنا کر کابل بھیجا گیا اس کو حکم دیا کہ اگر شاہ صفی قندھار پر حملہ کرے تو وہ قندھار پہنچ جائے ورنہ خان دوران، جے سنگھ، امر سنگھ، کج سنگھ، مادھو سنگھ، لہراسپ وغیرہ کو بھیج دے۔ پنجاب کے ناظم وزیر خان کی رسید مہیا کرنے کے احکام صادر کیے گئے۔

ایرانی پسپائی

قندھار کے واقعات پر پھر سے نظر کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہاں پہنچنے پر سعید خان نے موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا۔ محافظ فوج پر شبہ اور دشمنی کا غلبہ سیاپوش کی موجودگی سے اس کی توجہ کا مرکز بنا اس نے باہری دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے اور امن قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے لڑکے اور علی مردان خان کو قلعہ میں چھوڑ کر وہ یکم اپریل کو باہر کوچ کر گیا۔ دشمن سے مقابلہ کے لیے پوری فوجی تیاری سے باہر نکلا۔ ہراول دستہ کی جھڑپ سے لڑائی کا آغاز ہوا راجہ جگت سنگھ شاہی فوج کا سرغنہ تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ہر طرف لڑائی کا بازار گرم ہوا۔ مغلوں کے داہنے بازو کی قیادت علی مردان کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھی اس کو شکست ہوئی لیکن سعید خان کی بروقت کمک نے صورت حال بدل دی۔ فوج نے دھاوا بولا اور حملہ رد کر دیا۔ لڑائی ختم ہو گئی سیاہ پوش حالمند کے اس پار بھاگا۔ شاہی فوج نے پیچھا کیا۔ اس کے سارے خیمہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ سعید خان قندھار واپس آیا۔ شہنشاہ کو اطلاع بھیجی۔ شہنشاہ نے بست اور زمین، اور 24ھ کے استیصال کا حکم دیا۔

قندھار کے قبضہ کے بعد ہنوز جا بجا جھڑپیں ہو رہی تھیں کہ یادگار بیگ، سفیر شاہ صفی، صفدر خان کے ساتھ مغلیہ دربار آیا۔ جو خط وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس میں شاہ صفی کا ترکی کے طاقتور سلطان کو شکست دے کر اودان واپس لینے کا بیان بڑی شان و شوکت سے کیا گیا تھا۔ حسب معمول سفیر کا استقبال مناسب تعظیم کے ساتھ آگرہ میں کیا گیا لیکن درباری مؤرخ، صفدر خان کے ہمراہ ہونے کا ذکر نہیں کرتے۔

صفدر خان کی واپسی

معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایران میں ابھی تک اس لیے رکا رہا کہ شاہ صفی کی تیاریوں اور رجحانات کی واقفیت حاصل کرے جب وہ قندھار پہنچا تو سعید خان

سے بتایا کہ اس نقصان کو شاہ نے بری طرح محسوس کیا ہے۔ اکثر اس نے کہا کہ میں اروان یا بغداد تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن قندھار نہیں، اس کے واپس لینے کے لیے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کروں گا۔ صفدر خان نے سعید خان کو یہ بھی اطلاع دی کہ شاہ ایک زبردست فوج بھیجنے کو سوچ رہا ہے۔ لیکن مغلوں کی خوش قسمتی تھی کہ مراد چہارم کی تسخیر بغداد نے مغربی سرحد پر شاہ صفی کو پوری طرح مصروف کر رکھا تھا۔ اور جب ترکی سے صلح کرنے کے بعد اس نے قندھار کا رخ کیا تو بڑی دیر ہو چکی تھی کیونکہ شاہ پرستوں کا اقتدار اب وہاں پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ پھر بھی شاہ نے رستم خان کو خراسان کی طرف بڑھنے اور اس مہم کے لیے فوج جمع کرنے کا حکم دیا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس منصوبہ پر عمل ہو شاہ کا انتقال 2/ مئی 1642ء کو ہو گیا۔

مرزا حسین کے ایران جانے کا مقصد

مرزا حسین کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ہے۔ ایرانی دربار میں اس کا اچھا خاصا استقبال ہوا۔ شاہ صفی نے شاہجہاں کے خط کا جواب بھی جلد ہی دیا۔ مغل شہنشاہ کو اس نے عم کے لقب سے یاد کیا۔ اس کی فتح پر اظہار مسرت کیا۔ لیکن دکن کے حکمرانوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ یہ فرد و گذاشتہ معنی خیز تھی چونکہ شاہ کے تعلقات بیجاپور اور گولکنڈہ سے خوشگوار تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ مغل بادشاہ نے ان کے ساتھ زیادتی کی۔ اس کے اس سیاسی احساس اور ناپسندیدگی کے اظہار کا صرف ایک یہی طریقہ تھا کہ موضوع کا سارا ذکر ترک کر دیا گیا۔ ہندوستان سے ایرانی سفیر، یعنی یادگار بیگ اپنے وطن 1639ء میں واپس آ گیا۔ جو خط اپنے آقا کے لیے لے گیا اس میں شاہجہاں نے قندھار کے حادثہ کا حق بجانب ہونا اور اپنی معذرت کا ذکر کرتے ہوئے سب کچھ فراموش کر دینے کی خواہش کی تھی۔ لیکن اس کے بعد سے ایران و مغل دربار کے تعلقات جیسے بھی رہے ہوں خوشگوار نہ تھے۔

عباس ثانی

شاہ صفی کا جانشین شاہ عباس ثانی تخت نشینی کے وقت صرف ۱۱ سال کا لڑکا تھا۔ اس کی نابالغی میں سارو تقی، بحیثیت وزیر سارے انتظامات انجام دیتا تھا۔ ایران کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کے بیرونی دشمن اس وقت سرگرم نہ تھے۔ سلطان مراد کا انتقال ہو چکا تھا اس کا جانشین ابراہیم اپنے پیش رو کی طرح حوصلہ مند نہ تھا اور ازبک قوم اپنے داخلی مصائب میں مبتلا تھی۔ فطری طور پر سارو تقی نے موقع کو غنیمت سمجھ کر قندھار پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے رستم خان کو حکم دیا کہ پھر اس فوج کو مرتب کرے جو شاہ صفی کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ جب اس کی تیاری کی خبر شاہ جہان کو ملی تو اس نے شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ ایک زبردست فوج لے کر مقابلہ کرے۔ یہ سن کر سارو تقی نے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا[29]۔

جان نثار خان ایران روانہ کیا گیا

کشمیر سے واپس ہو کر جس وقت شاہجہاں لاہور میں اس غرض سے قیام پذیر ہوا کہ یہاں سے کابل جائے اور بلخ کی مہم کی نگرانی کرے۔ 26/مارچ 1646ء کو اس نے جان نثار کو بحیثیت سفیر ایران[30] بھیجا۔ شاہ صفی کے انتقال کے بعد یہ پہلا مشن تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں پھر وہ دوستانہ تعلقات شاہ سے قائم کرنا چاہتا تھا جو قندھار پر قبضہ کرنے کے بعد شکست ہو گئے تھے۔ علاوہ بریں یہ ضروری تھا کہ استر خان کی طرف سے شاہ عباس ثانی کی غیر جانب داری کا یقین حاصل کر لیا جائے کیونکہ مغل شہنشاہ اپنے حوصلہ کی تکمیل ماورالنہر کرنا چاہتا تھا۔ سفیر بھیجنے کا بہانہ شاہ عباس ثانی کی تخت نشینی پر مبارک باد دینے کو بنایا گیا۔ جو بظاہر ناموزوں تھا۔

خط کا مضمون

جان نثار خان جو خط شاہجہان کی طرف سے لے گیا وہ کافی طولانی تھا۔ عصری سیاسی حکمت عملی کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے اس میں تعزیت و تہنیت، نصیحت

و معذرت کا بڑا دلچسپ امتزاج ہے۔ رنگین عبارت میں خود غرضی کی ایک لہر بھی رواں دواں ہے۔ اپنے زمانے کے حسب مذاق خط کے شروع میں حمد و نعت رسول ہے اس کے بعد چند کلمات شاہ صفی کی موت پر بطور اظہار غم ہیں۔ شاہجہاں کا کہنا ہے کہ شاہ کی موت اس وجہ سے ہوئی کہ میری تجویزوں پر عمل نہ کیا گیا۔ یہ تجویزیں اس خط میں لکھی گئی تھیں جو شاہجہاں نے صفدر خان کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ اس کے بعد کی عبارت میں تخت نشینی پر مبارک باد ہے۔ ان سب باتوں کے بعد اصل مقصد یعنی قندھار کا ذکر آتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "ہر خاص و عام کو علم ہے کہ علی مردان خان کا وہ لڑکا جو اب تک ایران میں تھا براہ کرم ہندوستان واپس بھیج دیا جائے۔ دوستانہ امداد کی پیشکش پر خط ختم ہو جاتا ہے۔ جان نثار خان کا یہ مشن خاطر خواہ کامیاب ہوا۔

لیکن ایران کے بادشاہ کی خاموشی شاہجہاں کے دوستانہ اظہار کا نتیجہ نہ تھی۔ اس بے عملی کی اصل وجہ خود ملک کی سیاسی حالت تھی۔ شاہ عباس ثانی ہنوز نابالغ تھا، کم سنی کے انتظامیہ کی خرابیوں نے کسی خارجی حکمت عملی کا نفاذ پائیداری کے ساتھ نہ ہونے دیا تھا۔ وزیر سارو تقی بنیادی طاقت اپنے ہاتھوں میں سمیٹ رہا تھا، ایک ایک کر کے اپنے مخالفین کو ہٹا رہا تھا۔ رستم خان اور اس کے بھائی اور میر فتح اللہ سردار توپ خانہ کو تہ تیغ کر چکا تھا۔ اس کے اشارے پر بہت سے افسروں کو صرف اس لیے برخواست کیا گیا کہ وہ اس کی رائے سے متفق نہ تھے۔ بالآخر اس کے خلاف جذبۂ بیزاری اتنا بڑھا کہ یکم اکتوبر 1645ء کو اسے قتل کر دیا گیا[32]۔

بلخ کی جنگ کے بعد شاہجہاں کا خط عباس ثانی کے نام

ان حالات میں شاہجہان کو موقعہ ملا کہ وہ ماوراالنہر میں اپنا جنگی منصوبہ بغیر کسی خلل کے پورا کر سکے اور اس نے بلخ پر حملہ کر دیا۔ وہاں کا حکمران نظر محمد ایران بھاگ گیا۔ شاہ ایران سے پناہ کی درخواست کی۔ فتوحات کے بعد شاہ جہاں نے ارسلان[33] بیگ کے ہاتھ عباس ثانی کو ایک خط بھیجا جس میں ماوراالنہر کا

تذکرہ کرتے ہوئے جواز کا پہلو پیش کیا۔ اس نے لکھا اس ملک میں مسلمانوں پر ستم ہو رہا تھا ان کی جان و عزت بچانے کے لیے وہ لاہور سے کابل آیا اور شہزادہ مراد کو بلخ فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ خط کی آخری عبارت قابل توجہ ہے لکھتا ہے "خدا کا شکر ہے کہ بلخ اور بدخشاں پر قبضہ ہو گیا دعا ہے کہ کہ اس فتح کو وہ ہمارے لیے باعث برکت بنادے ہم اس کے دروازے پر سائل کی طرح کھڑے ہیں کہ سمرقند و بخارا کو بھی ہمارے قبضہ قدرت میں عطا فرمائے۔" ماوراالنہر کی فتح و شکست دونوں جلد ہی ہوئیں۔ پہلی اکتوبر 1647ء کو اس بے فیض علاقہ کو مغلوں نے خیر باد کہا۔

مغل فوجوں کی عظمت مجروح

مغلوں کی بلخ میں ناکامی نے ان کی فوجی عظمت کو ماوراالنہر میں سخت صدمہ پہنچایا۔ یکے بعد دیگرے دونوں مہموں کی فوری فتوحات نے فوج کے سپاہیوں کو تھکا دیا اور وہاں کے صبر آزما موسم نے ان کی روح کو سرد کر دیا۔ علاوہ اس کے 1648ء تک شاہ عباس ثانی بالغ ہوا حکومت کی باگ ڈور اس نے اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ بہادر اور حوصلہ مند تھا۔ چاہتا تھا کہ اپنے عہد حکومت کو کسی نمایاں فتح سے منفرد کرے۔ اس سلسلہ میں اس کی نظر میں اس سے بڑا کوئی شاندار موقعہ نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے شہنشاہ سے تیغ آزمائی کرے۔ اس کی عظمت کا تقاضا تھا کہ قندھار واپس لے، مغلیہ فوج کی تھکاوٹ اس کے لیے ایک بڑی نعمت ثابت ہوئی۔

قندھار واپس لینے کی شاہ کی تیاریاں

شاہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں تیاریاں شروع کیں، ہندوستان تک خبر رسانی کے ہر سلسلے کو روک دیا۔ دو مغل سفیر جو اس کے دربار میں قیام پذیر تھے ان کو چلتا کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے مغربی اور شمالی سرحدوں کی مدافعت کے انتظام سے اطمینان حاصل کیا۔ نظر محمد کے یہاں سے عبدالغازی خان ساکن

ارگنج اور سلطان ابراہیم کی آمد سے اسے اطمینان ہوا کہ وہ ان کے صلح جویانہ ارادوں پر بھروسہ اور اطمینان بغیر کسی خلل کے پورا کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے سارے ذرائع مقابلہ کے فراہم کر سکا۔

اپنے عظیم جدِّ امجد شاہ عباس ثانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے شاہ جہاں کے پاس شاہ قلی بیگ کی معرفت خط بھیجا جس میں مغل بادشاہ کے اس عمل کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے نظر محمد کو بلخ واپس کر دیا۔ اور بڑی عاجزانہ درخواست کی کہ وہ قندھار چھوڑ دے۔ اس خط کا کیا جواب ہو گا شاہ کو پوری طرح معلوم تھا اپنی پیش بینی کے لحاظ سے اس نے پوری فوجی تیاریوں کا حکم دیا ہر جنگی محاذ کے لیے اس نے رسد اور غلہ فراہم کیا۔ متعدد بڑی توپوں کا انتظام کیا اور ایک بڑی فوج تیار کر کے حکم دیا کہ وہ کسی وقت بھی کوچ کے لیے تیار رہے۔ چونکہ یہ اس کے عہد کی پہلی فوجی مہم تھی اس لیے ناکامی کے خطروں کا بڑی احتیاط سے انتظام کیا گیا۔ حسب توقع مغل بادشاہ نے شاہ کا مطالبہ رد کر دیا۔ شاہ کی فوجیں قندھار کی طرف بڑھیں وہ خود بھی 16/دسمبر 1648ء کو قندھار پہنچا اور قلعہ پر تصرف حاصل کرنے کا فوراً حکم دیا۔

شاہجہاں کی دفاعی کوشش

شاہ عباس ثانی کے قندھار واپس لینے کی خبر نے مغلیہ دربار میں بڑی ہلچل پیدا کر دی شاہجہاں مدافعت کے لیے فوراً کابل جانا چاہتا تھا لیکن اس کے وزراء جاڑے کی شدت کے مقابلہ سے خوفزدہ تھے۔ ان لوگوں نے اس کی تجویز کی مخالفت کی اس لیے شاہجہاں دہلی چھوڑ کر لاہور میں رکا تا کہ قندھار کے حالات معلوم ہوتے رہیں۔ اس ہونے والے حملہ کے پیش نظر علی مردان خان ناظم کابل نے 5 ہزار فوج اور 5 لاکھ روپیہ قلعہ کی مدافعت کے لیے فوراً بھیجا نفری کی کمی سے شمال مغربی سرحد کے دو کلیدی قلعوں میں سے ایک قلعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

شاہ عباس ثانی کی نقل و حرکت

قندھار میں ایران کی نقل و حرکت کی تفصیل کا بیان غیر ضروری ہے۔ شاہ عباس ثانی نے تینوں قلعوں کا محاصرہ بیک وقت کیا۔ لیکن قندھار کے قلعہ پر سب سے زیادہ دباؤ ڈالا۔ بست کے ناظم پردل خان نے ایک مختصر جنگ کے بعد ہتھیار ڈال دیا اور زمین داور کے محافظ دستہ کو قندھار کے فتح ہو جانے تک مہلت دی گئی۔ دولت خان سپہ سالار کو پیچیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھی اس کی وفاداری میں متفق نہ تھے۔ شادی خان کی سرکردگی میں ایک جماعت مصر تھی کہ قلعہ فوراً دے دیا جائے۔ دولت خان کے رویہ سے بے اطمینان ہو کر اس نے دغابازی سے قلعہ کا راز حملہ آوروں کو بتانا شروع کیا۔ ایک بار تو اس نے یہ بھی کیا کہ محافظ دستہ کی بے اطمینانی ایک پرزہ پر لکھ کر ایک تیر میں نتھی کر کے ایرانیوں کی طرف پھینک دیا۔ اس بات کی خبر پا کر شاہ عباس ثانی نے دولت خان کو ایک ایسا خط جو دھمکیوں اور ساتھ ساتھ مصالحت سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے اپنی فوج کی طاقت کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلایا کہ یہ وہی لشکر ہے جس نے ترکوں سے ارداں چھین لیا تھا۔ اس نے دولت خان کو ایک ذی وقار عہدہ پر مامور کرنے کی امید دلائی بشرطیکہ وہ قلعہ سے دستبردار ہو جائے۔ شادی خان نے نامہ بر کو قلعہ میں داخل کر لیا۔ دولت خان کو اسکے آنے کی اطلاع دی۔ بجائے اس کے کہ وہ شادی خان سے سختی کے ساتھ پیش آئے اس کو کوئی عبرتناک سزا فوراً دے اس نے صرف شادی خان کو بلایا اور جواب طلب کیا۔ بعد ازاں نامہ بر سے ملاقات کرنے پر وہ رضامند ہو گیا بادشاہ کا خط پڑھا، جواب میں پانچ دن کی مہلت مانگی۔ درخواست منظور ہوئی۔

قندھار کا زوال

پانچویں دن ایک ایرانی افسر علی قلی شادی خان کے حصار میں یہ پتہ لگانے آیا کہ دولت خان نے کیا فیصلہ کیا۔ اس وقفہ میں آخر الذکر نے پوری کوشش کی کہ

محافظ دستہ مدافعت کے لیے تیار ہو جائے لیکن جہاں زور کی ضرورت ہوتی ہے وہاں زبان کام نہیں دیتی۔ بالآخر شادی خان نے ویس قرن پھاٹک ایرانیوں کے حوالہ کر دیا۔ اب دولت خان کی حالت نا قابل برداشت ہو گئی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ فوج نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ چار و ناچار دولت خان کو شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دینا پڑا۔ 11/ فروری 1649ء میں قلعہ پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ شاہ نے یہاں کا سپہ سالار محراب خان کو بنایا اور شاہ قلی خان کو ایک معذرت نامہ کے ساتھ شاہجہاں کے پاس بھیجا۔

تبصرہ

یہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے کہ ایران اور مغل حکمرانوں کے متضاد دعوؤں کی روشنی میں بتایا جائے کہ دراصل قندھار کس کی ملکیت تھا۔ کیونکہ دریائے ہامون ایران کی سرحدی لکیر ہے اور بابر نے بہت پہلے اس کی ابتدائی مالکوں سے لڑ کر یہ علاقہ چھین لیا تھا۔ ایرانیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ شاہ حسین ارخون نے شاہ اسمٰعیل کو اس پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی اور ہمایوں نے طہماسپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ دے گا اگر وہ اس کے ملک واپس لینے کی مہم میں مدد کرے۔ پہلی نظر میں ایرانیوں کا دعویٰ زیادہ پر زور معلوم ہوتا ہے لیکن ہم اس امداد کی نوعیت پر غور کریں جو طہماسپ نے ہمایوں کو دی تھی اور اس رویہ کا بھی خیال کریں جو ایرانی فوجوں کا آخر الذکر کے ساتھ تھا تو شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر شاہ طہماسپ نے دو عملی کا وہ کھیل شروع کیا جس کی وجہ قندھار پر حملہ کرنے کی جنگ حریفوں کی عزت کا سوال بن گئی۔

اورنگ زیب کی پہلی مہم

جب شاہجہاں نے دولت خان کے اس مراسلے کو دیکھا جس میں شاہ کے قندھار پر قبضہ کرنے کی کوشش کا ذکر تھا اس نے شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان[38] کو حکم دیا کہ پچاس ہزار فوج لے کر قلعہ کی رہائی کے لیے فوراً چلے جائیں۔

دونوں سپہ سالار "بھیرا" میں ملے اور پیشاور کی طرف بڑھے وہاں سے کوہاٹ جمرود اور جلال آباد ہوتے ہوئے 25/ مارچ 1649ء کو کابل پہنچے۔ اس درمیان میں قندھار فتح ہو چکا تھا۔ شہنشاہ نے شہزادے کو حکم دیا کہ قبل اس کے کہ ایرانی اپنا قدم مضبوطی سے جما سکیں وہ تیز رفتاری سے وہاں پہنچ جائے۔

باوجود رسد کی قلت اور راستے میں فراہمی کی دقت کے شہزادہ اور سعد اللہ خان نے شہنشاہ کے حکم پر سختی سے عمل کیا۔ کابل میں رکے بغیر وہ غزنی روانہ ہو گئے یہاں انہوں نے 15 دن قیام اس لیے کیا کہ جو کچھ غلہ مل سکے حاصل کر لیں۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر قلات غلزا میں 9/ مئی کو پہنچے شہنشاہ خود کابل آ گیا تھا اس کی ہدایت کے بموجب سعد اللہ خان فوج کے 5 دستے لے کر قندھار کے محافظ لشکر کو موسم بہار کی فصل کاٹنے سے روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ 14/ مئی کو یہاں پہنچا۔ شہزادہ دو دن بعد اس سے ملا اسی دن قندھار کا محاصرہ شروع ہو گیا۔

بدقسمتی سے شاہی فوج کو ابتداء ہی سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ راجہ مان گوالیاری اور بھاو سنگھ ولد جگت سنگھ نے جوش جوانی میں چھل زینہ پہاڑی پر دھاوا بول دیا۔ ان لوگوں کے خیال میں اس مقام کی مدافعت بہت کمزور تھی۔ لیکن محراب خان نے خفیہ طور پر بندوقچیوں کا ایک دستہ یہاں بھیجا۔ جیسے ہی شاہی فوج ان کے حدود نشانہ میں آئی۔ دشمنوں نے گولے برسانا شروع کر دیے۔ قلیل سپاہیوں کے ساتھ راجپوت واپس آئے انہوں نے پہاڑ کے درمیانی حصہ میں لکڑی کا ایک حصار بنا لیا اور کچھ عرصہ تک اس پر قابض رہے۔

شہزادہ ہنوز قندھار کے محاصرہ میں مصروف تھا کہ اس نے قلیچ خان کو آس پاس کے اضلاع میں لوٹ مار کے لیے بھیجا۔ آخر الذکر نے کامیابی سے بست کے چاروں طرف کی فصل پر قبضہ کر لیا۔ سیستان میں میں خونشی پر حملہ کیا۔ اس کے اس کے بعد قباد خاں اور اللہ قلی خان کو زمین داور کی غارت گری کے لیے بھیجا گیا

جب یہ لوگ مال غنیمت لے کر لوٹ رہے تھے تو ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ نجف قلی میر آخور اور حاجی منوچہر کی قیادت میں ان کو دریائے ہامون کے پار بھگا دیا۔ اپنی شکست پر قلیج خان کشک ناخود تک پسپا ہونا پڑا۔ وہاں سے 24 میل قندھار کے جنوب مشرق میں سنگ بالا حصار پر اس نے دم لیا۔

ایرانی فوجوں کی پہلی آمد کی اطلاع اس وقت ملی جب دو ہزار آدمیوں نے اورنگ زیب کے خیمہ سے چار میل کے فاصلے پر پہنچ کر بہت سے جانوروں کو قبضہ میں کر لیا۔ لیکن ان کا پیچھا کیا گیا۔ اور وہ مال غنیمت چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سعد اللہ کے مشورہ سے قلیج خان کی امداد کے لیے رستم خان کو بھیجا گیا۔ 25/ اگست کو بالا حصار میں وہ قلیج خان سے ملا۔ یہاں سے جاسوس بھیجے گئے کہ ایرانیوں کی فوج کی نقل و حرکت کا پتہ لگائیں۔ اب مغلیہ فوج نے بالا حصار اور شاہ میر ک درمیانی راستے پر پڑاؤ ڈالا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایرانی سپہ سالار مرتضٰی قلی حملہ کی زد میں آ گیا۔

شاہ میر کی لڑائی

طرفین کے جاسوسی سپاہیوں کی ناتمام جھڑپ سے لڑائی کا آغاز ہوا۔ مغل پیچھے ہٹے اور شاہ میر کو اپنا مرکز بنایا، یہ مقام اوغان داب پر تھا۔ جب انہوں نے ایرانی فوج کو دیکھا تو رستم خان نے اپنے آدمیوں کو فوجی ترتیب سے کھڑا کیا۔ اس کے توپ خانے کی لمبی قطار کے پیچھے نظر بہادر اور راؤ ستر سال ہراوّل دستہ کے سرغنہ تھے۔ داہنا حصہ رستم خان اور بایاں حصہ قلیج خان کی قیادت میں دوسری قطار بن گئے۔ دونوں کناروں پر سردار خان کا داہنا بازو اور شاد خان کا بایاں بازو محافظت کر رہا تھا۔ دشمنوں نے بھی اسی طریقے پر اپنی فوج مرتب کی اسی صبح مرتضٰی قلی سپہ سالار پہنچا اور اس نے قسم کھائی کہ جب تک ہندوستانی فوج کو ہرا نہ دے گا روزہ افطار نہ کرے گا۔

شاہ میر کی لڑائی کا آغاز طرفین کی زبردست آتش باری سے ہوا۔ لڑائی اگلی

صف میں ہو رہی تھی کہ ایرانیوں نے چکر کے ساتھ مغلیہ فوج کی پشت اور بازو پر دباؤ ڈالا۔ قلیج خان اور شاد خان غیر مفتوح انداز میں مقابلہ کرتے رہے۔ سردار خان نے ہتھیار ڈال دیا، اس کی مدد کو رستم خان بروقت پہنچا۔ ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد حملہ آور دشمنوں کو پسپا کر دیا ایرانیوں کا جارحانہ حملہ شکست ہوا رات کے پس پردہ وہ پسپا ہوئے، کچھ توپیں اور توڑے دار بندقیں مغلوں کے ہاتھ لگیں۔

قندھار کی پہلی جنگ میں یہ فتح صرف ایک نجات دہانی تھی اس سے قطعی فتح کے امکانات میں کسی طرح اضافہ نہیں ہوا۔ محاصرہ چلتا رہا۔ شہزادہ اورنگ زیب کی عقل کام نہ دیتی تھی۔ بالآخر سعد اللہ خان کی تجویز پر ایک زمین دوز نہر اس لیے بنائی گی کہ خندق سے پانی کھینچ لیا جائے لیکن محافظ دستہ نے محاصرین کی یہ کوشش قلعہ سے زبردست گولہ باری کر کے بے کار کر دی۔ موسم سرما کی آمد، محاصرہ کرنے والی توپوں کی قلت نے شہنشاہ کو یہ حکم دینے پر مجبور کیا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ حسب الحکم اورنگ زیب 3/ ستمبر 1649ء کو قندھار سے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔

شاہجہاں سفیر ایران کے خیر مقدم سے گریز کرتا ہے

قندھار کے محاصرہ شروع ہونے کے ایک مہینہ بعد ایرانی سفیر کابل آیا۔ شہنشاہ ایسا برافروختہ تھا کہ شرف حضوری کی اجازت نہ دی۔ البتہ جعفر خان کو اس کے آرام پہنچانے کا حکم دیا۔ ایک مہینہ بعد شاہ کے خط کا بغیر کسی تحریری جواب کے قاصد کو رخصت کر دیا۔ شہزادہ اورنگ زیب کو حکم دیا کہ اسے ایران جانے دیا جائے جعفر خان سے شہنشاہ نے زبانی جو کچھ کہا اس کا خلاص یہ ہے کہ "اپنے آقا سے کہہ دو کہ دو خاندانوں کے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات باقی رکھے لیکن صاحب اقتدار دوستوں کی قدر و قیمت کا وہ لوگ اندازہ کرتے ہیں جن کو قدرت نے ذہانت عطا کی ہے...... بہر حال جب قندھار یر اس (شاہ)

کے مہم کی خبر ہمارے علم میں آئی تو شہزادے کو زبردست فوج کے ساتھ اس پر قبضہ رکھنے کے لیے مقابلہ کے واسطے بھیجا۔ اب ہمارا قیام کابل میں ہے چونکہ ہماری فوجوں کی خبر سے شاہ ہرات چلا گیا ہے۔ شہزادے کو اس سے نبرد آزمائی کا شوق تھا۔ اس لیے قندھار کے محاصرہ کی ابتدا کی گئی۔ بفضلہٖ میں نے وہ سب کچھ کر دیا جو ممکن تھا اور اس کے آگے بھی جو کچھ ممکن ہوگا وہ خود دیکھے گا اور دنیا بھی[39]۔

مغل ناکامی کے اسباب

اس پیام میں تکبر اس شرم کا مترادف ہے جس سے مغلیہ فوج کو قندھار میں دوچار ہونا پڑا۔ اپنی طاقت کے لامحدود زعم میں شاہجہاں نے نہ تو ایرانیوں کے ذرائع کا خیال کیا اور نہ ان کی قوت مدافعت کا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس سے پہلے بھی قندھار ایسے مستحکم شہر کو کبھی طوفانی انداز یا اچانک حملے سے فتح نہیں کیا گیا۔ لیکن اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لیے وہ جلد سے جلد جنگ کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو فوج اس نے بھیجی وہ نہ اسلحہ سے اور نہ سامان خور و نوش سے پوری طرح آسودہ تھی اور پھر قندھار ایسا زرخیز ملک بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی فوج کو کھلا پلا سکے۔

مغل شہنشاہ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے ایرانیوں کی ترقی یافتہ توپ خانہ کو مد نظر نہ رکھا۔ آخر الذکر چونکہ ترکوں سے برابر لڑتے رہے اس لیے ان کو آتش بار اسلحہ سے بہ نسبت مغلوں کے زیادہ واقفیت تھی توپ خانہ کے سلسلے میں مغلوں کا دارومدار مخلوط النسل مغربی باشندوں پر تھا۔ علاوہ دیگر توپوں کے دو توپیں قندھار میں ایسی نمایاں صلاحیت کی تھیں کہ مغلوں کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مغلوں کے سپاہیوں اور افسروں میں ذاتی بہادری کی کمی نہ تھی۔ لیکن ہلاکت انگیز آگ کے سامنے بہادر اور بزدل میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں ایرانی سپہ سالار محراب خان ان تھک سرگرمی

اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا تھا۔ مغلوں کی شرمناک شکست دینے میں جتنا برتر توپوں کا حصہ تھا اس سے کم اس سپہ سالار کی صلاحیت کا حصہ نہ تھا۔ جس کے حکم پر توپ خانہ کام کر رہا تھا۔

دوسری کوشش

قندھار پر حملہ کرنے کی کوشش 1649ء میں ختم کی گئی۔ 1652ء میں پھر دہرائی گئی۔ گذشتہ سال کے ابتدائی اگست ہی میں کشمیر سے لوٹتے ہوئے شہنشاہ نے اپنے افسروں کو مجوزہ لڑائی کی تیاری کا حکم دیا۔ شاہ شجاع کو بنگال سے بلایا گیا، راجہ جے سنگھ، راجہ جسونت سنگھ، رستم خان، اللہ وردی خان، راجہ وٹھل داس وغیرہ کو اگلے سال یعنی 20/ جنوری 1652ء کو دربار پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ رستم خان دو لاکھ روپیہ لے کر لاہور میں حاضر ہوا اپنے تولے جانے کی رسم ادا کرنے کے بعد لاہور سے شاہجہاں چلا اور 4/ اپریل 1652ء کو کابل پہنچا۔

پہلے مواقع کی طرح اس بار بھی فوجوں کی قیادت شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان کے سپرد تھی۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ 2/ مئی 1652ء محاصرہ کا آغاز کریں۔ فوجوں کی تعداد پچاس ہزار اور ساٹھ ہزار کے درمیان تھی۔ ان میں 1/5 بندوقچی اور توپ خانے والے تھے۔ افسروں کی تعداد 1/20 تھی فوج میں دو بڑی توپیں تھیں جن میں سے بعض ستر پونڈ کا گولہ پھینک دیتی تھیں 20 چھوٹی توپیں تھیں جن میں 4 یا 5 پونڈ وزن کے گولے پھینکنے کی طاقت تھی 20 چول[1] چھلا ہاتھیوں پر رکھی تھیں اور ایک سو ایسی توپیں اونٹوں پر تھیں محکمہ نقل و حمل کے سپرد شہنشاہ کے ذاتی فیل خانے سے منتخب ہاتھیوں کے علاوہ بہت سے اور ہاتھی فوجوں افسروں کی ملکیت میں سے سپرد کیے گئے۔ مزید بر آن تین، ہزار اونٹ بھی اس فوج کے استعمال میں تھے۔"

پہلے محاصرہ کے حادثات دہرائے گئے۔ چہل زینہ پہاڑی اور فیطل کی ماہی

---

[1] گھومنے والا چھلا جس سے دو چیزوں کو جوڑتے ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر گھوم سکے۔

پشت چوٹی پر راج روپ اور مہابیت خان نے طوفانی انداز میں دھاوے کیے مگر نتیجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان کی خندقیں آگے نہ بڑھ سکیں۔ فتح کے امکانات ہمیشہ کی طرح نظروں سے اوجھل رہے۔ توپ خانہ جس پر مغلوں کو بڑا ناز تھا وہ بڑے بُرے وقت ناکام ہوا۔ اورنگ زیب کی خندق میں اسّی (80) توپیں اسی لیے پھٹ گئیں کہ ان میں ضرورت سے زیادہ وزنی گولے لگا کر نشانہ مارنے کی کوشش کی گئی۔ قاسم خان کی دو توپوں نے کام نہیں کیا اور جو توپیں سعد اللہ کے خندق میں تھیں ان کا صحیح استعمال نہ ہوا۔ تجربہ کار کام کرنے والوں کی کمی تھی برخلاف اس کے ایرانی توپچی تھے جن کی نشانہ بازی سے مغلیہ فوجوں میں موت کی بارش ہو رہی تھی انہوں نے خاموشی سے اس موقع کا انتظار کیا کہ دشمن ان کی زد میں آجائے۔

دوران محاصرہ شہزادہ اورنگ زیب نے اس ایرانی سپہ سالار اوتار خان کو بہکانے کی کوشش کی جو قندھار میں محراب خان کی جگہ متعین کیا گیا تھا۔ اس کے پاس شہزادہ نے حاجی بہادر کو اس پیام کے ساتھ بھیجا کہ تم کو مغل حکومت میں بڑی ممتاز جگہ پر سرفراز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اوتار خان نے شہزادہ کی پہلی ناکامی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ اگر اورنگ زیب ہندوستان واپس ہونے میں شرم محسوس کرتا ہے تو وہ ایران چلا جائے اور اپنے جدامجد ہمایوں کی طرح شاہ سے ملازمت کی درخواست کرے۔ اس جواب کے ساتھ حاجی بہادر کو مغل پڑاؤ میں بھیجا گیا۔

ناکامیابی

اس طرح باوجود شان و شوکت کی تیاریوں کے مغلوں کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شاہجہاں نے حکم دے دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اورنگ زیب نے بہت کوشش کی کہ وہ اسے کچھ وقت دے۔ لیکن بادشاہ نے زیادہ دانش مندی سے کام لیا۔ فوج تھک گئی تھی سپاہی اس دیر طلب اور ناکام مہم کے بعد اپنے گھر جانا چاہتے تھے۔ حسب الحکم شہزادہ 9/ جولائی کو قندھار سے کابل روانہ ہوا۔ 7/ اگست کو باپ کی

خدمت میں حاضر ہوا۔

تیسری کوشش کی تیاریاں

اورنگ زیب کی پے در پے دو ناکامیاں اور جان و مال کا سخت نقصان بھی شاہجہاں کے غرور کو کلیتاً ختم کرنے کے لیے کافی نہ ہوا۔ اس کو اب بھی کچھ کامیابی کی امید تھی۔ اس امید کو دارا کی باتوں نے اور ہوا دی۔ اس نے کہا میں وہ سب کچھ حاصل کرلوں گا جواب تک نہیں ہوا۔ صوبجات کابل اور ملتان اس کے سپرد کردیے گئے۔ 30ہزار ذات اور 20ہزار سوار کا منصب بھی عطا کیا گیا اس کو ایک موقع قندھار فتح کرنے کو دیا گیا۔ شہزادہ اپنے باپ کے ساتھ لاہور آیا۔ وسیع تیاریوں کا اس نے حکم دیا۔ توپ خانہ کی ترقی و طاقت پر خاص توجہ کی گئی۔ قاسم خان میر آتش اور محمد صالح مشرف شاہی توپ خانے کی نگرانی میں دو(2) توپیں ایسی بھی تیار کرائی گئیں جن میں ایک من سولہ سیر کا گولہ استعمال کیا جاسکے۔ ایک تیسری توپ جعفر خان، شہزادہ کے میر آتش نے بنوائی۔ تیس ہزار گولے، پانسو من بارود، پانسو من سیسہ، چودہ ہزار ہوئی بان سے محاصرہ کرنے کی تنظیم مکمل کی گئی۔

آدمیوں کے لحاظ سے شہزادہ کے ساتھ 107 منصب دار، 1,500 حادی، جن میں آدھی تعداد سوار بندوقچیوں کی اور آدھی سوار کمانداروں کی تھی، 2000ہزار پیدل جن میں فتیلہ کو آگ دینے والے، توپچی اور ہوائی بان چلانے والے، 6000 سرنگ اڑانے والے اور 500 سرنگ کھودنے والے سپاہی اور 500 بہشتی تھے۔ سر بر آوردہ افسروں میں جے سنگھ، قولیج خان، رستم خان، ستر سال اور علی مردان خان تھے۔ آٹھ سو ہاتھی، تین ہزار اونٹ بار برداری کے لیے تھے۔ شہزادہ کی مرضی پر دو کروڑ روپیہ صرف کے لیے تھا۔ اس طرح یہ مہم شاہجہاں کے عہد کی ہر لحاظ سے سب سے زبردست معرکہ آرائی تھی، لیکن نمایاں ناکامیاب ثابت[40] ہوئی۔

دارالاہور سے جاتا ہے

11/فروری 1653ء کو دارالاہور سے روانہ ہوا۔ بیس دن میں ملتان پہنچا۔ یہاں کچھ دن اس لیے قیام کیا کہ افسران اس کے ہمراہ ہو سکیں۔ 22/مارچ کو اس نے دریائے نرمدا پار کیا اور اپنے آدمیوں کو سخت حکم دیا کہ باشندوں سے کوئی راستے میں چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ حالانکہ ابھی پوری فوج نہ پہنچی تھی مگر محاصرہ کی نیک ساعت قریب آ رہی تھی اس لیے شہزادہ نے رستم خان کو قندھار بھیج دیا کہ وہ اپنے پڑاؤ کی جگہ منتخب کرے۔

قندھار پہنچتا ہے

23/اپریل 1653ء کو دارا قندھار پہنچا۔ قلعہ کا باضابطہ محاصرہ خندقوں کے سلسلہ سے شروع ہوا۔ رستم خان کو اس نے حکم دیا کہ بست کی سرنگ پر نظر رکھے۔ کوئی کمک، محافظ دستے کی آمد کو نہ آ سکے۔ شاہی فوجوں کی ترتیب وہی تھی جو گزشتہ دو موقعوں پر ہوئی تھی۔ شہزادہ نے اپنا خیمہ لکاہ پہاڑی کے قریب کے پیچھے ایک تالاب پر کامران کے باغ میں نصب کیا یہ جگہ قلعہ سے ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ راجہ جے سنگھ کو پچھلے پھاٹک کے سامنے قولیج خان، اولیس قرنی پھاٹک پر اور مہابت خان کو باباولی دروازہ کے سامنے، اخلاص کو چہل زینہ پہاڑی کے سامنے تعینات کیا گیا۔ خندقوں کے درمیان جابجا توپ خانہ مرتب کیا گیا۔

جب محافظ دستہ کو ہندوستانی افواج کے بڑھنے کی خبر ملی تو اوتار خان نے ایک تیز رفتار قاصد فرمان قلی کو، شاہ کے پاس امداد کے لیے بھیجا۔ شاہ نے حاجی منوچہر اور واقلان بیگ کو قندھار کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ اس کے علاوہ علی قلی خان سپہ سالار کو حکم ہوا کہ اپنے آدمیوں کا اجتماع بسطام میں کرے لیکن امدادی افواج کے پہنچنے سے پہلے ہی مغل قندھار پہنچ گئے۔ کثرت تعداد کے ہراس سے بے نیاز ہو کر اوتار خاں نے حملہ آوروں کا استقبال قلعہ سے سخت آتشبازی سے کیا، اس نے اپنے نشانے کے لیے شہزادہ کی قیام گاہ کا خاص طور سے انتخاب کیا۔ اپنی توپوں کا

دہانہ اسی طرف بڑی کامیابی کے ساتھ رکھا۔

شہنشاہ کی حسب ہدایت دارا نے دریائے ہامون کے ساحل پر ایرانیوں کے روکنے کے لیے رستم خان کو بھیجا۔ وہ 21/ مئی 1653ء کو بست پہنچا، اور دس دن کے محاصرہ کے بعد کمانڈر مہدی قلی کی شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ہی گرشک کا قلعہ قبضے میں آگیا۔

بست کی تسخیر کے بعد دارا نے ایک نظم لکھ کر محافظ دستے کو بھیجا جس میں اس بات کی دھمکی تھی کہ اگر وہ خاموشی سے قلعہ نہ سپرد کردے گا تو قتل عام کے لیے تیار رہے، لیکن وہاں سے یہ جواب ملا۔ چاہے ساری دنیا کی تلواریں حرکت میں آجائیں، مگر خدا کی مرضی نہیں تو وہ ہمیں نہیں کاٹ سکیں گی، دھمکی کے بعد پھسلانے کی کوشش کی گئی۔ شہزادہ نے دلفریب انعامات اور معزز جگہیں فوج سے الگ ہونے والوں کے لیے پیش کیں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لالچ میں قلعہ چھوڑ کر چلے آئے لیکن اکثریت نے آخر تک مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔

ہنوز یہ جذبات فروشانہ ڈراما کھیلا جارہا تھا کہ راجا جروپ نے 14/ جولائی کو چہل زینہ پہاڑی پر دھاوا کر دیا۔ اس کے لکڑی کے لٹھوں اور تختوں سے ایک سرپوش راستہ تعمیر کیا اور اس کے زیر سایہ بلندی پر چڑھنے لگا اس نے توپوں سے حصار کو بھی مسمار کرنے کی کوشش جو پہاڑی کے لیے محافظ کا کام کرتا تھا مگر توپوں کا نشانہ اتنی دور نہ جاسکا۔ صورت حال کو اور ابتر بنانے کے لیے محافظ دستہ نے حملہ آوروں پر حصار کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھار کر دی۔ بہت سے لوگ مر گئے۔

رستم خان کو بھی ایک ایسی ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بست کی تسخیر کے بعد اس کو زمین دار فتح کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قرب وجوار کے اضلاع غارت کر دیے۔ ایک بار تو دریائے ہامون عبور بھی کر گیا۔ وہاں کے جمع شدہ ایرانیوں کو منتشر بھی کر دیا۔ لیکن جلد ہی فضا بدل گئی۔ محافظ دستے کی روک

تھام اور بڑھتی ہوئی ایرانی فوجوں کی یورش نے اس کو اپنی جگہ بر قرار نہ رہنے دیا۔ زمین داور چھوڑ کر وہ "بست" پس پا ہوا یہاں بھی ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ قندھار واپس آ گیا۔ اس پر شہنشاہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔

دارا جب ملتان سے آ رہا تھا تو راستے میں ایک میر کاروان نے بتایا کہ قندھار کے محافظ دستے کو غلہ کی بڑی کمی ہے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ جنگ کو طول دے کر وہ قلعہ فتح کر لے گا۔ مغل فوجوں میں یہ افواہ عام تھی اسی سے لوگوں کی سر گرمی میں کمی آ گئی تھی۔ اس افواہ کی تردید میں اوتار خان نے غیرت خان کی خندق پر ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ قلعہ میں دو سال تک کے لیے کافی غلہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نے طنز بھی کیا کہ اب تک شاہی فوج کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ ساتھ ہی ایک حربی دعوت حملہ کرنے کی دی۔ دارا نے جواب دیا کہ وہ اپنی دو بڑی توپوں کا انتظار کر رہا ہے وہ کسی لمحہ آسکتی ہیں۔ وہ آ جائیں تو مدافعت کرنے والوں کو تیار کر دیا جائے۔ اوتار خان نے اس دھمکی کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب لکھا کہ جب تک میرا سر میرے دوش پر ہے قندھار کی سپردگی ناممکن ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ تسخیر کا خیال ترک کر کے ہندوستان واپس چلے جاؤ۔

اوتار خان کا یہ طنز آمیز چیلنج با اثر ثابت ہوا۔ دارا نے قلعہ فتح کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔ ساری بڑی توپیں ایک جگہ جمع کی گئیں تا کہ ان کے زیر سایہ شاہی فوجیں خندق تک پہنچ سکیں اور اس میں مٹی سے بھرے ہوئے بورے ڈال دیں، لیکن یہ تدبیر ناکام ہوئی۔ اس کے بعد کوشش کی گئی کہ بند توڑ کر خندق کا پانی بہا دیا جائے، لیکن محافظ دستہ نے اپنے لیے پانی فراہم کرنے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کر لیے۔ بالآخر جن توپوں کا دیر سے انتظار تھا وہ اگست کی ابتداء میں آ گئیں اور شاہی فوجوں نے آتش باری شروع کر دی۔ تین سو گز کی دفاعی تعمیرات کو بھی مسمار کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ مٹی کے باہری دھس بھی برباد ہو گئے لیکن قلعہ میں داخل ہونا ممکن نہ ہوا اس کی بنیاد پر مٹی کا انبار تھا۔

دارا کی واپسی

محاصرہ کی ابتدا سے اب تک چار مہینے گزر چکے تھے پھر بھی کامیابی کی امید اتنی ہی دور رہی جتنی کبھی تھی۔ شاہی فوجوں کی اسلحہ کی رسد ختم ہو گئی تھی۔ ان کی گولہ باری بند تھی اس سے فائدہ اٹھا کر اہل قلعہ نے دفاعی تعمیرات کی مرمت شروع کر دی۔ دارا نے ایک بار پھر کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ جب اصل فوج کسی ایک جگہ قلعہ پر حملہ کر کے سارے محافظ دستہ کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس وقت راجہ جے سنگھ دوسرے محاذ سے قلعہ پر چڑھ جائے۔ لیکن فوج کی مختلف جماعتوں میں اتحاد عمل نہ ہو سکا اس لیے منصوبہ ناکامیاب ہوا اور شاہی فوجوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

بالآخر محاصرہ کو طول دینے کی بے اثری کا یقین شاہجہاں کو آگیا یہ بھی وہ مان گیا کہ قندھار ناقابل تسخیر ہے۔ اس پر چڑھائی کرنا پاگل پن ہے۔ اس لیے اس نے دارا کو واپس بلا لیا۔ دارا 27/ستمبر کو قندھار سے روانہ ہو کر اکتوبر میں ملتان پہنچا۔ اس کے ایک ماہ کے بعد لاہور آگیا۔

تبصرہ

قندھار میں مغلوں کی ناکامیابی کے اسباب غور کرنے میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شکست کی سب سے بڑی وجہ توپوں کی کمتری اور آتش بار اسلحہ سے ناواقفیت تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایرانی ہمیشہ مدافعانہ لڑائی لڑتے رہے۔ قلعہ کی مخصوص جائے وقوع اور پائداری سے ان کو فائدہ ہوا۔ علی مردان خان کی توجہ نے اس کو بہت بہتر بنا دیا تھا۔ علاوہ بریں دو ایرانی سپہ سالار محراب خان اور اس کا جانشین اوتار خان خصوصیات کے مالک تھے یہ لوگ ہمیشہ خطروں کا مذاق اڑاتے رہے۔ ان میں قوت برداشت بھی تھی اور ماننے والوں کو ان پر اعتماد بھی تھا۔ آخری وجہ یہ کہ سرزمین قندھار کی غیر مہمان نوازی سے غلہ کی فراہمی مغلوں کے لیے ہمیشہ عذاب جان رہی۔ سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ مغل شہنشاہ

زبردست فوج محاذ پر بھیجتا رہا جس کی وجہ سے اتنا بڑا کیمپ ہو گیا تھا کہ بجائے سنجیدگی سے آگے بڑھنے کے مغلوں کی راہ میں وہ حائل ہوتا رہا۔

ایران اور مغل درباروں کے سرکاری تعلقات اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت تک کے لیے ختم ہو گئے۔ جنگ وراثت کی ابتدا میں ہم دیکھتے ہیں کہ شہزادہ مراد، شاہ عباس ثانی سے پرزور خط و کتابت کر رہا تھا اس لیے کہ اس کی امداد سے وہ اپنے حصول تخت و تاج کا مدعا پورا کرنا چاہتا تھا۔ واقعہ ہے کہ اس کی مدد کے لیے شاہ ایران نے قندھار میں کچھ فوجیں اکٹھا بھی کی تھیں کہ اگر وہ طلب کرے تو روانہ ہو جائیں لیکن اس امداد سے فائدہ اٹھانے کا کبھی[41] موقعہ نہ آیا۔ اورنگ زیب سے شکست پانے کے بعد دارا نے بھی شاہ ایران سے امداد کی درخواست کی تھی[42]۔ لیکن شاہجہاں عمر بھر اس ذلت کو بھلا نہ سکا۔ جس کا سامنا اس کی سپاہ کو قندھار میں کرنا پڑا۔

باب 10

ثقافتی ادارت

دربار

شاہجہاں کا دربار شاہانہ شان و شوکت کے عروج کا نمونہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں مغلیہ سلطنت دولت و خوش اقبال کے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ہندوستان کی دولت و ثروت کا شہرہ سن کر بیرونی ممالک سے متعدد سیاح یہاں آتے رہے، شہنشاہ کے عظیم الشان جاہ و جلال اور ماحول دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ اس کے دربار کا ٹھاٹ باٹ ان کے طائر خیال سے بالاتر تھا نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک بے دریغ تحسین و آفرین کرتا۔ برنیر، بٹودرنیر اور منوچی نے اپنے تاثرات کا بڑا دلکش بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن اطلاعات کا وافر ذخیرہ جو وہ لوگ فراہم کر گئے ہیں اس سے مغل دربار کی آب و تاب و خیرت انگیزی کا اچھا خاصا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔

شہنشاہ

اس عظمت و شوکت کی آرائش و ترتیب کا مرکز خود شہنشاہ تھا۔ اس کا میانہ قد تھا اور رنگ گندمی تھا، اس کی پیشانی کشادہ، بھویں ابھری ہوئی، ناک کسی قدر جھکی ہوئی لیکن سیدھی، آنکھیں چمکدار اور بھورے رنگ کی لیکن پتلیاں سیاہ تھیں،

اس کی آواز شیریں تھی فصاحت کے ساتھ فارسی زبان بولنے پر اس کو قدرت حاصل تھی۔ باپ دادا کے برعکس اس کی ڈاڑھی متشرع مسلمانوں کی ڈاڑھی کی طرح دراز تھی۔ اس کے ہاتھ نہ تو بہت دراز تھے نہ بہت چھوٹے دست راست کی چار انگلیوں پر تل تھے جو فال نیک کی علامت سمجھے جاتے تھے اس لحاظ سے اس کا جثۂ شاہانہ اقتدار کے لیے بہت موزوں تھا۔

اس کا مزاج

مزاج کے لحاظ سے وہ محنتی و سخت گیر تھا۔ صفائی کا اس کو حد سے زیادہ خیال رہتا۔ اس کی پنجگانہ نماز شاذ و نادر ہی قضا ہوئی ہو۔ جب وہ دار السلطنت میں ہوتا تو ماہ رمضان کا روزہ بھی شاید ہی قضا ہوا ہو۔ مقدس راتوں میں اپنا نصف وقت عبادت و خیرات میں صرف کرتا۔ عطر کا اس کو غیر معمولی شوق تھا اس کا لباس معطر ہوتا۔ بات چیت میں خوش گفتار و اخلاق میں نرم مزاج تھا، اس نے کبھی لفظ، "تو" نہیں استعمال کیا چاہے اس نے کتنے ہی گرے اور سفلہ آدمی سے خطاب کیا ہو۔

عام خیال کی تردید

سرکار[2] نے بڑی سمجھ بوجھ کر یہ بات کہی ہے کہ اس زمانہ میں تخت شاہی تختہ گل نہ تھا۔ بادشاہ کو اپنے فرائض ادا کرنے پڑتے۔ تقسیم اوقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس ذمہ داری سے وہ واقف بھی ہوتا[3]۔ یہ عام خیال کہ مغل بادشاہ کی زندگی شادمانی عیاشی، لہو و لعب، ہوس رانی کا ایک مسلسل دائرہ تھی بالکل غلط ثابت ہوتا ہے جب ہم اس کی مصروفیات کی باریک سے باریک تفصیل پر نظر ڈالتے ہیں جو فارسی کے عصری مؤرخوں کی تحریر کے مطابق ہے، کہ اس کو روز مرہ کے پروگرام پر سختی سے عمل کرنا تھا خواہ بادشاہ دار السلطنت میں ہو یا میدان جنگ میں، اس بات کا کثرت سے ثبوت ملتا ہے کہ شاہجہاں محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ سرکاری کاموں اور تفریحات میں برابر برابر اپنے اوقات کا حصہ وہ

صرف کرتا۔

معمولات

طلوع آفتاب سے دو گھڑی پہلے وضو کر کے اپنی ذاتی مسجد میں جاتا۔ جانماز پر بیٹھ کر نماز کے وقت کا انتظار کرتا، بعد نماز فجر طلوع آفتاب تک تسبیح پڑھتا اگر سفر میں ہوتا تو یہ عبادت اپنے خاص کمرے میں ادا کرتا۔

جھروکہ

مسجد سے وہ جھروکہ درشن[4] جاتا، یہاں ہر صبح اپنی رعایا کو درشن دیتا۔ یہ دانشمندی کا عمل اکبر نے شروع کیا تھا، اس کے جانشینوں نے اس سلسلے کو قائم رکھا۔ اس عمل کے پس پشت اقتدار کی نمایش اتنی زیادہ نہ تھی جتنی اپنی رعایا سے قریب تر ہونے کی حکمراں کی خواہش کارفرما تھی علاوہ بریں اسی زمانے میں جب سلطنت کا ڈھانچہ بادشاہ کی شخصیت پر مبنی تھا تو رعایا کو اس بات کا یقین دلانا ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بیدار مغز بھی ہے اور جسمانی لحاظ سے بالکل صحیح وسالم بھی ہے۔ یہاں عوام کو اجازت تھی کہ وہ بلا تکلف بادشاہ سے مل سکتے ہیں اور بغیر کسی درمیانی شخص کے براہ راست بڑے سے بڑے سرکاری حکام کی بھی شکایت کر سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کیا عام آدمی کو اتنی ہمت ہو سکتی تھی کہ وہ براہ راست شہنشاہ سے باتیں کر سکے، شاہانہ شان وشوکت اس کو مرعوب کر سکتی تھی اور اس سے بھی زیادہ یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ کیا وہ ایسے حکام بالادست کی دشمنی مول لے سکتا ہے جو بذاتہ انتقام جو، بدکار اور انتظامات میں دخیل بھی تھے۔ لیکن جہاں تک شاہجہاں کا سوال ہے تو یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ وہ کمزور سے کمزور رعایا کی شکایات سنتا تھا اور خطاکار کو، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ افسر کیوں نہ ہو سزا دینے میں کوتاہی نہ کرتا۔ مغل بادشاہوں کی خوبیوں میں یہ ایک اضافہ ہے کہ انہوں نے اپنی رعایا کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جو ازروئے انصاف ان کا

فیصلہ کرتا، اگر لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو ساری غلطی شہنشاہ کی نہ تھی۔

جھروکہ درشن میں علاوہ فریاد سننے اور عوام کی سلامی لینے کے کئی امور اس کی توجہ کا مرکز تھے۔ یہیں وہ نوگرفتار ہاتھی بھی شہنشاہ کے ملاحظہ کے لیے لائے جاتے جو دربار عام کے میدان میں نہ پیش کیے جا سکتے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے شاہجہاں اپنے محبوب مشغلہ ہاتھیوں کی لڑائی سے لطف اندوز ہوتا۔ بعض دن پانچ پانچ جوڑی ہاتھیوں کی شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے اسی جگہ لڑائی جاتی۔ یہیں منصب دار بھی اپنے فوجی دستے جائزہ کے لیے حاضر کرتے۔

دیوان عام

جھروکہ درشن میں تخمیناً ایک گھنٹہ صرف کرنے کے بعد شہنشاہ دیوان عام میں چلا جاتا۔ یہ رعب دار عمارت سنگ سرخ سے بنائی گئی ہے، اس میں چالیس کھمبے ہیں۔ اس کے تین طرف متصل صحن ہے اور چوتھی طرف پردے کی دیوار ہے جس کو پچی کاری اور سطح سے متعلق اتار چڑھاؤ کے کام سے پوری طرح آراستہ کیا گیا ہے آگرہ کا دیوان عام وضع قطع کے لحاظ سے سادہ ہے۔ دہلی قلعہ کے ہال کی فنی آرائش جو اس کی نمایاں خصوصیت ہے وہ آگرہ کے قلعہ میں نہیں ہے۔ ایسا ہی ایک ہال مگر تناسب میں چھوٹا اسی غرض سے لاہور کے قلعہ میں بنایا گیا تھا۔ جب کبھی شہنشاہ خیمہ زن ہوتا تو وہاں بھی وقتی طور پر بڑے بڑے خیموں کا ایک دربار عام موجود ساز و سامان سے تیار کر دیا جاتا۔

ترتیب بہ لحاظ عہدہ

دیوان عام کے اندر و باہر افسر درباری سپاہی سب کے سب ایک خاص ترتیب کے ساتھ شہنشاہ کے نزول اجلال کے انتظار میں قبہ پر نظریں جمائے کھڑے رہتے۔ دیوان عام کا کنارہ نقری سلاخوں سے بند رہتا۔ صرف دو سو گھوڑوں، یا زیادہ کے منصب داروں کو اندر لے جانے کی اجازت ہوتی۔ حسب مرتبہ درجہ بدرجہ تخت شاہی کی طرف منہ کر کے سب کھڑے ہوتے، ستون

کے قریب صرف خاص منصب داروں کو جگہ دی جاتی قبہ کے بائیں جانب قورچی شاہی علم لیے دیوار کی طرف پشت کیے ہوئے کھڑے رہتے دوسری طرف قبہ کے زیر سایہ سلطنت کے خاص و عام حکام معہ ضروری کاغذات حضور شہنشاہ پیش کرنے کے لیے حاضر رہتے۔

نقرئی سلاخوں کے باہر دوسری کشادہ جگہ ایسی لکڑی کی سلاخوں سے گھیری تھی جو سرخ لاکھ کے رنگ سے رنگی ہوئی تھیں، اس جگہ دو سو سوار کے منصب سے کم رتبہ فوجی افسر، احادی، کماندار توپچی اور بعض بلند ترین منصب داروں کے چند مصاحبوں کو قیام کی اجازت دی جاتی۔ لکڑی کی سلاخوں کے باہر امراء کے ادنیٰ خادم اور پیدل سپاہی کھڑے رہتے، ان سلاخوں کے درمیان داخلہ کی اجازت تین پھاٹکوں سے دی جاتی جن کی سخت حفاظت ہوشیار افسروں اور عصابر داروں کے سپرد ہوتی۔

کاروبار

ظہور شہنشاہ سات بج کر چالیس منٹ پر ہوتا اسی وقت سے کاروبار کا سلسلہ آغاز ہو جاتا۔ سب سے پہلے اعلیٰ بخشی منصب داروں کی عرضیاں پیش کرتا اور بعدہ حضور شاہ ان لوگوں کو حاضر کرتا جو ترقی کے مستحق ہوتے۔ جو لوگ بیرون ہند بھیجے جانے کے لیے تعینات کیے جاتے ان کو خلعت اعزاز عطا کیا جاتا۔ اس کے بعد صدر شہنشاہ کے سامنے غربا و مساکین کی درخواستیں اور حضوری میں علماء و مقدس اشخاص کو پیش کرتا۔ اس کے بعد میر سامان و دیوان بیوتات اپنے شعبہ جات کے کاغذات شہنشاہ کے سامنے رکھتا۔ پھر بخشی احادیان، میر آتش اور مصرف، توپ خانہ اپنے اپنے محکمہ کے نئے رنگروٹ حاضر کرتے۔ اس کے بعد با اثر منصبدار شہنشاہ کی خدمت میں وہ عرضداشت یا تحفہ جات پیش کرتے جو صوبجات کے ناظموں، دیوانوں، بخشیوں نے بھیجے تھے۔ اکثر اوقات شہنشاہ بذات خود کاغذات ملاحظہ فرماتا اور ان پر احکام لکھتا

سب کے آخر میں عرض مکرر شہنشاہ کی خدمت میں منصب، جاگیر اور نقدی کے کاغذات پیش کرتا۔ ضروری کام ختم کر کے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا معہ مقررہ مقدار کے معائنہ ہوتا۔

دیوان خاص

دیوان عام سے شہنشاہ دیوان خاص یا دولت خانہ خاص میں جاتا آگرہ اور دہلی دونوں جگہ کے دیوان شاہجہاں کے عہد حکومت میں تعمیر ہوئے تھے۔ ٹیورنیر نے پہلے کا بیان[6] کیا ہے اور میر[7] وارث نے دوسرے کی بڑی خوبصورت تشریح کی ہے۔ یہاں بادشاہ دو گھنٹے تک ان معاملات کے فیصلے کرتا جو انتظامی یا سیاسی وجوہات سے اعلانیہ نہیں ہو سکتے تھے۔ سلطنت کے وزراء اعلیٰ اپنی معروضات شہنشاہ کے روبرو پیش کرتے شہنشاہ کبھی خود فیصلہ قلم بند کرتا کبھی لکھوا دیتا۔ خاص حاجتمندوں کے معاملات کی اطلاع صدر دیتا جس پر شہنشاہ مدد معاش منظور کرتا۔ یہاں شہنشاہ فنون کے نمونوں کا مثلاً کشیدہ کاری، مصوری وغیرہ کا معائنہ کرتا۔ داروغہ عمارات ہمیشہ اس لیے حاضر رہتا کہ شاہی عمارتوں کے منصوبہ پر منظوری حاصل کرے منصوبوں پر یہاں پوری بحث ہوتی۔ اولین عہد حکومت میں آصف خان تعمیرات کے سلسلے میں مشیر خاص تھا۔ دیوان خاص میں شکرے، باز اور تربیت یافتہ چیتے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیے جاتے۔

شاہ برج

دیوان خاص سے اٹھ کر شہنشاہ، شاہ برج جاتا یہاں نہایت راز کی گفت و شنید ہوتی۔ بجز شہزادوں اور تین چار افسروں کے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ کوئی افسر امور متعلقہ کے بعد وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ شاہ برج میں خفیہ فیصلے ہوتے، احکام مرتب ہوتے اور صوبہ جات کے افسروں کو بھیجے جاتے۔ اس کے علاوہ خالصہ (شاہی زمینیں) طالاب یا تنخواہ کے ایسے معاملات جو دیوان خاص میں سے نہ ہو سکتے وہ یہاں فیصل ہوتے۔

اینائی قزوینی لکھتا ہے کہ یہیں گا ہے ماہے شہنشاہ اس کو اس کے کام کی درستی کے لیے طلب کرتا تخمیناً دو ساعت شاہ برج میں صرف ہوتے، یہاں دو پہر گزر جاتی، تب شہنشاہ حرم میں جاتا۔ یہاں بھی کچھ نہ کچھ کام اسے کرنا پڑتا۔ خاصہ تناول فرمانے کے بعد وہ قیلولہ کرتا جب بیدار ہوتا تو ممتاز محل وہ فہرست پیش کرتی، جو اس کی خاص خادمہ، جہانگیر کے درباری شاعر کی بہن ستائی خانم قابل امداد غربا کی تیار کرتی تھی۔ شہنشاہ ہر عرضی کو فرداً فرداً دیکھتا اور احکام صادر فرماتا۔ غریب و محتاج لڑکیوں کے لیے جہیز کا سامان فراہم کیا جاتا اور کبھی کبھی ان کی شادیاں بھی طے کر دی جاتیں، یتیموں اور بیواؤں کو گزراوقات کے لیے روپیہ بھی دیا جاتا۔ شاذ و نادر ہی محل سے کوئی سائل خالی ہاتھ واپس جاتا۔ اس طرح کثیر رقم روزانہ کار خیر و امداد میں صرف ہوتی۔

رفاہ عام

شہنشاہ محل سے 3 بجے سہ پہر کو نکل کر کبھی کبھی دیوان عام میں آجاتا، محل کے پہرہ داروں کا معائنہ کرتا، لیکن عموماً نماز عصر کی جماعت میں شرکت کرتا۔ اس کے بعد شام کو دیوان میں انتظامی معاملات انجام دیتا۔ پھر گانا سنتا یا ہرنوں کی لڑائی دیکھتا اب بڑے بڑے جھاڑ و فانوس روشن ہو جاتے اور ان کی روشنی مرصع پردوں اور مسندوں پر غیر معمولی دلکش ہو جاتی۔ ہم اس روشنی کے حسن دلفریب منظر کا تصور بھی آسانی سے نہیں کر سکتے جو دہلی کے دیوان خاص میں شام کو ہوتی تھی باوجود شاہانہ ساز و سامان سے یک قلم محروم ہونے کے بھی امیر خسرو کے وہ اشعار جو اس کی دیواروں میں ایک طرف نقش ہیں۔ اب بھی احساس دلاتے ہیں کہ یقیناً اس دور میں "دہلی زمین پر بہشت تھی۔

سونے کا وقت

آٹھ بجے شب میں آدھ گھنٹہ کی انجمن آرائی شاہ برج میں کرنے کے بعد شہنشاہ حرم میں واپس آتا، یہاں رات کا خاصہ تناول کرنے کے بعد مستورات کی

نغمہ سرائی سے لطف اندوز ہوتا۔ قریب دس بجے شب کو وہ بستر پر جاتا آرام خاص کے کمرے اور خوش الحان قاریوں کے درمیان ایک پردہ پڑا رہتا تاکہ اس کو وہ لوگ دیکھ نہ سکیں جو دوسری طرف مختلف موضوعات باآواز پڑھتے، موضوعات کی نوعیت میں سفر، بزرگوں کی سوانح عمری، تاریخ وغیرہ ہوتی۔ بابر کی خودنوشت سوانح حیات سے شہنشاہ کو خاص دلچسپی تھی۔

دربار عدالت

اس روز مرہ کے معمول میں صرف جمعہ کو تبدیلی آتی۔ اس لیے کہ یہ مسلمانوں کا مقدس دن ہے اس دن کوئی دربار نہ ہوتا اور چہار شنبہ کو بھی۔ جب شہنشاہ جھروکہ درشن سے سیدھا دیوان خاص جاتا۔ وہاں حق وانصاف کی رو سے مقدمات کا فیصلہ کرتا۔ تخت فیروز پر بیٹھ جاتا، روداد مقدمہ، مصنف افسروں قاضیوں، مفتیوں کے سامنے شروع ہوتی۔ داروغۂ عدالت ہر مقدمہ کو الگ الگ پیش کرتا۔ شہنشاہ دعویداروں سے باتیں کرتا اور حسب شرع فیصلہ کرتا۔

ضبط وتنظیم

مغلیہ دربار ضبط وتنظیم کا مرعوب کن منظر پیش کرتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اخلاق و آداب پر سختی سے توجہ کی جاتی۔ سلسلۂ ترتیب وترجیح منصب داروں کے عہدہ کے اعتبار سے قائم ہوتا۔ سب کو کھڑا رہنا پڑتا۔ صرف شہزادے بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن اجازت لینے کے بعد جہانگیر نے اپنے دربار میں شاہجہاں کی نشست کے لیے ایک طلائی کرسی رکھوادی تھی شاہجہاں نے بھی اپنے بڑے لڑکے داراشکوہ کے لیے یہ رعایت خاص برقرار رکھی۔ صرف وزیر اور میر بخشی اجازت تھی کہ زینے پر قدم رکھ کر تخت کے قریب آسکیں۔ دوسرے لوگوں کو زینہ کے سرے پر رک جانے کا حکم تھا۔

سلام کا طریقہ

شاہجہان بغیر شک وشبہ اپنے جملہ پیشرو سے زیادہ مذہبی تھا۔ خلاف شرع

کوئی طریقہ وہ برداشت نہ کر سکتا۔ اس فہرست میں اکبر کی جاری کردہ رسم سجدہ تھی۔ اسلامی شرع کے لحاظ سے کسی مخلوق کے لیے نہیں صرف خالق کے لیے سجدہ روا ہے۔ اس لیے شاہجہان کا سب سے پہلا حکم اسی رسم قبیح کو ختم کرنے کا تھا۔ اس کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ عام رسم سلام پر اکتفا کرے لیکن مہابت خان نے از راہ خوشامد یہ عرض کیا کہ بادشاہوں اور شاہی خاندان کے لیے اس سلسلے میں بھی کوئی نہ کوئی طرۂ امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے کیونکہ خداوند عالم نے ان کو برتر مرتبہ سرفراز فرمایا ہے[11]۔ اس لیے سجدہ کے بجائے زمین بوسی کی رسم قائم کی گئی۔ سجدہ میں اور زمین بوسی میں یہ فرق ہے کہ سجدہ میں آدمی کو گھٹنے کے بل زمین پر جھک کر جبیں سائی کرنی پڑتی ہے لیکن زمین بوسی میں یہ بات نہیں۔ زمین بوس اپنے دونوں ہاتھ زمین تک لے جاتا ہے تب اٹھا کر پیشانی تک لے جانا پڑتا ہے۔ لیکن بعد میں جب شاہجہاں کو خیال آیا کہ رسم سلام اور رسم سجدہ میں کوئی قابل امتیاز فرق نہیں تو اس نے زمین بوسی کی بھی رسم ختم کر دی۔ اس کے بجائے چار تسلیم رائج کی[12]۔ علماء و بزرگان دین دونوں زمین بوسی و چار تسلیم کے رسوم سے آزاد تھے کیونکہ شہنشاہ ان بزرگوں کا خاص احترام کرتا تھا۔ یہ طبقہ مروجہ اسلامی طریقہ پر عمل کرتا تھا یعنی ایک دوسرے کو سلامت رہنے کی دعا دیتا۔

جب کبھی شہنشاہ برآمد ہوتا خواہ جھروکہ میں یا دربار میں ہر بار اس کا استقبال "شاہ زندہ باد" کے باآواز بلند نعروں سے کیا جاتا، اس کے بعد خاموشی طاری ہو جاتی۔ معمولی کاروبار چپ چپاتے انداز میں انجام پاتے۔ اگر شہنشاہ کسی شخص سے مخاطب ہونا چاہتا تو وہ اس کی طرف اشارہ کرتا اور عصا بردار اس شخص کو تخت کے قریب لاتے۔ وہ شخص مروجہ سلامی کے بعد ہمہ تن انکساری بن کر شہنشاہ" کی گفتگو سنتا۔ اگر وہ خلعت اعزاز سے سرفراز کیا جاتا تو انعام پانے والا دوبارہ سر تسلیم خم کرتا ہوا پچھلے قدم اپنی جگہ واپس جاتا۔ اس وقفہ میں اس کا منہ تخت کی طرف رہتا، کیونکہ تخت کی طرف پشت کرنا انتہائی توہین کا مترادف تھا۔

دیار غیر کے سفراء

غیر ملکی سفیروں کا شہنشاہ کے حضور، دیوان عام میں پیش کرنا امراء کے ذمہ تھا۔ ایرانی سفیروں کا احترام تمام ایشیائی ممالک کے سفراء سے زیادہ کیا جاتا۔ ان کو اجازت تھی کہ اپنے مراسم کے لحاظ سے اپنی طرح سر جھکائیں۔ ان کو غیر معمولی انعامات، مراعات سے سر فراز کیا جاتا۔ لیکن جب ایران سے تعلقات کشیدہ ہوئے تو چشم عنایت بھی بدل گئی۔ جو سلوک ایرانی سفراء سے ہوتا تھا وہ ترکی کی طرف منتقل ہو گیا، بخارا سمر قند اور کاشغر کے سفیروں کا دربار میں تکلفات کے ساتھ خیر مقدم ہوتا۔ لیکن بایں ہمہ آخر الذکر سفراء کو کبھی بھی ان مراعات سے سر فراز نہ کیا جاتا جو کبھی ایرانیوں کو نصیب تھا۔ یورپ سے آنے والے سفیروں کو بہ نظر حقارت دیکھا جاتا۔ بجز سر ٹامس رو کے سترہویں صدی کے نصف اول میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ جس میں کسی سفیر کو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے اعزاز بخشا گیا ہو، اوروں کا ذکر کیا سر ٹامس رو کو بھی اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے سخت جدو جہد کرنی پڑی تھی۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں ڈچ اور انگریزوں کو معمولی تاجر سمجھا گیا۔ ان کو کسی سیاسی حیثیت کا مالک خیال نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مقامی مؤرخ نے ان لوگوں کے بارے میں کوئی توجہ نہ کی۔

ایام جشن

دیوان عام اور دیوان خاص کی عمارات بجائے خود کافی نفیس و شان دار تھیں۔ لیکن ایام جشن میں کافی شان دار خوش سلیقہ آراستگی اور وسیع پیمانہ کے چراغاں سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ نوروز، یوم تخت نشینی، عیدین شب برات، شمس و قمری ایام وزن شہنشاہ کے مواقع پر دیوان مرقع جشن نظر آتے زربفت و کمخواب کے دل بادل شامیانے طلائی حاشیوں سے مرصع ہوتے، ان میں امرا کا زرین لباس میں گلگشت کرنا عجب دلکش منظر ہوتا۔ اسی عالم میں شہنشاہ بے شمار زمرد، موتی اور دوسرے جواہرات سے آراستہ اپنے تخت زرنگار پر جلوہ افروز

ہوتا نذریں قبول کرتا۔ انعامات تقسیم کرتا[14]۔

دربار کے عجائبات

دربار شاہجہاں کی سب سے حیرت انگیز چیز تخت طاؤس[15] تھا۔ اپنی تخت نشینی کے موقعہ پر اس نے یہ تخت تیار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ سات سال میں مکمل ہوا۔ اس کی انتہائی نازک کاریگری کا بیان ٹیوویز، نے پوری وضاحت سے کیا ہے۔

اس تخت کے بعد دوسرا کوہ نور، ہیرا کا تھا جو میر جملہ نے شاہجہاں کو نذر کیا تھا۔

دربار کی اہمیت

لیکن دربار کے وجود کا اولین مقصد شان و شوکت کی نمایش نہ تھا۔ یہ اس کی حیات کا صرف ایک پہلو تھا، دوسرا اور زیادہ کار آمد پہلو اس کی سرگرمی کا عوام میں ثقافت کی تبلیغ وارتقاء تھا۔

ملک کے مرّوجہ سکون اور حکمران کی دلچسپی، دونوں کی آمیزش نے فن وادب کی اشاعت کو پرزور سہارا دیا۔ شعرا، فلسفی، دانش ور، فن کار سب ہی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے دربار میں جمع ہوگئے یہاں سے کبھی کوئی صاحب ذوق محروم نہ گیا۔ نہ علم و ہنر کے جوہر رکھنے میں انعام و اکرام سے سرفراز کرنے میں بادشاہ کو دیر لگتی۔ اس کی تقلید درباری بھی کرتے بلکہ اپنی سرپرستی کی اشاعت میں ایک دوسرے میں مسابقت بھی ہو جاتی لیکن یہ طرز عمل صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو واقعی صاحب علم و فن تھے۔

دانش وران دربار

علاوہ بریں خود درباریوں میں بعض بذات خود بلند پایہ صاحب علم تھے۔ مثلاً علی مردان خان، سعد اللہ خان، سعید خان، ظفر خان، خانہ زاد خان میر جملہ افضل خان، راجہ جے سنگھ وغیرہ رزم و بزم دونوں میں یگانہ روزگار تھے۔ یہ حضرات اپنے ساتھ درباری روایات لے جاتے اور سلطنت کے مختلف صوبہ جات میں ان کی اشاعت کرتے۔ بدقسمتی سے کوئی باقاعدہ تاریخ ان کی ثقافتی جدوجہد کی ہم

تک پہنچ سکی۔ لیکن اس وقت کے سیاسی ادب میں جابجا ایسے حوالہ جات ملتے ہیں جن سے ہم کو کچھ اندازہ ان کی قابلیت کا ہو جاتا ہے۔

تعلیمی ادارے

دربار کے علاوہ بعض اور بھی ایسے ادارے تھے جو عوام میں علم و ہنر کی اشاعت کرتے رہتے۔ ایسے دو ادارے تھے جن کو ہم گورنمنٹ اسکول کہہ سکتے ہیں۔ ایک آگرے میں اور دوسرا دہلی[16] میں تھا۔ ان درسگاہوں کے اساتذہ کا تقرر براہ راست عوامی تعلیم سے واسطہ نہ تھا۔ البتہ اس کی نظر مسجدوں کی امداد پر تھی جو اکثر مرکز علم بھی ہو جاتیں۔ اگرچہ موجودہ دور میں حکومت کی فرض شناسی کے لحاظ سے اس زمانہ کی حکومت بھی تعلیم سے دلچسپی نہ لینے کے سلسلے میں سزاوار ملامت ہے لیکن یہ غیر مخلوط برائی نہ تھی۔

غیر سرکاری ادارے

حکومت کی اس عدم توجہی نے انفرادی وشخصی کوششوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ ایک اہل قلم لکھتا ہے کہ عہد جہانگیر میں ہر شہر اور گاؤں[17] میں مدرسے تھے۔ یقیناً یہ مدرسے سرکاری امداد کے پروردہ نہ تھے۔ ضرور ہے کہ ان کا وجود مقامی وذاتی کاوشوں کا رہین منت ہوگا۔ علاوہ بریں اس دور میں تعلیم دینوی جدوجہد کے دائرہ سے بالکل باہر سمجھی جاتی تھی۔ یہ کام گوشہ نشین عابدوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بزرگان دین تعلیم مفت دیتے تھے یا نام نہاد اجرت لے لیتے تھے۔ مذہبی رہنماؤں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے لاہور[18] احمد آباد برہان پور اور جون پور میں پائے جاتے تھے۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں سرہند، تھانیسور اور انبالہ میں ایسے مشہور و معروف قابل و عالم حضرات رہتے تھے جن سے اکتساب علم کے لیے دور دراز سے طالب علم آیا کرتے۔

کشمیر ایک مرکز علم

اس عہد میں ایک دوسرا اہم مرکز علم، کشمیر تھا۔ اس کی فرحت بخش آب وہوا

پر سکون فضا اور دلفریب منظر نے تشنگان علم کو اپنے دامن میں جگہ دینے کی دعوت دی۔ سینکڑوں طلبگار یہاں بس گئے تاکہ اپنے کارناموں کی تشکیل کر سکیں اور آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ ملا حسن فروغی اور ملا محسن فانی تو اسی سرزمین کے رہنے والے تھے، خواجہ خداوند محمود نے بھی اس کو اپنا وطن بنا لیا۔ ملا شاہ اکثر آیا کرتے تھے۔ کلیم اور قدسی پادشاہ نامہ نظم کرنے کے لیے سکونت پذیر ہو گئے۔

موضوعات برائے تعلیم

ان تعلیمی درسگاہوں کے نصاب میں مختلف مضامین تھے۔ ان کو پڑھانے کے لیے ہمہ گیر اور خداداد قابلیت کے اساتذہ تھے۔ آج کی طرح کسی موضوع کو مخصوص نہ کیا جاتا۔ ہر مفید سائنس سے بقدر ضرورت آگہی حاصل کرنا پیش نظر تھا[20]۔ یہ صحیح ہے کہ دینیات و مابعد الطبیعات پر زیادہ توجہ کی جاتی لیکن تاریخ، ریاضیات، عروض اور خوش خطی بھی محبوب مشغلے تھے۔ امتحانات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ کسی ممتاز پروفیسر سے تعلیم حاصل کرنا ہی کافی قابلیت کا ثبوت تھا۔

زبردست ادبی تحریک

اسی ہمہ زیر طرز تعلیم کا ایک فطری نتیجہ یہ تھا علمی محرکات[21] تیز رفتار ہو گئیں۔ فارسی چونکہ سرکاری زبان تھی اس لیے اس کو سب سے زیادہ فروغ[22] دیا جاتا۔ ادب کا زبردست ذخیرہ اسی زبان میں فراہم ہو گیا۔ اس وقت تک دو مکتب فکر نمایاں طور پر وجود میں آ گئے تھے۔ ایک ہند و ایرانی طرز و اسلوب بیان کا نمائندہ تھا اور دوسرا خالص فارسی کا۔ اول الذکر اسکول کا پہلا ممتاز نمائندہ ابو الفضل تھا جس نے زبان و طرز بیان کو معیاری بنایا اس نے ادق زبان اور پر پیچ اسلوب کا ایک ایسا نمونہ تیار کیا جس میں ترنم و لفظیات کی ضرورت پر بلند خیالی کو اکثر قربان کر دیا جاتا۔ اس عہد حکومت میں ادیبوں کی کثیر تعداد نے اس استاد کی تقلید میں جان فشانی کی، لیکن چند مستثنیات کے علاوہ بہت کم اہل قلم کو خاطر خواہ

کامیابی نصیب ہوئی۔ ایسے اہل قلم میں عبدالحمید لاہوری، محمد وارث، چندر بھان اور محمد صالح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کا طرز بیان

اس زمانے میں جو ہندوستانی فارسی ادب ظہور میں آیا یقیناً وہ خالص فارسی نہیں ہے۔ اس کی توقع کرنا بھی تحصیل حاصل ہے۔ فارسی زبان ہندوستان میں بسنے کے لیے آئی تھی۔ ایسی صورت میں جدید و پر زرر ماحول سے زیادہ دنوں تک علاحدہ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ہندوستانی اثرات قبول کیے ہندوستانی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اس میں ایک امتیازی خصوصیت کا آ جانا لازمی تھا۔ اس طرز بیان و زبان پر بغیر ان عوامل پر غور کیے ہوئے یہ اعتراض کرنا کہ یہ غیر فارسی ہے اہل ہند کی صلاحیت و ذہانت کی توہین کرنا ہے۔ کوئی زبان اپنی خالص عصمت اجنبی اشخاص میں بر قرار نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر مقامی لوگ ذہنی لحاظ سے نا قابل اعتنا ہوں تو دوسری بات ہے، اس لحاظ سے کوئی وجہ نہیں کہ فارسی زبان اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوتی۔

ہند فارسی طرز تحریر اس لیے ترقی کرتی رہی کہ اس کو غیر معمولی درباری سر پرستی حاصل تھی، ابوالفضل کے کارنامے، اسلوب مرصع و مسجع ہونے کی وجہ سے شاہجہاں کو وجدانی طور پر مرغوب تھا۔ اس لیے اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے عہد حکومت کی تاریخ اسی انداز بیان میں قلم بند کر سکے۔ در اصل اس طرز میں ایک نا قابل بیان کشش ہے جو ایک ہندوستانی کے دل کو پسندیدگی پر مشتعل کرتی ہے لیکن ایک غیر ملکی کے لیے بلاشک وشبہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے اس لیے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ اکبر و شاہجہاں کے عہد حکومت کی عظمتیں اس سے کم پر شکوہ زبان میں رقم نہیں ہو سکتی تھیں۔

فارسی مکتبہ

دوسرا مکتبہ خیال یعنی خالص ایرانی اسکول کو ان افسروں کی حمایت حاصل

تھی۔ جو یا تو بلحاظ نسل ایرانی تھے یا اپنے کو ایرانی خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ اولین عہد حکومت میں ملا شکر اللہ، ملقب بہ افضل خان نے بہت سے ایرانی اہل قلم کو نوازا۔ ایسے لوگوں میں امینائی قزدینی اور جلال الدین طباطبائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کا ادبی کارنامہ فارسی ادیبوں کی طرز تحریر سے بالکل مختلف ہے۔ موازنہ کرنے سے دونوں کا فرق نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

ایرانی شعرا

اس عہد حکومت کا بلکہ سترہویں صدی کے نصف حصے کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ایران سے شعرا کا ایک ہجوم ہندوستان آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیضی کے بعد کوئی ہندوستانی درباری شاعر کے عہدے پر مامور نہ ہو سکا۔ وجہ بہت نمایاں ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ ہند فارسی طرز تحریر نثر میں درجۂ امتیاز تک پہنچ گیا تھا لیکن ایرانی شاعری اب تک مقبول و ممتاز تھی۔ جب شاہجہان نے کلیم کو درباری شاعر منتخب کیا تو اس نے گویا اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔

شاعری

طرز اسلوب کے بیان سے الگ ہو کر ہم کو اس پر نظر کرنی ہے کہ اس دور میں ادب کی نوعیت کیا تھی، تاریخ کے بعد ضخامت کے لحاظ سے شاعری کا نمبر آتا ہے حسب مذکورۂ بالا بہترین شعرا وہی تھے جو ایران سے وارد ہوئے تھے لیکن علاوہ ایک یا دو کے ان میں زیادہ تر اوسط درجہ کے فنکار تھے وہ کوئی چیز تخلیقی یا نئی پیش کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ ان کا ادبی کارنامہ بے مزہ بھی ہے اس سے شعور اور وسیع النظری کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ شعرا الفاظ کی الٹ پھیر میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں نئے خیالات پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زیادہ تر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اشعار وجدان سے زیادہ ضرورت کے آوردہ ہیں۔

طرز تخیل و اسلوب بیان

ان کی غزلیات نام کے لیے صوفیانہ انداز فکر کا نمونہ ہیں۔ ان میں عموماً گھسی

پٹی طرز تخیل اور پائمال موضوعات کی بھر بار ہے۔ ان کے استعارات و تشبیہات زیادہ تر گل و بلبل، شیریں و فرہاد، لیلیٰ مجنوں کی داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ ان کی پرواز عام سطح سے بہت کم بلند ہوتی ہے۔ ان کی طرز فکر شاذ و نادر ہی توجہ طلب ہوتی ہے۔ غزل سے ہٹ کر اس دور میں، قصیدہ نگاری پر زیادہ توجہ کی گئی کیونکہ ابتداء میں اس صنف شاعری پر انعام واکرام ملتا تھا۔ شہنشاہ اپنی مدح سن کر بہت محظوظ ہوتا تھا۔ ایک بار مدحیہ قصیدہ پر خوش ہو کر اس نے ایک شاعر کو سونے چاندی میں تولا کر سب کچھ اسی شاعر کو انعام میں دیا تھا۔

رسمی مواقع

بعض ایسے مقررہ رسمی مواقع تھے جب شعراء اپنی فکر و فن کا مظاہرہ کرتے۔ مثلاً شمسی یا قمری تاریخوں کے لحاظ سے جشن ولادت، تخت نشینی کی تقریب، شاہی خاندان میں کسی بچہ کی پیدائش کی خوشی وغیرہ میں وہ مادہ تاریخ نظم کرتے یا قصائد کہتے اور حسب استعداد انعام سے سرفراز ہوتے۔ اس کے علاوہ مشاعرے بھی ہوتے جس میں شعراء ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے شہنشاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے۔

شعراء

شاید خالص فارسی کا سب سے معتبر شاعر شاہجہاں کے دربار میں سعیدائی گیلانی تھا جو عہد جہانگیر سے داروغہ زرگر خانہ تھا، وہ قدیم و جدید مذاق کا مجموعہ تھا[23]۔ اس کے بعض قطعات مادہ تاریخ بڑے حسین و دلکش ہیں۔

کلیم

ابو طالب کلیم شاہجہاں کا درباری شاعر تھا، وہ کاشان میں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی تربیت و نشو نما ہمدان میں ہوئی۔ وہ جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا اور میر جملہ کی سرپرستی میں رہا۔ اس کو روح الامین بھی کہا جاتا تھا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد اس کو شاہی ملازمت نصیب ہوئی۔ شاہجہاں نے اس کی قابلیت کے

اعتراف میں سب سے بڑی عزت سے سر فراز فرمایا۔ اس کے دیوان میں قصائد زیادہ تر شاہجہان کی مدح میں ہیں۔ مثنوی میں اس کی تعمیرات کا بیان ہے۔ ایک ساقی نامہ بھی ہے جس میں ظفر خان ناظم کشمیر کی مدح ہے۔ اس نے پادشاہ نامہ بھی منظوم کیا[24]۔

قدسی

حاجی جان محمد متخلص بہ قدسی کا اظہار بیان نہایت خوش اسلوب و ہر دل عزیز تھا۔ جلد ہی اس نے شاہجہاں کی توجہ حاصل کر لی۔ اس کو پادشاہ نامہ منظوم کرنے پر مامور کیا گیا۔ باغات کشمیر پر بھی اس نے طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ شاہجہاں کی مختلف تعمیر کردہ عمارات پر ایک نظم کہی جس میں 1630ء سے 1638ء تک کی تعمیرات پر مادۂ تاریخ بھی کہے۔ وہ کلیم سے زیادہ قابل سمجھا جاتا تھا[25]۔

کاشی

میر محمد یحییٰ معروف بہ کاشی اپنی اصل، شیراز سے منسوب کرتا ہے۔ وہ ہندوستان آیا تو شہنشاہ اور داراشکوہ کی سرپرستی سے نوازا گیا۔ اس کو بھی پادشاہ نامہ منظوم کرنے کی خدمت سپرد کی گئی لیکن جلد ہی معتوب ہو گیا اور اس کا کام نامکمل رہ گیا۔

صائب

لیکن اس دور کا سب سے عظیم شاعر اور ایک جدید طرز کا موجد مرزا محمد علی متخلص بہ صائب تھا۔ عرصۂ دراز تک وہ کابل میں رہا وہاں اس کو ظفر خان کی سرپرستی حاصل رہی۔ شاہجہاں نے بھی اسے خوش آمدید کہا اور اس کو مستعد خان کے خطاب سے سر فراز فرمایا۔ مگر وہ دربار میں نہ ٹھہرا بلکہ اپنے ابتدائی مربی ظفر خاں کے ناظم کشمیر ہونے پر اس کے ساتھ چلا گیا۔ بعد میں وہ ایران واپس ہو گیا۔ شاہ عباس ثانی نے اسے اپنا درباری شاعر بنا دیا۔

سلیم

سلیم، ظہران کا باشندہ تھا اوروں کی طرح یہ بھی وطن کو خیر باد کہہ کر سر

پرستی کی تلاش میں ہندوستان آگیا[25]۔ وہ زود گو بھی تھا اور فی البدیہہ اشعار کہنے پر بھی قادر تھا لیکن اس کی شاعری قبول عام کا شرف حاصل نہ کر سکی نہ اس کی قابلیت کا اعتراف ہوا۔ وہ اسلام خان کی ملازمت میں تھا۔ اس کی کوچ بہار اور آسام کی مہم سے متاثر ہو کر سلیم نے ایک مختصر سی مثنوی بھی نظم کی تھی۔

مسیح

حکیم رکن الدین عرف مسیح کاشان کا باشندہ تھا۔ پہلے وہ شاہ عباس اوّل کی ملازمت میں داخل ہوا لیکن اس سے کبیدہ خاطر ہو کر ہندوستان چلا آیا۔ یہاں جہانگیر بھی التفات سے پیش آیا اور شاہجہاں نے بھی دل جوئی کی۔ وہ ایران واپس گیا اور 1656ء میں وہاں اس کا انتقال ہوا[29]۔

رفیع

حسن بیگ کا تخلص رفیع تھا۔ وہ مشہد سے بخارا گیا۔ وہاں نظر محمد خان نے اس کو فرمان نویس کا عہدہ دیا۔ تخمیناً 1545ء میں وہ ہندوستان چلا آیا۔ شاہجہاں نے نظر التفات کی، وہ پیشہ ور شاعر تو نہ تھا لیکن پھر بھی اسلوب بیان نہایت جان دار اور رواں تھا۔ جب بھی اس نے اپنی نظمیں حضور شاہ حاضر کیں اس کو دل کھول کر داد ملی[20]۔

فاروق

محمد فاروق ابن خواجہ محمد صدیق نہایت بیدار مغز شخص تھا۔ وہ افسروں اور درباریوں میں بڑا ہر دل عزیز تھا، دلچسپ نظمیں لکھتا تھا۔ پہلے اسے افضل خان کی اور پھر سعید خان کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ آخر الذکر کے ہمراہ وہ کابل چلا گیا۔

مُنیر

ہند فارسی مکتبہ خیال کے شعراء میں مولانا ابو البرکات کا نام سر فہرست ہے ان کی عرفیت منیر[32] تھی۔ وہ مورخ محمد صالح کا قریبی دوست تھا۔ وہ عمدہ نثر نگار بھی تھا۔ ہمہ گیری کے لحاظ سے اس کا نمبر صرف فیضی کے بعد آتا ہے۔ اس کی

بعض نظمیں بڑی دلچسپ ہیں۔

شیدا

مُلّا شیدا کی پرورش و پرداخت فتح پور میں ہوئی۔ لیکن بعد میں وہ دہلی چلا گیا۔ قدرت نے اسے ہجویہ انداز بیان، حاضر جوابی اور قدرے جدت پسندی کی خصوصیات سے سرفراز کیا تھا۔ ایک گھنٹہ میں ایک قصیدہ کہنے پر قادر تھا۔ قدسی کی بری طرح نکتہ چینی کیا کرتا اپنے ہمعصر میر الہٰی کا حلفیہ دشمن تھا۔ کبھی عبدالرحیم خان خاناں کبھی شہر یار اور کبھی شاہجہاں نے اس کی سرپرستی کی۔ مخزن گنجور کے نمونہ پر اس نے بھی ایک نصیحت آمیز مثنوی نظم کی اور اس کا نام دولتِ بیدار رکھا۔ آخری عمر میں وہ کشمیر چلا گیا وہیں اس کا انتقال ہوا۔

برہمن

چندر بھان متخلص بہ برہمن مغلیہ میں پہلا ایسا ہندو شاعر تھا جو خداداد قابلیت سے متصف تھا۔ وہ لاہور کا باشندہ تھا بردبار اور وسیع النظر آدمی تھا۔ نثر و نظم دونوں اصناف پر خوش اسلوبی سے یکساں طبع آزمائی کا ملکہ رکھتا تھا۔ اگر چشم حقیقت کو یہ تلاش ہو کہ ابوالفضل کی طرز تحریر کو کس فنکار نے مکمل طور پر جذب کر کے اس کو بارِ دگر پیش کیا تو بلاشک و شبہ چندر بھان ہی کو اس کا اہل پائے گی۔ اس کا دیوان چہار چمن، مرصع و مسجع نثر نگاری کا نمایاں نمونہ ہے[34]۔

حاذق

حکیم حاذق، حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھتیجا تھا۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا اور اس کی پرورش و پرداخت ہندوستان ہی میں ہوئی لیکن ایرانی ہندوستانی ثقافت کا ہمساز سنگم کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کا اسلوب بیان قدیم روایات کا نئے خیالات کے ساتھ پیش کرنے کا امتزاج تھا اور اپنا کلام پر اثر آواز میں پڑھتا تھا۔ حالانکہ وہ بسیار گو تھا لیکن بہت ہر دلعزیز بھی تھا[35]۔

خیالی

طبقات شاہجہانی کے مصنف نے خیالی کو انوری کا ہم پایہ تصور کیا ہے۔ خیالی نے امراء کے دامن دولت سے وابستہ رہنا کبھی پسند نہ کیا، نہ کبھی ان لوگوں کی خوشنودی کے لیے اشعار کہے۔ قدرت نے اسے ہیت و نجوم اور ریاضیات کا بھی ماہر بنایا تھا۔

دلیری

دلیری ایک نوجوان مگر مفلوک الحال شاعر تھا۔ کبھی کبھی کئی دن تک اس نے مسلسل فاقہ کیا۔ وہ عرفی کا زبردست مداح تھا اور اس کی طرز فکر کی تقلید بھی کرتا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکوں پر جان چھڑکتا تھا۔ عورتوں سے اسے نفرت تھی[37]۔

ماہر

محمد علی ماہر ایرانی النسل ہے لیکن اس کی پیدائش و پرورش و پرداخت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ آوارہ گردی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہمیشہ یہاں سے وہاں گھوما کرتا۔ عمدہ موسیقی اور حسین پیکر سے اسے عشق تھا۔ اس کا طرز آسان و خوبصورت تھا[38]۔

نثر

خیالات کی ترجمانی کے لیے نثر ایک محبوب میدان ثابت ہوئی ادیبوں نے لفظیات ترنم کو ہم آہنگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ضائع و بدائع کا کثرت سے استعمال ہوا۔ اچھے لکھنے والوں نے شاعرانہ جلا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ اس ترقی یافتہ رنگین طرز تحریر کے نمونے، باوجود متضاد مکتبہ کی نمایندگی کے شاہ فتح کانگڑا[39] اور چہار چمن ہیں۔ ایک خالص ایرانی فارسی کا دوسرا ہندوستانی فارسی کا نمونہ ہے۔ خیال کی مصوری اور زبان کی زرخیزی کے لحاظ سے آخرالذکر کو اول الذکر پر ترجیح حاصل ہے۔

نثر کی اقسام

نثر نگاروں کی ایک بڑی جماعت نے تاریخی مواد کی ترتیب و تدوین پر اپنا

وقت صرف کیا۔ ان کی طرز تحریر و خصوصیات کا ذکر کہیں اور کیا گیا ہے۔ نثر کی دوسری شاخ جس کو بار آور کرنے پر مستقل مزاجی سے کام لیا گیا وہ خالص ادب کا فن تھا۔ ان میں سے بعض عصری و ذاتی اور سرکاری مراسلات پر مبنی تالیفات ہم تک پہنچی ہیں اور ہم ان کے خوش آئند و پر تکلف اسلوب اور خیالی باتوں پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ منیر، برہمن، جے سنگھ[40]، افضل خان[41]، سعد اللہ خان[42]، فاضل[43]، عنایت اللہ[44]، ملا محمود جونپوری[45]، حکیم حاذق شیدا[46]، ملا طغرائی[47] کے خطوط اب تک بطور نمونہ دیکھے جاتے ہیں۔

طغرائی

ملائے طغرائی جہانگیر کے عہد حکومت کے اختتام کے قریب ہندوستان آیا اور دکن سے شاہ جہاں کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اسے شہزادہ مراد کا منشی مقرر کیا گیا۔ اسی کے ساتھ وہ بلخ بھی گیا۔ اس نے مراۃ الفتوح کے نام سے اس جنگ کا بیان پیش کیا۔ اس کے دوسرے نثری کارنامے فردوسیہ، کشمیر کی تعریف میں اور کنز المعانی شاہ شجاع کی تعریف میں اور تاج المدیح شہزادے مراد کی تعریف سے متعلق ہیں۔

دوسرے نثری کارنامے

ملفوظات تیموری کا نظر ثانی کردہ ایڈیشن شاہجہاں کی خواہش پر محمد افضل بخاری نے 1640ء میں پیش کیا۔ اسی سال منیر نے جونپور میں ہرمز کے شہزادہ والا اختر کے محاربات و خطر پسندیوں کی داستان مرتب کی۔ یہ بھی اپنے عہد کی مرصع و مسجع طرز تحریر کا نمونہ ہے۔

لغات

چار جامع و مانع لغات بھی لکھے گئے اور شاہجہاں کے نام پر معنون کیے گئے لغات شاہجہانی از عبد الرشید الطاطوی چہار انصار دانش از امان اللہ ملقب بہ خانہ زاد خان شاہد صادق از محمد صادق وجود میں آگئے۔ آخر الذکر مختلف سائنسوں کی ایک

انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں خاص طور پر دینیات، فلسفہ، سیاست، اخلاقیات اور سر گزشت عالم سے متعلق مواد ہے[50]۔

تراجم

نثری ادب کا دوسرا نمونہ جس کی تجدید اکبر کے عہد کے بعد دارا شکوہ نے کی وہ سنسکرت کی کتابوں کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندو ہمہ اوست، اپنشد، بھاگوت گیتا، اور یوگ وششٹ[51] کے اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ خود اس نے کیا۔ اس کے منشی بنوا لی داس نے پر بودھ چندر اودے کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس کا نام گلزار[52] حال رکھا۔ اور کسی ابن ہر کرن نے رامائن[53] کا ترجمہ کیا۔

مذہبی تصانیف

جگہ کی قلت سد راہ ہے اس لیے ہم مختصر تبصرہ بھی اس دور کی مذہبی تصانیف کا نہیں کر سکتے، لیکن دو ایسے لکھنے والے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ دارا شکوہ نے مسلم بزرگان دین کی ایک سوانح عمری لکھی اس کا نام سفینۃ الاولیاء[54] رکھا، لیکن مذہبی تقابل کا زیادہ عظیم یادگاری و تخلیقی کارنامہ، دبستان المذاہب ہے جس کو مشہور و معروف مصنف محسن فانی نے قلم بند کیا ہے۔ محسن فانی شاعر اور نثر نگار تھا[55]۔

طب

منجملہ اور مضامین کے علم طب کا بھی مطالعہ مرغوب تھا۔ اس دور کے بعض حکماء غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ یہ لوگ اپنے علم کے علاوہ دوسرے علوم کے بھی ماہر تھے[56]۔

وزیر خاں

حکیم علیم الدین وزیر خاں درباری طبیب تھا۔ اس کی ولادت و تربیت لاہور میں ہوئی تھی۔ فن طب اس نے حکیم دوائی سے حاصل کیا تھا۔ وہ نبض سے تشخیص کرنے کا ماہر تھا۔ شاہجہاں اور اس کے لڑکوں کے مزاج سے بخوبی واقف

تھا۔ وہ مختلف عہدوں پر مامور رہا کبھی دیوان بیوتات رہا، کبھی خان سامان رہا، کبھی میر عرض، غرض کہ مسلسل شاہی ملازمت میں رہا۔ بالآخر ہزار سواروں کا افسر بھی ہوا اور پنجاب[57] کا ناظم بھی۔

ایک دوسرا طبیب حکیم داؤد تھا۔ وہ شاہ عباس اول کا محبوب تھا۔ اپنے سر پرست کی وفات کے بعد وہ مکہ معظمہ گیا، وہاں سے اس نے ہندوستان کا سفر کیا۔ شاہجہان نے اسے پنجہزاری منصب عطا کیا اور تقرب خاں کا خطاب بھی[58]۔

مومنائے شیرازی

حکیم مومنائے شیرازی جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان وارد ہوا اور مہابت خاں کی ملازمت میں داخل ہوا۔ بعد ازاں وہ دربار شاہی سے متوسل ہوا اور شاہجہاں نے اسے دوہزاری منصب دار بنادیا۔ وہ ہوشیار و ہردلعزیز طبیب[59] تھا۔

اطباء

دوسرے اطبا جو قابل ذکر ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ حکیم فتح اللہ شیرازی ماہر علم الامراض و قرابہ دین حکیم سدرا خاندانی[60] حکیم۔ حکیم ابو القاسم اور حکیم رکنائے کاشی۔ اس زمانے کے مشہور جراحوں میں جگ جیوں اور شیخ قاسم تھے۔

علم نجوم وریاضیات

علم نجوم وریاضیات کا مطالعہ وسیع پیمانہ پر جاری تھا۔ ملا فرید منجم اس عہد کا سب سے نامی گرامی جوتشی تھا۔ اس نے ستاروں کا ایک نقشہ بنایا اور اس کا نام زیچ شاہجہانی[62] رکھا۔ عطااللہ نے ایک مقالہ علم ہندسہ، علم مساحت اور الجبرا پر تصنیف کر کے شاہجہاں اور دارا کے نام پر معنون کیا۔ عبدالرشید نے بیج گنت، کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا۔ دوسرے مشہور ریاضی دان حضرات کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد یعقوب لاہوری[66] اور شمس الدین خلجانی[67]۔

دینیات

فلسفہ قانون، دینیات، اخلاقیات، فلسفہ، عمرانیات وغیرہ بزرگان دین و

مقدس حضرات کے محبوب مضامین تھے۔ ایسے بزرگوں کی تعداد بے شمار تھی۔ قریب قریب ہر شہر و قریہ میں ایک ملا ہوتا تھا جو اپنا وقت یا تو مسجد میں گذارتے یا مذکورہ بالا موضوعات میں کسی کے مطالعہ میں منہمک ہوتے۔ اس زمانے کے مشہور علماء کے نام حسب ذیل ہیں:۔

ابوالمکارم[68] برادر ابوالفضل، ملا وحید کشمیری[69] مولانا عبدالسلام لاہوری[70] مولانا حسن دہلوی[71]

بزرگان دین

جو حضرات اپنے زہد و تقویٰ کے لیے مشہور تھے ان میں ملا شاہ لاہوری[72] سید احمد قادری[73] سید جلال گجراتی[74] شاہ میر لاہوری[75] اور شیخ عبدالحق دہلوی[76] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندی

شاہجہاں کے دور حکومت کا ایک جزو وہی تھا جو ہندی ادب و زبان کے ارتقا کا شاندار عہد سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کا بھی اس کے اثر سے دور رہنا مشکل تھا۔ وہ ہندی بولتا تھا، ہندی موسیقی کا دلدادہ تھا، ہندی شعرا کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس زمانے میں ہندی کے جو شعرا دربار سے منسلک تھے ان کے نام یہ ہیں۔ سندر داس چنتا منی اور کاوندر آچاریہ۔

سندر داس

سندر داس برہمن[77] گوالیار کا باشندہ تھا۔ اس کا سرپرست شاہجہاں تھا۔ چنانچہ پہلے تو اسے کوی رائے کا خطاب عطا کیا اور بعد میں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر سابقہ کا اضافہ کر کے اس کو مہا کوی رائے بنا دیا۔ کبھی کبھی اسے سیاسی ذمہ داریاں بھی سپرد کی جاتیں چنانچہ ججھار سنگھ کی بغاوت سے پہلے مہا کوی رائے کو بطور ایلچی گفت و شنید کے لیے اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کی تصنیف سندر سرنگار ہندی عروض سے متعلق ہے۔ اس کی دوسری کتابوں کے نام

سنگھاس بتیسی اور بارہ ماسہ ہیں۔

چنتا منی

ضلع کانپور کا باشندہ تھا۔ وہ اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، یوں تو ہر بھائی شاعرانہ صلاحیتوں کا مالک تھا مگر چنتا منی کو اس لحاظ سے بھی فوقیت حاصل تھی۔ سچ پوچھئے تو اس نے فن شاعری کے لیے ایک نئی راہ ایجاد کی۔ اس پر سب متفق ہیں کہ وہ اپنے عہد کا عظیم ترین شاعر تھا اس کو بھی شاہجہاں کی سر پرستی حاصل تھی اس نے حسب ذیل تصنیفات قلم بند کیں۔

چند و چار۔ کوے ویوک، کوی کُل کلپت رد اور کوی پر کاش۔ اصلیتاً وہ برج بھاشا بولی کا شاعر تھا۔ اس کا اسلوب خوش آیند وافضل ہے۔ اس کی رامائن اپنی پر اثر کویتا اور چھند کے لیے مشہور ہے۔

کویندر اچاریہ

بنارس کا باشندہ تھا۔ اس نے شاہجہاں اور اس کے لڑکوں کی تعریف میں "کویندر کلپ لتا" تصنیف کی۔ اس کی تصانیف اودھی اور برج بھاشا بولیوں کا حسین امتزاج ہیں۔ وہ سنسکرت کا بھی اچھا شاعر تھا۔ اس نے یوگ دششٹ کی ایک تفسیر بھی لکھی۔

اردو کا مقدر

جب ہندی زبان شمال میں سر سبز ہو رہی تھی۔ تکمیل، لطافت اور اسلوب حاصل کر رہی تھی، اس کی مستقبل کی حریف اردو خلاف ممالک امید زور و شور کے ساتھ دکن میں پروان چڑھ رہی تھی۔ حالانکہ اس کی ابتدا مشرقی پنجاب مغربی صوبجات ممالک متحدہ سے ہوئی تھی۔ وہ شمال سے منتقل ہو گئی تھی اور اپنے وطن اس وقت واپس ہوئی جب اٹھارویں صدی اپنی بہت سی منزلیں طے کر چکی۔ شاہجہاں کو اردو کی ترقی سے وابستہ کرنا غلط ہے۔ تاریخی شواہد اس کی تائید نہیں کرتے۔ نہ شاہجہاں نے اس کی سر پرستی کی نہ ہم کو اس دور میں کوئی اردو کا نمایاں

ادیب شمالی ہند80 میں ملتا ہے۔

دکن میں اردو کیوں پھولی پھلی

مغلیہ دربار کی ہمدردی سے اردو کیوں محروم رہی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ فارسی کا اثراب بھی غالب تھا۔ اس کا دور دورہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں تیز تر ہوتا گیا تھا کیونکہ دربار ایران سے اس کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ یہ سلسلہ ارتباط اورنگ زیب کے زمانے میں ختم ہوا اور اس کے بعد شمالی ہند میں اردو تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ برخلاف اس کے جنوب میں فارسی کا اثر بہت کچھ ختم ہو چکا تھا۔ بیجاپور اور گول کنڈہ دونوں جگہ پورا انتظامیہ ہندوانہ ہو گیا تھا۔ ان حالات میں یہ سوچنا بیجا نہ ہوگا کہ شمالی ہند کی اردو سے جداگانہ دکنی اردو کی نشوونما فارسی کے اس اثر سے ہوئی جو مرہٹی پر پڑا تھا۔ یہ فارسی اور برج بھاشا کی مصالحت کا نتیجہ نہ تھی۔

تعمیرات

ظاہر پسند ذہن کو شاہجہانی حکومت کی عظمتیں اس وقت کے ادب سے کہیں زیادہ نمایاں اس فن میں نظر آئے گی۔ شہنشاہ کی ساری توجہ فن تعمیر کی ترقی سے وابستہ تھی۔ اس کے زمانے کی تعمیر کردہ عمارات فن انجینیری کی عدیم المثال زندہ یادگار کھڑی ہیں۔ انہوں نے اپنی دل کشی، اور تازگی پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار رکھی ہے اب بھی وہ دنیا کے کسی گوشہ سے آنے والے کو خاطر خواہ دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ شان و شوکت، سکون و نفاست، جاہ و جلال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگرچہ بعض عمارت میں ضرورت سے زیادہ فنی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ماہر فن کے بھدے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن ایک غیر تربیت یافتہ آنکھ اس کے اردگرد حسن کے سوا کچھ نہیں پاتی۔ وہ مسحور ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر جملہ تاریخی مواد کا ذخیرہ تلف ہو جاتا اور صرف یہی عمارتیں شاہجہاں کے عہد حکومت کی داستان بیان کرنے کو باقی رہ جاتیں، تو بھی ہم کو شبہ نہیں رہ جاتا کہ تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور تھا۔

اسٹائل

اس عہد کی عمارتوں کی شکل و صورت، وضع قطع پر ماہرین فن کی متضاد رائیں ملتی ہیں۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو ہندوستان کو کسی ایسی فہم و فراست کا اہل سمجھنے میں تکلف کرتا ہے کہ وہ کوئی نئی چیز پیدا کر سکتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس دور کی عمارتوں کی تشکیل میں زبردست بیرونی اثرات کار فرما ہیں[81]۔ دوسرا طبقہ وہ ہے۔ ان کی رائے اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان عمارتوں کی ساخت کا نظریہ ہندوستانی روایات[82] کے ارتقا کا فطری نتیجہ ہے۔ ایسے نازک و پیچیدہ مسئلہ پر قطعی فیصلہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ حقیقت دونوں نظریات کے انتہائی حدود کے درمیان ہے۔ احتیاط سے سوچتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ طرز تشکیل دو ثقافتوں کے امتزاج و اثر کا ماحصل ہے۔ یہ رویہ استقلال کے ساتھ نشو و نما حاصل کرتا رہا یہاں تک کہ اس دور حکومت میں پائے تکمیل کو پہنچا کیونکہ اس ذوق کو اب زور و سرپرستی حاصل ہوئی۔

اس طرز کو کیسے ترقی ہوئی؟

اکبر کے عہد اور اس کے پوتے کی زمانے کی عمارتوں کی ساخت میں جو نمایاں فرق پہلی نظر میں سامنے آتا ہے وہ ارتقاء کے امکان کو ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھتا ہے کیونکہ ایسے لوگ دونوں ثقافتوں میں کوئی رشتہ یا سلسلہ ارتباط تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو ایسے وسوسے دور ہو جاتے ہیں۔ اگر دونوں کی زنجیر ہاتھ آجاتی ہے۔ ایک اور نکتہ اس فوری تبدیلی کا ہے جو شاہجہانی عہد کی کثرت تعمیر میں مضمر ہے۔ علاوہ بریں شہنشاہ کو ذاتی طور پر متاثر کرنے والی عمارتوں اور بھدی تعمیرات کے امتیاز کا اچھا شعور تھا۔ وہ فن تعمیر کی سائنس سے کماحقہٗ واقف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تعمیرات کا ہر نقشہ بہ نظر غور دیکھتا اور ماہرین فن سے بغیر تنقید و مباحثہ کے آخری منصوبہ پر حکم نہ دیتا۔ ان حالات میں کیا تعجب ہے اگر ایک بہتر اور پر اثر جدید اسلوب ترقی کرتے

کرتے اس طرح صورت پذیر ہوا۔

شاہجہاں کا مذاق تعمیر

شاہجہاں کا ذوق تعمیر اس کے بالکل ابتدائی دور حیات سے شروع ہوتا ہے۔ شہزادگی کے زمانے میں بھی جو عمارتیں اس کو دی جاتی تھیں ان کی ترمیم و آراستگی سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ جب بادشاہ ہوا تو اپنے اس محبوب مشغلہ کو اس نے پورے زور سے آسودہ کرنا چاہا۔ علاوہ بریں اس کے کردار کی بعض خصوصیات اس کے اس انہماک کی تشریح کرتی ہیں۔ وہ خود بین داولوالعزم تھا۔ خود بینی ہمیشہ عوامی ستایش کی خواہشمند رہتی ہے۔ اس کو خیال ہوا ہوگا کہ یہ خواہش شاندار عمارات کی تعمیر سے دائمی حیثیت حاصل کرسکتی ہے۔ اس کا حوصلہ ہمیشہ عدیم النشالی کی طرف اس کو مائل کرتا۔ مصوری میں اضافہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے فطری طور پر اس نے تعمیرات کی طرف توجہ کی کیونکہ اس میدان میں ترقی کے وسیع امکانات تھے۔ اس کے عہد کی تعمیر کردہ عمارتوں نے اس کے ذوق خودبینی و حوصلہ مندی کو پوری آسودگی عطا کی ہوگی۔

ہر جگہ عمارت تعمیر کرانا

اپنے عہد میں جہاں کہیں شاہجہاں سیر و سیاحت کے لیے گیا وہ سرزمین کوئی نہ کوئی یادگار لیے ہوئے اس کے جذبہ تعمیر کی ناآسودگی کی شہادت دیتی ہے۔ ان تعمیرات کی، تفصیل پیش کرنے کا تو ذکر ہی کیا ان کی فہرست بھی قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ اجمیر کی مسجد، مقبرہ معین الدین چشتی کے احاطے میں اور اناساگر کی بارہ دری اس کے ذوق تعمیر کی پر اثر شواہد ہیں۔ عصری مورخوں نے کشمیر، لاہور، انبالہ، باری، فیض آباد، گوالیار اور کابل وغیرہ میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں کو بیان کیا ہے لیکن ان سب میں نمایندہ و محفوظ آگرہ اور دہلی کی عمارتیں ہیں۔

آگرہ

آگرہ[84] کا قلعہ ایک مجموعہ ہے ان بے شمار عمارتوں کا جو عہد اکبر سے لے کر

عہد شاہجہاں میں نمودار ہوئیں۔ شاہجہاں نے وہاں بھی دیوان عام و دیوان خاص اور شاہی مستورات کی قیام گاہیں تیار کرائیں، اس کے حجرے۔ غلام گردش، شہ نشیں خالص سفید سنگ مرمر کے ہیں۔ سب ہی پر کار نقش کاری اور نفیس گل کاری سے آراستہ ہیں[85]۔ ثمن برج بھی نہایت خوبصورت عمارت ہے، کبھی قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاہجہاں نے پھری ہوئی پتلیوں سے اپنی محبوبہ[86] ملکہ کے دائمی جائے آرام پر نظر کر کے آخری سانس لی۔

موتی مسجد

قلعہ میں سب سے زیادہ غیر نمائشی اور خوش نما عمارت موتی مسجد[87] ہے۔ اس کی تعمیر میں سات سال لگے (1653-1645) 3 لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ عمارت فن کی تکمیل اور سادگی کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر میں ایسے سفید سنگ مرمر کا استعمال ہوا ہے جو نمائشی نقوش آرائشی عنصر سے بے نیاز ہے تاکہ خانہ کا تقدس مجروح نہ ہو۔

جامع مسجد

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی سب سے بڑی لڑکی کی بنوائی ہوئی جامع مسجد قلعہ کے باہر شمال و مغرب کی سمت ہے۔ 5 سال کی محنت میں 5 لاکھ روپیہ کی لاگت سے یہ مسجد 1648ء میں تیار ہوئی۔ ابھرے ہوئے نقوش کی یہ بڑی عمدہ تعمیر ہے۔ اس کی بے نظیر تکمیل و شان و شوکت میں بڑا حسین تناسب ہے[88]۔

تاج

لیکن آگرہ کا تاج حسن، تاج محل ہے جس کا شمار دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں ہے۔ بادل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ یہ ہندوستان کی مثال بلندی تخیل کا نمونہ ہے۔ جس میں عمارت سازی سے زیادہ سنگ سازی[89] کا ہاتھ ہے، اس کی انتہائی نزاکت، تعمیری حسن اور معماروں کی کامل خوش مذاقی، دانش وری کا ذہن نشین کرانا، ناممکن ہے۔ اس کے خالص سفید سنگ مرمر، پیاز نما گنبد، حسین

منقش پردے، پاکیزہ مرصع کام، کسی بیان کو ضبط تحریر میں آنے کی اجازت نہیں دیتے دراصل یہ حسن کا مجسمہ اور دائمی مسرت کا سامان ہے۔ ہندوستان کی تعمیری تاریخ میں نہ ایسی عمارت کبھی بنی ہے نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے زیادہ بھاری اور ٹھوس عمارتیں ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن میں اس سے زیادہ مرصع کاری ہے لیکن کہیں بھی یہ عظمت و سادگی اس مکمل تناسب اور موزونیت سے ہم آہنگ نہ ملے گی۔ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کو سرور بخشتی ہے یہ وہ یادگار ہے جو خود بینی کے احساس سے پیدا ہوئی مگر نزاکت و نفاست[90] سے بھرپور ہے۔

اس کے طرز تعمیر پر تنقید

اگرچہ حسن تاج، کے جائزہ میں اہل قلم کی اکثریت ہم خیال ہے لیکن اس کی اصل تخلیق و طرز تعمیر پر بڑا اختلاف ہے۔ سلی مان اپنی کتاب[a] میں ایک وہمی تصور پیش کرتا ہے کہ ایک فرانسیسی انجینئر استن دی بورڈے[91] نے اس کا نقشہ بنایا[b] تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک مضحک خیال آرائی سے اسے استاد عیسیٰ سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن اس خام خیالی کی تائید تاریخ نہیں کرتی۔ وی، اسمتھ، میزیک[c] کی شہادت کا سہارا لے کر اس کے ابتدائی نقشہ تیار کرنے کا سہرا جرمینو ورونو کے سر باندھتا ہے اس نظریہ کی تردید سر جان مارشل اور آئی۔ بی ہاول تاریخی نقص کی بنا پر بھی کرتے ہیں اور نیز اس اندرونی طرز تعمیر کی بنا پر کرتے ہیں جو خود عمارت زبان حال سے بیان کرتی ہے[93]۔

دلی

دلی محل[94] ایک متوازن ساخت کی بنا پر بیک وقت اور ایک منصوبہ کے تحت بنایا گیا۔ خوبصورتی، شان و شوکت کے لحاظ سے سارے مشرق میں عدیم المثال

Indias Venus DeMilo :کے الفاظ یہ ہیں Havell (a)

Manrique. (c) Ramble and Ricollection by Stuman (b)

ہے۔اور شاید دنیا میں کوئی عمارت اس پر سبقت نہیں لے جا سکی۔ فتح پور سیکری کے اکبری محل کی ساخت سے بالکل مختلف ہے۔ ایک مردانہ کس بل کا نمونہ ہے اور دوسرا انسوانی کثرت آرائش کا۔ لیکن اپنی جگہ دونوں میں کشش ہے۔ دلی محل اپنی نوعیت کا سارے ہندوستان میں ایک ہی ایسا محل ہے جس کو دیکھ کر ان انتظامات سے واقفیت ہوتی ہے جو کسی قصد و متوازن منصوبہ کے زیر اثر وجود میں آتے تھے۔

داخل ہونے کا خاص راستہ یا لاہوری پھاٹک کا رخ مغرب کی طرف، چاندنی چوک کی نمایاں و سیع سڑک کی طرف ہے۔ اس پھاٹک کو ایک ایسے محرابی ہال سے متحد کیا گیا ہے جو اندر ایک صحن میں کھلتا ہے اس کے اس طرف دیوان عام کے سامنے نوبت خانہ ہے یہ عمارت اپنی آگرہ کی ہمشیرہ عمارت سے زیادہ آراستہ ہے۔ محل کے شمالی حصہ میں مشہور دیوان خاص ہے۔ عہد شاہجہاں میں جتنی عمارتیں بنائی گئیں یہ ان میں سب سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ فنّی لحاظ سے اس کا طرز تعمیر مکمل نہ سہی لیکن یہ غیر معمولی شان و شوکت کی مظہر ہے۔ تاج کی سادگی یہاں مفقود ہے لیکن اس کے بنانے میں وہ روح تعمیر کا فرمانہ تھی۔ اس کا مقصد شاہجہاں کے اقتدار کے نقطۂ عروج کی تصویر کشی تھی اس لحاظ سے پوری کامیاب عمارت ہے۔ امیر خسرو[95] کا حسب حال شعر اس عمارت کا شاہانہ تعمیر کا ترجمان ہے۔

اگر فردوس بروئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

دلی قلعہ کے باہر بلند کرسی پر جامع مسجد کھڑی ہے جو تشکیل اور ساخت کے لحاظ سے موتی مسجد سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کی تعمیر میں وہی جوش و خروش نظر آتا ہے جو اس محل کی تعمیر میں تھا۔ جس کے مقابل وہ کھڑی ہے اس کے وجود کے پس پشت ایک شاہی مسجد بنانے کا جذبہ تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسی ہی نظر بھی آتی ہے۔ یہ سنگ سرخ کی ریت سے بنائی گئی ہے اس لیے قلعہ کی باہری دیوار سے

پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس پر سنگ مرمر کی دو بُرجیاں ہیں[96]۔

مصوری

اگر چہ شاہجہاں کی خاص دلچسپی فن تعمیر کی توسیع سے تھی لیکن مصوری سے دلچسپی لینے میں بھی اس نے اپنے باپ کی روایت بر قرار رکھی۔ اب اس شعبہ کا نگراں فقیر اللہ[97] خان تھا اور اس کا نائب میر ہاشم لاجواب شبیہ ساز تھا۔ علاوہ شہنشاہ کے دوسرے بلند پایہ اہل دربار جو فن مصوری کے سرپرست تھے ان میں آصف خان، شہزادہ داراشکوہ بھی شامل ہیں۔ داراشکوہ کا 40 مختصر قلمی تصویروں کا منقش و مطلا مرقع جو ہنوز باقی ہے اس کو دیکھ کر اس وقت کے فن کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔

فنی طریق کار میں کئی تبدیلیاں نمایاں ہیں پہلی تو یہ کہ تخلیقی سرگرمی اور آمد کی کمی۔ اگر چہ بظاہر جسمانی ریاض بر قرار ہے لیکن وضع یا تصور میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش بہت کم ہے۔ بہ الفاظ دیگر جدت کے بجائے نقالی زیادہ ہے۔ دوسری یہ کہ بے بنیاد و خیالی باتوں کی ایک حیرتناک آرزو نمایاں ہے۔ غالباً یہ طرز فکر قلت تخلیق پر پردہ ڈالنے کے لیے ہے۔ تیسرے ایک لداؤ حاشیہ کا تعارف ہے جس کے بغیر اس زمانے میں کوئی تصویر مکمل نہ سمجھی جاتی کبھی کبھی ان حاشیوں کی وضع پر پھول کی کثرت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری جگہ چھوٹی چڑیوں یا جانوروں کی تصویریں ہوتی ہیں، چوتھی بات یہ کہ کثرت آرائی کا نمایاں رجحان تفصیلات و رنگ آمیزی میں نمایاں ہے۔ ان نقوش پر سونا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اپنی آب و تاب کی نمائش میں تصویریں بھی اپنے دور کے فن تعمیر کی آوازِ بازگشت ہیں۔

خوشخطی

فن مصوری سے متحد فن کاری خوش نویسی کی ترویج بڑی محنت و استقلال سے کی گئی ایک خوش نویس کی بھی اتنی ہی عزت ہوتی تھی جتنی ایک مصور[98] کی،

اس وقت کے بعض حسین نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن کس قدر صناعی طلب کرتا تھا۔ مسودے کی آرائش کے لیے خوش نویس کی دانائی کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی ایک مصور کی۔

محمد مراد شیریں قلم، ممتاز خوش نویس تھا۔ آقا رشید ائے شاگرد میر امام حروف کے دائرے بنانے کا ماہر تھا۔ دوسرے خداداد قابلیت کے لوگ، میر صالح اور محمد مومن پسران میر عبداللہ، مشکین قلم تھے۔ یہ دونوں شاعر بھی تھے۔ صالح فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتا، مومن صرف فارسی میں طبع آزمائی کرتا۔ کفایت خان و جلال الدین شاگردان محمد حسین خلف، سر بر آوردہ شکست نویس تھے۔

موسیقی

شاہجہاں کی دلچسپیوں کی فہرست میں بہ لحاظ ترتیب فن موسیقی کا ذکر سب کے آخر میں آگیا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے دل میں بھی اس کی وقعت جملہ فنون سے کم تھی۔ اس کی بھی سرپرستی اس نے بڑی فیاضی سے کی۔ اس نے تخلیق نو کے اضافہ میں خاص دلچسپی کا ثبوت دیا حقیقت یہ ہے کہ طرز اظہار میں پہلے ہی سے تنوع کی کمی تھی کیونکہ کوئی ایسا شخص خداداد قابلیت کا نہ پیدا ہوا جو ترقی دیتا یا اکبر کے مشہور و معروف فنکار تان سین کے مروجہ انداز سے علیحدہ ہو کر کوئی اضافہ کرتا۔ شاہجہاں کی پسندیدہ راگ دھرپد تھی، اور جو موسیقار اس کو انتہائی خوش اسلوبی سے پیش کرتا تھا وہ تان سین کا داماد اور اس کے شاگرد کا شاگرد لال خان، "گن سمند" تھا۔ ہندوؤں میں سب سے اچھا گویا جگن ناتھ تھا۔ شاہجہاں[100] کی اس پر غیر معمولی نظر عنایت تھی۔ اس کو مہا کوی رائے کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ اکثر شہنشاہ کی مدح میں نظمیں بھی وہ کہا کرتا اور کثیر انعامات سے سرفراز بھی ہوتا رہتا۔

اس زمانے کے مختلف سازوں کی فہرست یہاں پیش کرنا ممکن نہیں لیکن دو

سازندوں کا تذکرہ مستحق ذکر ہے۔ سکھ سین، رباب بجانے کا استاد تھا۔ اور سور سین بین بجانے میں لاجواب تھا۔

باب 11

انتظامیہ کے بعض پہلو

مغل بادشاہ کا مرتبہ

شاہجہاں کی سلطنت، حکومت کی ایک مکمل تنظیم پر مبنی تھی۔ ساخت کی تفصیل میں اکبر کی مرتبہ [illegible] وہ طرز سے بہت کم مختلف تھی۔ انتظامیہ کی پوری مشین کی قوت کا مخرج شہنشاہ ہوتا۔ علاوہ ازیں بلند ترین دنیاوی اختیارات کا وہ منصب دار تھا اس کے اقتدار کو مذہبی جواز بھی حاصل تھا، وہ زمین پر خدا کا سایہ[1] (ظل اللہ) سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کے فرمان واجب الاذعان تھے۔ یوں تو وہ سارے انتظامی امور کا سرچشمہ تھا ہی، مذہبی معاملات میں بھی اس کا فیصلہ حرف آخر ہوتا۔ بشرطیکہ شریعت سے تصادم نہ ہو اس طرح نظریاتی اعتبار سے اس کے اختیارات لامحدود ہو جاتے۔

مطلق العنانیت پر مروّجہ دستور کی پابندیاں

لیکن عملی لحاظ سے یہ مطلق العنانیت بھی بہت سے قابل غور و تامل ملاحظات سے محدود تھی۔ یہ صحیح ہے کہ شہنشاہ فوج کی امداد سے اپنی رعایا پر احکام کی پابندی عائد کرا سکتا تھا۔ لیکن ہر وقت اور ہر موقع پر یہ ممکن نہ تھا۔ ابوالفضل کا یہ کہنا کہ اس کا حکمران اپنے عہد[3] کی روح سے باخبر رہتا ہے، اس کے اختیارات کی

حد بندی کی طرف ہلکا سا اشارہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں باوجود لا محدود اختیارات کے بادشاہ کو اس مروجہ دستور کا احترام کرنا پڑتا جو عہد متوسط میں بغیر کسی تحریر کے اتنا ہی پرزور تھا جتنا آج کا تحریری قانون۔

تحریری قانون کی عدم موجودگی

مغلیہ عہد میں تحریری قانون کی عدم موجودگی نہ صرف حیرت کا باعث ہے بلکہ سوچنے پر بھی مائل کرتی ہے کہ بادشاہ نے من مانے انداز میں اپنی مرضی سے کام کیا ہوگا۔ اس گمان کہ مغرب کے عصری سیاحوں کی رائے نے تقویت بخشی۔ لیکن ان کی رائے تسلیم کرنے سے قبل ہم کو دو اہم باتوں پر غور کرنا ضروری ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر بادشاہ کی مرضی ہمیشہ مطلق العنانی سے کام میں لائی گئی ہوتی تو مغل حکومت اتنے دن تک برقرار نہ رہتی۔ روک تھام کرنے میں اس دور کی عوامی قوت آج کی قوت سے کہیں زیادہ تھی۔ اور عملی لحاظ سے سرکاری فوج اور عام لوگوں میں بہت کم فرق تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مغربی سیاح بے بنیاد افواہوں کو اپنے خیالات کا سر چشمہ بنا کر بے حقیقت باتوں کو تعمیم عطا کرنے پر مائل تھے۔ بعض وقت تو واقعات کے لاپتہ اجزاء کو اپنی قیاس آرائی سے پورا کر لیتے ہیں۔ اس لیے یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ اظہار بیاں کے درمیان وہ اپنی تردید خود کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے بیانات بڑی احتیاط سے قبول کرنا چاہئیں۔

مغل سرکار کاغذات کی سرکار تھی

مغلیہ سرکار لازمی طور پر کاغذات کی سرکار تھی۔ ایک ایک انتظامی تفصیل بڑی دیانت داری و باریک بینی سے قلم بند کی جاتی تھی۔ صرف ایک ہی جگہ اندراج نہیں ہوتا تھا بلکہ متعدد مقامات پر۔ یہ خیال کرنا حق بجانب ہوگا کہ یہ کاغذات اتنے ہاتھوں سے گزرتے تھے اور کافی حد تک صحیح ہوتے تھے۔ کہ یہی کاغذات تحریری قواعد و ضوابط کی تلافی کرتے تھے۔ اگرچہ یہ مندرجات کسی عام

نظریہ یا اصول کے تحت نہ تھے پھر بھی ان سے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔ ایک لحاظ سے تحریری قوانین کی عدم موجودگی باعث برکت تھی۔ مقدمہ دائر کرنے والوں کو ضمیر فروش قانون دانوں کے استحصال زر سے نجات حاصل تھی اور مقدمات بھی جلد از جلد فیصل ہو جاتے[6] تھے۔ فیصلہ کرنے والے حکام بھی قواعد کی سخت پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی فہم و فراست سے کام لیتے تھے۔

مغلیہ مطلق العنانی کی تعریف

مغلیہ مطلق العنانی کی طرف پھر واپس ہوتے ہوئے اس کی نوعیت پر بحث کرنے میں ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خصوصیات میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ حکمراں اپنی رعایا کی بہبود پر پوری نظر رکھتے تھے۔ اس طرح یہ طرز عمل خلجی اور تغلق حکومتوں پر ایک ترقی یافتہ اقدام تھا۔ آخر الذکر شاہان مطلق العنان کے یہاں رعایا کی بہبود کا کم خیال تھا۔ ان کی یہی بیگانگی منجملہ اور اسباب کے ایک سبب ان کی سلطنتوں کے جلد تر زوال کا تھا۔ علاوہ اس کے مغل حکمراں اپنے اختیارات کے لیے ہندوستان سے باہر کی کسی طاقت کی توثیق کے انتظار میں نہ رہتے۔ اور ملکی قانون کی ہمدردیاں ان کی دسترس سے باہر تھیں۔ یہ ایک خاص سبب ہے جس سے سرزمین ہند میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہوئیں۔

مغلیہ حکومت کا منشا

مغل حکومت کے منشاء کردار پر اختلاف رائے ہے۔ سرکار کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد دنیاوی اور قریب قریب تنگ دلی تھا[7]۔ مور لینڈ کا تبصرہ ہے کہ اس کا منشاء حصول مال و دولت اور متناسب فوجوں کا قیام تھا[8]۔ ڈاکٹر بینی پرساد کی رائے ہے کہ مغلیہ حکومت بنیادی طور پر ثقافتی تھی اور اس کو معمولی آدمیوں یا عوامی جذبات کا احساس بھی تھا[9]۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغلیہ حکومت نے ایسے حالات ضرور پیدا کر دیے کہ امن و چین کی زندگی بسر کرنا ممکن ہوا۔

اس حیثیت سے اسے روشن خیال شہنشاہیت کہا جاسکتا ہے۔ یہی بنیادی پہلو تھا جس کو مد نظر رکھتے ہوئے ٹیورنیر[10] نے یہ کہا ہے کہ شاہجہاں اپنی رعایا پر حکمرانی بادشاہ کی حیثیت کے بجائے باپ کی حیثیت سے کرتا تھا۔

ایک عام غلطی

بعض موجودہ اہل قلم ایک غلطی یہ کرتے ہیں کہ مغلیہ طرز حکومت جو کلیتاً عہد متوسط کی آوردہ تھی۔ اس کا موازنہ دور حاضر کے نظم و نسق سے کرتے ہیں۔ اس لیے لازمی وہ ایسے نتائج پر پہنچتے ہیں جو موافقت سے دور ہیں[11]۔ لیکن ایسے نتائج غلط ہیں کیونکہ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ متعدد ادارے جو آج ہماری معاشرتی زندگی کا جز بن گئے ہیں وہ عہد متوسط میں نہ تھے۔ مگر ان کی عدم موجودگی کی ذمہ داری بادشاہ پر نہیں آتی۔ یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ رعایا سے متعلق حکومت کے فرائض و کارکردگی کے سیاسی نظریات سترھویں صدی سے اب تک بہت بدل گئے ہیں۔

بادشاہ اور اس کے مشیر کار

سلطنت کا طول و عرض، ان وسائل کی کمی جن کو ہم آج زود رساں رابطہ کہتے ہیں، اور متعدد و مختلف سرکاری مسائل مغلیہ مطلق العنانی کے نظریاتی کردار پر اثر انداز تھے۔ اگرچہ حکومت کی پالیسی کی باگ ڈور بادشاہ وقت کے ہاتھ میں ہوتی لیکن تفصیلات کی تکمیل ان افسران شاہی کے سپرد ہوتی جو ہر طرح سے جواب دہ ہوتے۔ نظریاتی اعتبار سے وہ بادشاہ کے ملازم ہوتے لیکن عملی لحاظ سے وہ مشیر کار تھے۔ یہ سچ ہے کہ بادشاہ کو مشیر کاروں کی رائے منظور نا منظور کرنے کا حق تھا لیکن عموماً ان لوگوں کی رائیں منظور کر لی جاتیں۔ بشرطیکہ پالیسی کے اصل مقصد پر ان سے کوئی برا اثر نہ پڑتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ افسروں کو اپنے شعبہ جات میں کافی آزادی رہتی۔

مغل حکومت کے انتظامیہ کا الگ الگ تین عنوانات کے تحت جائزہ لیا جاسکتا

ہے (الف) مرکزی (ب) صوبہ جاتی (ج) مقامی- ابتداء ہی میں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اوّل الذکر دو[2] بمقابلہ تیسرے کے پاکی زیادہ مکمل و مفصل انداز سے منظّم تھے۔

وکیل

مرکزی حکومت بلکہ حقیقتاً ساری سلطنت میں اعلیٰ ترین افسر وکیل ہوتا تھا۔ عملاً وہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔ وہ کسی افسر کو مقرر یا برخواست کر سکتا تھا۔ بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا۔ شاہجہاں نے اس عہدہ جلیلہ پر آصف خان کا تقرر کیا اور ملکہ کی سفارش پر مہر ازک[13] یا مہر اعظم بھی اس کے سپرد کر دی تھی۔

وکیل کی حد اختیار

امور خانہ داری سے لے کر شعبۂ انتظامیہ تک وکیل کے دائرہ اختیار میں تھے۔ حسب ذیل افسران براہ راست اس کے تحت تھے۔

میر[14] عمال : باستثنائے زمین، بادشاہ کی ساری نجی ملکیت کا نگراں تھا۔

میر[15] عرض : مختلف افسروں یا درخواست دہندوں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔

قور[16] بیگی : شاہی پرچم کا نگران تھا۔

میر توزک[17] : درباری رسوم کی دیکھ بھال کرتا۔ شاہجہاں نے ان افسروں کی تعداد چار تک بڑھادی تھی کیونکہ ایک اس افسر سے متعلق اتنے زیادہ فرائض تھے کہ ایک آدمی انجام نہ دے سکتا تھا۔

میر[19] بار : شاہی جنگلات کا نگراں تھا۔

میر بحر[20] : دریائی راستوں اور گھاٹ کے انتظام کے علاوہ ان کشتیوں کا بھی نگراں تھا جو شاہی تصرف سے متعلق ہوتیں۔

میر[21] منزل : شاہی خیمہ جات کا انتظام کار تھا۔

خوان[22] سالار : شاہی باورچی خانہ کا افسر اعلیٰ تھا۔

میر منشی[23] : بادشاہ کا معتمد اعلیٰ تھا۔ عموماً وہ اعلیٰ علمی صلاحیتوں کا مالک ہوتا۔ شاہی مراسلات کا مسودہ تیار کرتا اور کبھی کبھی بادشاہ کے زبانی احکام بھی قلم بند کرتا۔ شاہجہاں کے عہد کے اختتام پر چندر[24] بھان فرمان نویس کے عہدہ پر مامور تھا۔

اختہ[25] بیگی : شاہی اصطبل کا سربراہ تھا۔

خوش[26] بیگی : کھیل کود شکار وغیرہ کا افسر اعلیٰ تھا۔

وزیر : وکیل کے بعد سب سے زیادہ صاحب اختیار افسر دیوان تھا جو وزیر یا دیوان کل بھی کہلاتا تھا وہ شعبۂ مالیات کا مستقل صدر ہوتا تھا۔ وہ جملہ انتظامی شعبہ جات کی باقاعدہ کارکردگی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہر اہم وضروری کاغذ پر دستخط کرتا تھا۔ اس کی نیابت میں دو نائب دیوان ہوتے تھے ایک دیوان "تان" کہلاتا تھا جو جاگیرات کا انتظام کرتا تھا اور دوسرا دیوان "خالصہ" کہلاتا تھا جو شاہی املاک کا ذمہ دار ہوتا۔ حسب ذیل عہدہ دار براہ راست وزیر سے متعلق تھے۔

مصطوفی یا محاسب اعلیٰ: یہ سلطنت کی آمدنی وخرچ کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھا۔ اس کو اختیار تھا کہ اخراجات کی مد کم کردے۔ شعبہ جات مال گذاری کے جملہ کاغذات پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔

صاحب توجیہہ :صاحب توجیہہ یا تنخواہ تقسیم کرنے والا۔ اس کی ذمہ داری صرف دارالسلطنت کے ملازمین کی تنخواہ بانٹنا تھا۔ معماروں اور دست کاروں کی فرد حساب پر پہلے وہ دستخط کرتا تھا سب مصطوفی کے پاس کاغذات جاتے تھے۔

اوارجہ[32] نویس :روزمرہ کی آمدنی وخرچ کا حساب وکتاب رکھتا تھا۔

میر[33] سامان :سرکاری فرنیچر کا نگران تھا۔ یہ عہدہ بڑی ذمہ داری کا تھا۔

صرف ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جو لائق و قابل اعتماد ہوں۔ چنانچہ افضل خان، سعد اللہ خان، فاضل خان جو اس عہدہ پر رہ چکے تھے بعد میں وزراء سلطنت مقرر کیے گئے[34]۔

مشرف[35] :یہ محکمہ مال کا افسر اعلیٰ ہوتا اور ایک خزانچی بھی اس محکمہ سے تعلق ہوتا۔

وقائع نویس :اہم واقعات و احکام کا اندراج اور سرکاری کاغذات کی دیکھ بھال کرتا۔

صدر :مرکزی حکومت میں اور بہت سے افسر ہوتے۔ منجملہ ان میں صدر الصدور یا مذہبی امور سے متعلق افسر اعلیٰ کا عہدہ بڑا اہم ہوتا۔ وہ محکمۂ خیرات کا سربراہ ہوتا اور شہنشاہ سے بزرگان دین و دانشوروں کا تعارف کراتا۔ شاہجہاں کے ابتدائی عہد میں موسوی خان 15/ سال تک اس عہدہ پر مامور تھا۔ 1642ء میں بادشاہ نے اس کے غیر اطمینان بخش کردار کی بنا پر برخواست کر کے اس کی جگہ سید جلال الدین گجراتی کا تقرر کر دیا تھا۔

میر بخشی :صدر سے کہیں زیادہ اہم عہدہ میر بخشی کا تھا[40]۔ اثر و اختیار کے لحاظ سے اس کا مرتبہ دیوان یا وکیل کے بعد تھا۔ وہ فوجی محکمہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ سپاہیوں کی بھرتی کا جائزہ اور دوسرے عسکری معاملات کا نگران بھی تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک نائب بخشی بھی رہتا جس کو بخشی[41] دویم کہا جاتا۔ سب فوجیں میدان جنگ میں بھیجی جاتیں تو ہر دستہ[42] کے ساتھ ایک علیحدہ بخشی کا تقرر ہوتا۔ غالباً وہ سب انفرادی حیثیت سے میر بخشی کے ماتحت ہوتے۔

داروغہ مسل خانہ : یہ عہدہ صرف ذمہ دار قابل اعتماد اشخاص کو تفویض کیا جاتا۔ اس پر کام کرنے والے میں ہمت، فیصلہ کرنے کی صلاحیت، مستعدی و ہوشیاری کا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ کوئی نامناسب یا غیر طلبیدہ شخص دیوان خاص میں داخل نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ یہاں اہم ترین معاملات اور انتہائی رازداری کے امور پر بحث ہوتی۔

قاضی القضاۃ[44] : شعبۂ عدل کا افسر اعلیٰ ہوتا۔ صوبہ جات کی عدالتوں کی وہ اپیل سنتا اور شہنشاہ کو بھی عدل و انصاف کرنے میں مشورہ دیتا۔ محمد اسلم[45] عرصہ دراز تک اس عہدہ پر مامور تھا۔ اس کے بعد شاہجہاں کے 23 ویں سال حکومت میں اس کی جگہ قاضی خوشحال[46] کو مقرر کیا گیا۔

داروغہ کتاب خانہ[47]: کتب خانہ کا سب سے بڑا عہدہ دار ہوتا تھا۔ منڈیل سلو لکھتا ہے کہ 24 ہزار دیدہ زیب مجلد مخطوطات شاہی کتب خانہ[48] میں تھے۔

داروغہ زرگر خانہ[49] : محکمۂ جواہرات کا افسر اعلیٰ تھا۔ جہانگیر[50] کے عہد حکومت سے اس عہدہ پر سعیدائی گیلانی مامور تھا۔ اس کے جانشینوں میں میر صالح اور محمد شریف[51] تھے۔

میر عدل[52] و داروغہ داغ و تصحیح: کیمپ کے میر عدل اور داروغہ داغ و تصحیح بھی اہم عہدے دار[53] تھے۔

کوتوال[54] : اس شخص پر اکثر مغربی سیاحوں کی نظریں پڑی ہیں۔ وہ دارالسلطنت کے علاوہ اور اہم بستیوں میں بھی ہوتا تھا۔ منڈیل سلو کا بیان ہے کہ وہ شہنشاہ کے خاص الخاص انجمن[55] میں بھی شامل ہوتا تھا۔ اس کے فرائض مختلف النوع تھے۔ موجودہ دور کے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مجسٹریٹ کا وہ مجموعہ ہوتا۔ وہ بدکر

داروں پر کڑی نظر رکھتااور شہر میں امن و سکون بر قرار رکھنے کا بھی ذمہ دار ہوتا۔ منوچی کہتا ہے کہ وہ راز ہائے سر بستہ حاصل کرنے کے لیے حلال خوروں یا خاکروبوں کو بھی نوکر رکھ لیتا۔

صوبہ جات

کل سلطنت بائیس[57] صوبوں میں تقسیم تھی۔ ہر ایک میں ایک صوبہ دار یا سپہ سالار ہوتا تھا۔ ان میں سے آگرہ اور دہلی میں صوبہ دار یا سپہ سالار صرف بادشاہ[58] کی عدم موجودگی میں مقرر کیا جاتا۔ قندھار، ایرانیوں نے واپس لے لیا تھا۔ بلخ و بخارا قلیل مدت کے لیے شاہی مقبوضات میں رہے اور دکن کے چار صوبہ جات کبھی کبھی ایک ہی افسر[59] کے تحت میں رہتے۔ باقی صوبوں میں صوبہ داروں کا انتظام ہوتا۔ صوبہ[60] اودھ کے علاوہ ہم کو صوبہ داروں کے مسلسل تقرر کا علم کاغذات سے ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں سپہ داروں اور صوبہ داروں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ شاہجہاں کی عہد حکومت کے صرف بائیسویں سال مرزا خان کی جگہ اعتقاد خان کا بہ حیثیت صوبہ دار اودھ تقرر ہوا۔

صوبہ جاتی صوبہ داران

صوبہ جاتی صوبہ[61] داران کا انتخاب ان فوجی افسروں میں سے ہوتا جن میں انتظامی امور کی بھی خداداد قابلیت ہوتی۔ امید کی جاتی تھی کہ وہ صاحب کردار و ایمان ہوں گے۔ شاہجہاں صوبہ داروں کی نااہلی یا صوبہ جات کی بد نظمی گوارا نہ کرتا تھا۔ چاہے اس کا کیسا ہی منظور نظر رہا ہو لیکن اگر وہ عملی کارگزاریوں میں ناقابل اطمینان پایا جاتا یا بادشاہ تک اس کی شکایت پہنچتی تو اس کو برطرف کرنے میں وہ کبھی دریغ نہ کرتا۔ مثال کے لیے اعظم خان اور شائستہ[62] خان کو دیکھ لیجیے۔ ان دونوں کو گجرات کی صوبہ داری سے برطرف کر دیا اس لیے کہ وہ لوگ نااہل

تھے اور تربیت خان کو کشمیر کی صوبہ[63] داری سے اس لیے برخواست کیا کہ لوگوں نے اس کی شکایت کی تھی۔ برخلاف اس کے ظفر خان کو کشمیر کا صوبہ دار اس لیے بنایا گیا کہ لوگ اسکو چاہتے[64] تھے۔ صوبہ دار کی برطرفی کی ایک اور مثال وزیر خان کی ہے وہ پنجاب کی صوبہ داری سے اس لیے ہٹایا گیا کہ ظلم کرتا[65] تھا۔

صوبہ دار کی مدت ملازمت

صوبہ دار کی مدت ملازمت کا دارومدار شہنشاہ کی[66] مرضی پر تھا۔ اس تبادلہ کے اصول تعین کا پتہ چلانا دشوار ہے لیکن اتنی بات ضرور واضح ہے کہ ہر آرزو مند موزوں شخص کو اس گراں بہا عہدہ پر مستفیض ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔

صوبہ داروں کے اختیارات

صوبہ داروں کے اختیارات تین شعبہ جات پر مبنی تھے۔ شہری، عدالتی، فوجی[67]۔ بہ حیثیت شہری افسر کے وہ سارے انتظامیہ کے عمل و انتظام کا سربراہ تھا۔ بہ حیثیت حاکم عدل وانصاف وہ قاضی و میر عدل کے فیصلوں کی اپیل سنتا تھا اور بہ لحاظ فوجی افسر اپنے صوبہ کے مخصوص عسکری حصہ پر حکمرانی کرتا اور اس کی داشت کا ذمہ دار ہوتا۔ وہ اپنے سارے ماتحت افسروں کو برطرف کر سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جو براہ راست شہنشاہ کے آوردہ ہوتے۔ وہ کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جن کی سزائے موت کی اجازت مرکز سے حاصل نہ ہو جائے۔ وہ لوگوں کے شہری حقوق کا نگراں ہوتا۔ اس سے امید کی جاتی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے مشورے سے انتظامی امور فیصل کرے گا۔

میر بخشی : ہر صوبہ میں دیوان[68] مالیات کا افسر خاص ہوتا۔ نظریاتی اعتبار سے وہ صوبہ دار کا ماتحت ہوتا مگر عملی اعتبار سے مرتبہ میں اس کا ہم پایہ ہوتا۔ اس کا تقرر براہ راست بادشاہ کرتا اور اس سے امید کی جاتی کہ صوبہ دار پر بھی نظر رکھے گا۔ اس عہد میں صوبہ جاتی دیوان بیک وقت متعدد عہدوں پر مامور ہوتا۔ محمد

وارث[69] نے شیخ موسیٰ گیلانی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ اکیسویں سال عہد حکومت میں دیوان، امین اور فوجدار کے مختلف عہدوں پر ملتان میں بیک وقت کام کرتا رہا۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔

عامل : عامل یا مال گذاری وصول کرنے والے[70] سے امید کی جاتی کہ وہ زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں متعدد فرائض انجام دے گا۔ مالیات و انتظامات کے سلسلے میں اس کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ جہاں کہیں کوتوال کا تقرر نہ ہوتا وہاں عامل ہی کو اس کے بھی فرائض انجام دینے پڑتے[71]۔

ٹکچی : عامل کی امداد کے لیے ٹکچی[72] یا محافظ دفتر اور پوتا[73] دار یا خزانچی بھی ہوتے۔

پوتادار : ایک صوبہ جاتی وقائع نویس[74] بھی ہوتا جو اپنی روداد، دیوان کے توسط سے دربار کو بھیجا کرتا۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں ایک صوبائی بخشی کے عہدے کے بھی حوالے ملتے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ دونوں عہدے[75] متحد کر دیے جاتے۔

سرکار

صوبہ جات کے بعد ایک انتظامی[76] واحدہ سرکار کہلاتا۔ اس میں کئی ایک پرگنے شامل ہوتے۔ اس کا انتظام کار ایک فوج دار[77] ہوتا۔ اپنی تخت نشینی کے دن شاہجہاں نے متعدد سرکاروں کے لیے افسر مقرر کیے۔ عصری تاریخوں[78] میں فوجداری سرکار کا فقرہ اکثر نظر آتا ہے۔

پرگنہ اور گاؤں کا انتظام اس کے عہد میں کیسے ہوتا تھا اس کا کوئی واضح تصور نہیں۔ غالباً قانون گو پرگنہ کا اور پٹواری کا افسر ہوتا تھا۔

عدالتی انتظام : مذکورہ بالا اندراجات کی بنا پر عدالتی انتظام کا ایک تصور ذہن

میں قائم کر لینا مشکل کام نہیں۔ عدالتی نظم و نسق کا صدر اعلیٰ شہنشاہ تھا۔ وہ ابتدائی مقدمات اور صوبہ جات کی اپیل کی بھی سماعت کرتا۔ دار السلطنت میں قاضی القضاۃ اس کا قانونی مشیر اعلیٰ تھا اور صوبہ جات میں یہ فرض قاضی اور میر عدل[79] ادا کرتے۔ اس عہد حکومت میں یہ دونوں عہدے متحد کر دیے گئے تھے۔

محکمہ خبر رسانی: مغلیہ عہد حکومت کے اس پر کار محکمہ کی تعریف بہت سے مغربی سیاحوں بھی کی ہے[80]۔ داراسلطنت میں اس محکمہ خبر رسانی کا سر دار دفتر وقائع نویس ہوتا تھا۔ جس کی نمائندگی صوبہ جات میں وقائع نویس اور اضلاع میں کوتوال کرتے تھے۔

سڑکیں: داراسلطنت اور صوبہ جات کو مختلف سڑکوں سے متحد کیا گیا[81] تھا۔ ایک سڑک مشرق کی طرف بنگال اور مغرب کی طرف پشاور جاتی تھی۔ دوسری راجپوتانہ ہوتے ہوئے احمد آباد اور پھر وہاں سے دکن جاتی تھی۔ تیسری مالوہ سے برہان پور پہنچتی تھی۔ ان پر دو رویہ سایہ دار درخت تھے اور مقررہ منزلوں پر آرام دہ کارواں سرائے تھیں۔ جومان ریکو کے الفاظ میں بیماری یا تکان یا بارش میں مسافروں کو پناہ و سایہ دیتی تھیں۔ پاس پڑوس کے گاؤں یا شہزادے یا ایسے امراء صاحبان اقتدار جو اپنی یاد قائم رکھنے کی آرزو کرتے وہ ان راستوں کی تعمیر و تشکیل کے اخراجات میں حصہ لیتے۔

راستوں کی محافظت: مسافروں اور[83] تاجروں کی حفاظت کے لیے حکومت ان سڑکوں کی مناسب نگرانی کرتی۔ فوج دار کا فرض تھا کہ دن دھاڑے ڈکیتی کی روک تھام کرے۔ اس کے علاوہ دوسرے

مقامی افسروں سے بھی امید کی جاتی تھی کہ سڑکوں پر امن و اطمینان رکھنے میں مدد کریں گے، باایں ہمہ بد معاشی اور رہزنی کی واردات اکثر ہوتی رہتیں۔ لیکن جب ایسی واردات سرزد ہوتی اور مقامی افسران ملزم کے پتہ لگانے میں ناکامیاب رہتے تو ان کو مجبور کیا جاتا کہ خسارہ کی تلافی کریں یا وہ ملازمت سے نکال دیئے[84] جاتے۔

سزا کی نوعیت

آج جس انداز کو ہم بہیمانہ سزا سمجھتے ہیں اس زمانے میں رائج تھا۔ سزا کا مقصد اصلاح انسانیت نہ تھا۔ بلکہ انتقامی تھا۔ جرم کے تناسب کا بھی سزا میں خیال نہ رہتا۔ عضو کی قطع برید، شکنجے میں کسا جانا، درّے مارنے کا عمل (اگرچہ منوچی کا بیان صحیح مان لیا جائے) سانپ اور بچھو سے کٹوانے کی سزا عام تھی[85]۔

قید خانے

گوالیار، رنتھمبور اور غالباً روہتاس کے قلعے سیاسی مجرموں کے لیے شاہی قید خانے تھے۔ لیکن عام ملزموں کے لیے مقامی قیدی خانے تھے۔ ان میں سے ایک بندی خانہ کا بیان کرتے ہوئے مان ریکو، لکھتا ہے کہ قیدیوں کو چارپائی یا بستر کی اجازت نہ تھی۔ لیکن بیماری کی حالت میں وہ اپنے طور پر طبّی امداد حاصل کر سکتے تھے[86]۔

چوکی

صوبہ جات سے شاہی دربار تک خبر رسانی کے لیے تیز رفتار قاصدوں کی ڈاک مناسب مقامات پر تعینات رہتی۔ اس محکمہ کا نام ڈاک چوکی تھا[87]۔

حکومت مغلیہ کا کردار فوجی کیوں تھا؟

مغلیہ نظام کی انفرادیت اس کا عسکری کردار تھا۔ اس کی پہلی وجہ تو آبادی کی نوعیت[88] تھی۔ دوسری وجہ انتظامی تخصیص کے تصور کی عدم موجودگی تھی۔ عہد

متوسط میں عوام، آج کے مقابلہ میں زیادہ جنگ جو تھے۔ اطاعت و سپردگی سے ان کو نسبتاً زیادہ تنفر تھا۔ سرکشی کے اس رجحان کا ثبوت ان بے شمار مہمات میں ملتا ہے جو مقامی بغاوت دارالسلطنت کے اتنے قریبی علاقہ جات جیسے دوآبہ میں فتنہ فرو کرنے کے لیے بھیجی گئیں۔ علاوہ بریں صوبہ جات کے اہم مرکزوں پر مال گذاری وصول کرنے کے سلسلہ میں عامل کی امداد کے لیے فوجوں کا اجتماع بھی رہتا۔

تخصیص کا فقدان

فن حکمرانی ہنوز عالم طفولیت میں تھا۔ افسروں کے ایک خاص طبقہ کو کسی خاص انتظامی فن سے واقف کار بنانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ برخلاف اس کے ہر افسر کو فوجی و انتظامی[89] مسائل کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ اور چونکہ سرکاری ملازمت بنیادی طور پر فوجی تھی اس لیے سارا انتظامیہ فوجی کردار کا مرقع نظر آتا۔ اس زمانے میں صدر بھی فوجی افسر تھا۔ چنانچہ اپنی تنخواہ بھی وہ فوجی حفظ مراتب کے لحاظ سے پاتا[90]۔

منصب داری نظام

حکومت کے سارے فوجی اجزائے ترکیبی کا دارومدار منصب داری نظام پر تھا۔ منصب کی تشریح کرتے ہوئے اردن، کہتا ہے کہ اس مقصد حق تفوق و ترجیح بہ سلسلہ ملازمت طے کر کے تنخواہ کا درجہ وار مقرر کرنا تھا۔ لازمی طور پر کسی عہدہ کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ تنخواہ پانے والا سرکاری ملازم ہے اور اس کا پابند ہے کہ حسب طلب اس کے معاوضہ میں چند خدمات ادا کرے[91]۔ اس تنظیم و ترتیب کے پس پشت یہی مقصد کار فرما تھا۔ نظریاتی لحاظ سے یہ کام سیدھا سادا ہے لیکن عملی اعتبار سے ایسی پیچیدگیوں کا مجموعہ ہے جو آج تک بیان میں نہ آسکیں۔

اس نظام کا منشاء

یہ منصب داری نظام اکبر نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ فوجی افسروں کو دغا اور

غبن سے محفوظ رکھا جاسکے اور فوجی نظم و نسق بھی پائیدار ہو سکے۔ اس کے عہد میں قواعد[92] "داغ و تصحیح" پر سختی سے عمل کرنے میں منصب دار کے عہدہ اور جتنی فوج اس کو رکھنی چاہیے اس کی اصل تعداد میں بڑی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے جانشینوں کے دور میں بعض جدید عسکری امتیاز کی وجہ سے نظریہ اور عمل میں وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

سوار کا مرتبہ

اس امتیاز میں سب سے پہلے سوار کا مرتبہ آتا ہے۔ اصل میں اس کا وجود اکبر کے آخری عہد حکومت میں ہوا اور بخیلانہ انداز میں افسروں کو عطا کیا گیا۔ لیکن اس کے جانشینوں کے زمانے میں یہ مرتبہ[93] عام طور پر دیا جانے لگا۔ اس طریق کار کا راز یہ تھا کہ ماتحت سپاہیوں کی تعداد میں بغیر اضافہ کیے ہوئے افسر کو ایک اور اعزاز سے ممتاز کر دیا جائے۔ جب کبھی کوئی افسر یہ اعزاز حاصل کرتا تھا تو اس کا بنیادی مرتبہ ذات، اور اضافہ کردہ امتیاز "سوار" سمجھا جاتا۔

ذات اور سوار کی اہمیت

ذات اور سوار کی اصطلاحی اہمیت پر کافی اختلاف رائے ہے۔ 'بلاچ مین' (Blachmann) کا کہنا ہے کہ ذات سے مراد سپاہیوں کی وہ تعداد تھی جس کے فراہم رکھنے کی توقع منصب دار سے کی جاتی تھی اور 'سوار' سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ منصب دار کے زیر اثر اتنے آدمی واقعی موجود ہوں۔ وہ اپنی تنخواہیں اوّل[94] الذکر سے حاصل کرتے ہوں۔ لیکن یہ رائے دو وجہوں سے ناقابل قبول ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے سوار کے منصب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ بعض افسران ایسے بھی تھے جن کو صرف ذات کا منصب دیا گیا تھا۔ اگر ہم بلاچ مین (Blachmann) کی رائے تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو دونوں اعزاز یعنی ذات و سوار کے اعزاز سے مشرف تھے ان کی بہ نسبت اس ایک اعزاز والے کو زیادہ ملازم رکھنا پڑتا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان

کی حیثیت کم ہو جائے گی۔

اروِن

اروِن کا خیال ہے کہ مرتبہ ٔسوار ایک اضافی اعزاز تھا۔ اور ان سواروں کی تعداد کی نشاندہی کرتا جو 'ذات' کے لحاظ کے علاوہ ملازم رکھے[95] جاتے۔ یہ رائے تین وجوں سے قابل قبول نہیں، اوّل تو یہ کہ اس نظریے کے تحت مغل فوج کی تعداد حد شمار سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر منصب یافتہ افسر سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ فالتو آدمی نوکر رکھے تو یہ اعزاز رحمت کے بجائے باعث زحمت ہو جائے گا اور تیسرے یہ کہ بعض حالات میں منصب دار کے پاس اتنے سوار ہو جائیں گے کہ شہزادوں کے پاس بھی نہ ہوں گے اور یہ بات بعید از قیاس ہے۔

ڈاکٹر ترپاٹھی

ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی نے اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرتبہ سوار ایک ایسا اعزاز تھا جس سے اس کے سواروں کی معینہ تعداد نظر انداز کر کے اس کو ایک زائد عطیہ[96] دیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرتبہ سوار کو اصل تعداد سے کچھ مطلب نہ تھا۔ اس کی پابندی صرف "ذات" سے ہوتی تھی۔ ہر سوار کی ملازمت پر افسر کو کتنا روپیہ ملتا تھا یہ بات اب تک طے نہیں ہو سکی۔

دو اسپہ و سہ اسپہ

مرتبہ سوار سے بالاتر جہانگیر کے عہد حکومت میں ایک اور بھی امتیاز دو اسپہ و سہ اسپہ وجود میں آیا جو منصب دار کے حصہ کا جزو یا کل پر اثر انداز ہو گا۔ بادشاہ نامہ[97] میں اس کا واضح بیان ہے کہ ایک دو اسپہ منصب دار دو گنا سوار کے منصب دار سے امید کی جاتی تھی وہ تین سو سہ اسپہ فوجی، چھ دو اسپہ فوجی اور ایک اسپہ سو[100] فوجی ملازم رکھے گا۔ لیکن اگر اس کا مرتبہ 5 ہزار ذات اور 5 ہزار سوار (سب کے

سب دواسپہ وسہ اسپہ) کے منصب دار تک پہنچتا ہے تو اس سے امید کی جاتی تھی کہ وہ 6سو، سہ اسپہ، 12 سو دواسپہ، اور دو سو، یک اسپہ، فوجیوں کو ملازم رکھے گا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بہت کم ایسے مواقع تھے کہ جہاں کسی منصب دار کی پوری سپاہ کے واسطے دواسپہ وسہ اسپہ کی صفت استعمال کی گئی ہو۔

اس امتیازی صورت حال سے بڑے انتشار پیدا ہوئے

مذکورہ بالا بحث سے اس فوج کی واقعی اور غیر واقعی تعداد میں بڑا فرق آ گیا جو منصب داروں کے قبضہ میں رکھی گئی تھیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے شاہجہاں نے اپنے عہد کے 20ویں[98] سال میں بہت سے احکام جاری کیے۔ نئے ضابطہ سے اس منصب دار کو جو ہندوستان میں صاحب جاگیر ہو صرف ایک تہائی فوجیوں کی تعداد رکھنے کی اجازت دی گئی مثلاً ایک افسر جو تین ہزار ذات اور تین ہزار سوار کا منصب رکھتا تھا اس کو داغ کے لیے صرف ایک ہزار فوج حاضر کرنا تھا۔ لیکن اگر ہندوستان کے باہر کسی صوبہ میں اس کا تقرر ہو تو اپنے نامزد حصہ کا صرف ایک چوتھائی فوجی سپاہی رکھے۔ اس تعداد میں اس وقت اور کمی کر دی گئی جب بلخ پر حملہ ہوا تھا اب اس کا تناسب پانچویں حصہ تک معین کر دیا گیا تھا۔

شاہجہاں کے آخری دور حکومت میں سب سے بڑا منصب دار شہزادہ دارا تھا۔ جو کمانڈر تھا چالیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کا، اور سب دواسپہ وسہ اسپہ تھے۔ شاہی خاندان کے باہر سب سے بڑا اعزاز جو کسی افسر کو نصیب ہوا وہ 7 ہزار ذات اور 7 ہزار سوار کا تھا۔ آصف خان 9 ہزار ذات، 9 ہزار سوار کا منصب دار ضرور تھا مگر اس کو استثنیٰ سمجھنا چاہیئے، وہ شہنشاہ کا خسر بھی تھا اور اس کو تخت دلانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ عہد حکومت کے تیسویں سال کے اختتام پر 7 ہزار ذات اور 7 ہزار سوار کے منصب دار صرف تین افسر تھے۔ علی مردان خان، سعید خان اور اسلام خان[99]۔

منصب کی درجہ بندی

ذات و سوار کی بنا پر منصب دار (علاوہ 5 ہزار سے اوپر کے افسران جو اس درجہ بندی سے مستثنیٰ تھے) 100 اور بھی تین درجوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ 5 ہزار سے نیچے اگر ذات و سوار کے منصب برابر تھے تو افسر درجہ اوّل کا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ اگر سوار منصب کا بقدر نصف یا نصف سے زائد ہو تو ایسا افسر درجہ دوم کا عہدہ دار تصور کیا جاتا۔ لیکن اگر سوار منصب نصف سے کم ہو تو وہ تیسرے درجہ کا عہدہ دار سمجھا[101] جاتا۔

عہدہ کے مدارج

3 ہزار ذات سے لے کر 7 ہزار ذات تک کے مراتب میں ایک ہزار کا فرق ہوتا۔ صرف ایک افسر ایسا تھا جو 3500 سو کا منصب دار تھا۔ ایک ہزار سے دو ہزار پانچ سو کے درجہ میں 500 کا فرق تھا۔ اور ایک ہزار کے نیچے سے پانچ سو میں ایک سو کا فرق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۰ سب سے کم تر اعزاز تھا۔ یہ بڑا عام اعزاز تھا اور اس کے عہد حکومت میں ایسے منصب داروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی[102]۔

تنخواہ

بہت کم ایسے منصب دار تھے جو سال کے بارہ مہینوں تک تنخواہ پاتے رہے ہوں۔ شاہجہاں کے عہد حکومت کے اواخر میں معیاد کی مدت دس مہینے[103] تھی۔ غالبًا یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا حب علی مردان خان 7 ہزار ذات اور 7 ہزار سوار جس میں سے ۵ ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب دار بنایا گیا تھا تو اس کی تنخواہ تیس 30 لاکھ روپیہ سالانہ تھی اور سال بارہ مہینہ کا تھا[104]۔ بعض اوقات لطف و کرم کی علامت کے طور پر تنخواہ کے علاوہ وظیفہ سے سرفراز[105] ہوئے۔

امتیازات

ذات اور سوار کے علاوہ دوسرے امتیازات بھی تھے جو مستحق افسروں کو دیے

جاتے۔ طومان وطغ جو عام طور پر شہزادوں کے لیے مخصوص تھا وہ بھی ایسے منصب دار کو عطا کیا جا سکتا تھا جو سات ہزار ذات[106] و سوار سے کم کا نہ ہو۔ طبل و علم بھی اعلیٰ پایہ افسروں[107] کو مل سکتے تھے۔ ماہی و مراتب صرف دکنی افسروں کے لیے مخصوص[108] تھے۔

جائزہ

منصب داروں کو اپنا فوجی دستہ جائزہ کے لیے معینہ وقفہ پر پیش کرنا پڑتا۔ جن کو جاگیریں دی گئی تھیں وہ سال میں ایک بار لاتے تھے۔ اور 6 مہینے بطور مہلت دے دیئے جاتے۔ لیکن جو لوگ نقد تنخواہ پاتے ہر چھ مہینے پر اپنا دستہ ملاحظہ کے لیے لے آتے۔ ان کو صرف دو ماہ مہلت کے لیے دیے جاتے۔

منصب دار برسر ملازمت اور دربار شاہی میں

منصب دار ایک جگہ قیام پذیر نہ ہوتے۔ ان کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ حاضر دربار رہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ان کو غیر فوجی فرائض بھی انجام دینے پڑتے جو اعلیٰ مرتبہ کے ہوتے ان کو صوبہ جات کا صوبہ دار بنایا جاتا یا شمالی و مغربی سرحدی مہم کے وقت فوج کے کوچ کرنے کی دیکھ بھال سپرد کر دی جاتی۔[110] جب یہ لوگ فرض گذاری کے لیے دربار سے دور ہوتے تو ان کو تعینات کہا جاتا۔ جو لوگ دارالسلطنت میں رہتے ان کو "حاضر رکاب" کے نام سے یاد کیا جاتا۔ وہ پہرہ چوکی یا دوسرے فرائض حسب الحکم شہنشاہ انجام دیتے۔

احادیاں

منصب داری نظام کا انحصار بالواسطہ سپاہیوں کو بھرتی کرنے پر تھا۔ شہنشاہ افسر کا درجہ متعین کرتا اور اس کا فرض ہو جاتا کہ اپنے اعزاز کے لحاظ سے حسب تناسب سپاہی بھرتی کرے۔ لیکن شاہی فوج میں سپاہی براہ راست بھی بھرتی کیے جاتے ایسے سپاہی احدی کہلاتے[112]۔ اور ان کو عرف عام میں خانگی سپاہ کہا جاتا عام سپاہیوں سے ان کی تنخواہ بہتر ہوتیں۔

بے قاعدہ

فوج کی ایک شاخ ایسی بھی تھی جس کو بے قاعدہ[113] کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کے بنانے والے راجپوتانہ کے باج گزار اور دوسرے زمیندار تھے۔ لیکن جو لوگ باقاعدہ منصبداری کے اعزاز پر پہنچ جاتے ان کو اپنے نسلی درباریوں کے علاوہ منصب کے تناسب سے بھی فوجی حصہ پورا کرنا پڑتا۔

ملازمت کی شاخیں

یہ زبردست فوجی نظم ونسق، بہ لحاظ ملازمت چار شاخوں پر مشتمل تھا۔ پیدل، سوار، توپ خانہ، بحریہ،

پیدل

جنگ جوئی کے اعتبار سے ان کی اہمیت ختم ہو چکی تھی[114]۔ اب یہ ایک مخلوط اجتماع تھا۔ جس میں لڑنے والے او غیر لڑنے والے یا مہیر سب شامل تھے۔ آخر الذکر کی فہرست میں خدمتی، دربان، قلی، کہاریا پالکی بردار، پہلوان، میوراس یا جاسوس سب تھے۔ جنگ کرنے والوں میں شمشیر باز،[115] برق انداز شامل تھے۔

ملازمت کی سب سے اہم شاخ رسالہ تھا۔ یہ منصبداری نظام کا خاص سہارا تھا۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا کہ فوجی سپاہی اچھے گھوڑے اور پوری مقررہ تعداد مہیا کریں۔ اوسطاً ہر سپاہی کو دو گھوڑے رکھنے پڑتے، ایک تو محاذ جنگ کے لیے اور دوسرا وقت ضروری کے لیے محفوظ رکھا جاتا۔ اس طرح شعبۂ رسالہ بحیثیت مجموعی پرکار و بخوبی منظم تھا۔ برنیر نے بھی اس کی بجا تعریف کی[117] ہے۔

توپ خانہ

شاہجہاں کے عہد حکومت میں توپ خانہ کی داشت و پرداخت زیادہ تر اہل مغرب[118] یعنی ڈچ، انگریز، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے سپرد تھی۔ نوعیت کے لحاظ سے یہ دو طرح کا تھا۔ ایک بھاری توپ خانہ اور دوسرا ہلکا توپ خانہ۔ برنیر کے خیال میں آخر الذکر بیحد منظم تھا[119]۔ لیکن بھاری توپ خانہ بھی تھا اور ایرانی

عصری توپ خانہ کے مقابلہ میں کمتر بھی تھا۔

بحریہ

شعبۂ بحریہ قابل[120] ذکر نہ تھا، لیکن بار برداری کے لیے کشتیوں کے بیڑے کا کام نواڑا تھا۔ بہر حال دو موقعوں پر یہ نواڑا فوجی کام میں بھی استعمال کیا گیا[121] ایک مرتبہ ہگلی کے پرتگالیوں کے خلاف اور دوسری مرتبہ آسام کی جنگ میں[122]۔

محکمۂ مالیات کی کارگزاری

فوجی شعبہ جات کے بعد لیکن مساوی اہمیت کا ادارہ محکمہ مالیات تھا۔ عصری تاریخی کتابوں میں منتشر رائے زنی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہجہاں کو کاشتکاروں کی بہبود کا بڑا خیال تھا۔ مال گزاری وصول کرنے والوں کی سخت گیری سے کاشتکاروں کو بچانے کے لیے اس نے غیر قانونی چنگی کو کشمیر میں بند کرادیا اور اس کا دور آبپاشی کے لیے متعدد نہروں کی ساخت کا نمایاں کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

نظم ضبطی

محکمۂ مالیات کی اکبری تشکیل و تکمیل اور اس دور کے انتظام میں بین فرق ہے۔ اکبر کے نظام ضبطی کا منشاء جاگیری نظام کو ختم کر کے کاشتکاروں سے براہ راست رابطہ قائم کرنا تھا۔ اس کی نمایاں خصوصیت پیائش و تخمینہ تھی۔ ساری وصولی نقد ہوتی تھی اور حکومت کا مطالبہ مجموعی پیداوار کی ایک تہائی معین تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نظام ضبطی کا رواج سلطنت کے صرف منظم صوبہ جات میں[127] تھا۔ بنگال، سندھ، کابل، خاندیش اور کشمیر اس کے دائرہ عمل سے باہر تھے۔ ان مقامات میں مال گزاری کی وصولی غلہ بخش[128] اصول پر ہوتی تھی یا تقسیم فصل یا نسق[129] کے لحاظ سے یعنی بطور چک بندی ہوتی۔ پہلے طریق کار میں کاشتکاروں سے براہ راست رابطہ قائم کرنا ممکن تھا۔ لیکن آخر الذکر میں اس کی گنجائش نہ تھی۔

شاہجہاں کی رائج کردہ تبدیلیاں

شاہجہاں کے زمانے میں جاگیری نظام کی تجدید نظام ضبطی کی بیخ کن تھی۔

ساوی سلطنت کی زمین زیر کاشت تھی[130]۔ نتیجہ یہ تھا کہ خالصہ کی زمین (زمین جو براہ راست انتظام میں تھی) کافی گھٹ گئی۔ مجموعی پیائش بجائے استثناء کے قانون بن گئی[131]۔ اور سرکاری مطالبہ ایک تہائی سے بڑھ کر تقریباً نصف تک آ گیا۔ کاشتکار کا بوجھ اور بڑھ گیا کیونکہ اس کو نہ صرف اس زمین کا لگان ادا کرنا پڑتا جو واقعی زیر کاشت تھی بلکہ اس زمین کا بھی محصول دینا پڑتا جو اس کے قبضہ میں تھی[132]۔ اس طرح زمین کی مال گزاری چالیس کروڑ روپیہ ہو گئی[133]۔

دکن میں قحط

اس عہد حکومت میں ایک بڑا سخت قحط دکن میں پڑا۔ پنجاب اور کشمیر میں بھی غلہ کی کمی ہوئی۔ 31-1630ء کے قحط کا رد عمل دور تک پڑا۔ گولکنڈہ، احمد نگر، گجرات، اور مالوہ کے بعض حصے متاثر ہوئے۔ عصری مورخوں نے دکن میں جان تلفی اور لوگوں کے شدید مصائب کا بڑا دل سوز بیان قلم بند کیا ہے۔ ”لوگ ایک لقمہ پر جان بیچنے کو تیار تھے مگر کوئی خریدار نہ تھا۔ ایک روٹی پر منصب فروخت ہوتا تھا مگر کوئی توجہ نہ کرتا تھا............“ عرصہ تک کتے کا گوشت بکری کے گوشت سے بجائے بکتا رہا۔ مردوں کی ہڈیاں کوٹ کر آٹا میں ملائی اور بیچی جاتی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو کھائے جاتے تھے۔ بیٹے کا گوشت اس کی محبت سے زیادہ قیمتی ہو گیا تھا شہنشاہ نے غریبوں اور لاچاروں کے لیے خیرات خانے اور لنگر خانے کھلوادیے۔ برہان پور میں ہر دوشنبہ کو 5 ہزار روپیہ غرباء و مساکین میں تقسیم کیا جاتا، احمد آباد میں محصولات کی معافی بڑے پیمانے پر کردی گئی تھی[134]۔

کشمیر

1641ء میں بے پناہ بارش نے کشمیر کی فصل خریف کو شدید نقصانات پہنچائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ کم یاب ہو گیا۔ کوئی پچاس ہزار باشندے وطن چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ اس وقت وہاں شہنشاہ بھی موجود تھے۔ سب لوگ ایک ساتھ

جھروکہ درشن پہنچے، اپنی مصیبتیں بیان کیں۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ ان لوگوں میں ایک لاکھ روپیہ تقسیم کیا جائے اور دو سو روپیہ روزانہ کا کھانا ان سب کو کھلایا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے تیس ہزار روپیہ تربیت خان کے پاس بھیجا کہ کشمیر کی قحط سالی کے سلسلے میں خرچ کیے جائیں۔ نیز یہ بھی حکم دیا کہ پانچ باورچی خانے قائم کر کے گوشت اور روٹی غریبوں کو فراہم کی جائے۔ لیکن تربیت خان انتظام نہ کر سکا۔ اس کی جگہ ظفر خان کو تعینات کیا گیا۔ شہنشاہ نے آخر الذکر کو مزید بیس ہزار روپیہ قحط زدہ لوگوں پر خرچ کرنے کو بھیجا[135]۔

پنجاب

1656ء میں بارش کی قلت سے پنجاب میں بھی قحط پڑا۔ شہنشاہ کے حکم سے اس صوبہ میں دس باورچی خانے اس لیے قائم کیے گئے کہ لوگوں کو کھانا دیا جائے۔ سید جلال کو حکم ہوا کہ دس ہزار روپیہ غریبوں اور لاچاروں میں تقسیم کیا جائے۔ جو لڑکے بیچے جا چکے تھے ان کو حکومت نے آزادی دلا کر ان کے وارثوں کو دلا دیا۔ فروری 1647ء میں شاہجہاں نے مزید تیس ہزار روپیہ پنجاب میں قحط سے لوگوں کو بچانے کے لیے منظور کیا[136]۔

انتظامیہ کی روح

شاہجہانی حکومت کے انتظامیہ کی مشین کا عام جائزہ لینے کے بعد آیئے اب اس بات پر غور کریں کہ اس کے پس پشت کون سا جذبہ کام کر رہا تھا۔ پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ حکومت کے مذہبی رویہ میں تبدیلی آئی۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اب ہوا کا رخ بدل کر ادھر سے ادھر ہو گیا تھا۔ مورخین بڑی فیاضی سے شاہجہاں کے اسلامی روایات کی تجدید پر مرحبا و آفریں کہتے ہیں۔ بادشاہ کو سلام کرتے وقت سجدہ کرنے کی رسم کی تنسیخ اور بادشاہ کی تصویر کا پگڑیوں میں رکھنے کی ممانعت یہ سب باتیں اس کے مذہبی رجحانات کی مثالیں سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ان باتوں سے بھی زیادہ اہم اس کا وہ رجحان ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔

اس فہرست میں ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں۔

مندروں کی بے حرمتی

ہندوؤں کے مندروں کی بے حرمتی و بربادی کے دستور کی تجدید اگرچہ جہانگیر کے زمانے میں ہوئی مگر شاہجہاں کے عہد حکومت میں منظم ہو گئی۔ ساری سلطنت بالخصوص بنارس کے نئے بنائے ہوئے مندروں کو گرا دینے کا پہلا حکم شاہجہاں نے 1633ء میں نافذ کیا۔ اس حکم کے بعد ہی (ستمبر، اکتوبر میں) ایک قطعی ممانعت نئے مندر تعمیر کرنے اور پرانے مندروں کی مرمت کرنے کی ہوئی[139]۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی وضع قطع کے لحاظ سے رہنے، مے فروشی یا جلوت وخلوت میں مے نوشی اور مسلمانوں کے قبرستان سے متصل مردوں کے یا "ستی" کے جلانے اور جنگ کے مسلمان غلاموں کے خریدنے کی ممانعت ہو گئی[140]۔

بدعتی عملیات کی تنسیخ

سلطنت کے بعض حصوں خاص کر پنجاب، کشمیر اور گجرات (پنجاب) میں ہندو و مسلمان آزادی سے ملتے جلتے تھے۔ بلکہ آپس میں شادی بھی کر لیتے مثلاً بھمبھار میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی ہندو اپنی لڑکی کی شادی کسی مسلمان کے ساتھ کر دیتا تھا تو مرنے پر اس کی لاش دفن کی جاتی لیکن اگر کوئی مسلمان کسی ہندو کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرتا تھا وہ لڑکی کے مرنے پر لاش جلائی جاتی تھی۔ 1634ء میں شاہجہاں نے یہ رواج منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے واپس لے لی جائیں۔ لیکن اگر کوئی ہندو مسلمان ہو جاتا تو اسے اجازت ہو جاتی تھی کہ لڑکی اپنے ساتھ رکھ سکے بشرطیکہ شادی دوبارہ مسلمان کی طرح کرے[141]۔

مذہب کی تبدیلی

ہندوؤں کو مذہب تبدیل کرنے کی منظم کوشش خواہ بذریعہ ترغیب خواہ بہ جبر[142] بادشاہ کے اشاروں پر ہوتی رہی۔ ترغیب کے سلسلے میں دلفریب ملازمتوں اور انعاموں کا لالچ دیا جاتا۔ اس تبلیغ[143] کا کام شاہ میر لاہوری اور محب علی

سندھی کے سپرد تھا۔ یہ نو مسلموں کو شہنشاہ کے حضور میں پیش کرتا اور وہ ان کو خطاب و اعزاز سے سرفراز کرتا یا خاص وظائف دیتا۔ ہندوؤں کو سختی سے منع کیا جاتا کہ وہ اپنے اعزاء کو کسی طرح بذریعہ اثرات یا رکاوٹ مسلمان ہونے سے نہ روکیں[144]۔ تبدیلی مذہب کے سلسلے میں امراء کے دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ راجہ بختاور سنگھ ولد راج سنگھ کچھواہا کو تبدیل مذہب کرنے پر ایک خلعت اعزاز اور دو ہزار روپیہ ملے۔ اور اس کے لڑکے پرشوتم سنگھ کو مذہب بدلنے پر سعادتمند کا خطاب ملا۔

دو مثالیں کاغذات میں ایسی بھی ملتی ہیں کہ سرکاری ملازموں کو مذہبی معتقدات کی بناء پر تبدیل یا برخواست کیا گیا۔ لشکر خان کابل سے اس لیے ہٹایا گیا کہ اس کے ڈھیلے ڈھالے اعتقادات[146] وہاں کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھے اور جلال الدین طباطبائی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے مایا دات کو (Tan) ٹان کی دفترداری سے اس لیے ہٹایا گیا کہ وہ ہندو تھا۔ اس کی جگہ ملا عبداللطیف گجراتی کو مقرر کیا گیا[147]۔

اس پالیسی کی حد

یہ مذہبی ناروا داری صرف ان صوبہ جات میں قابل عمل تھی جو دارالسلطنت سے قریب تر تھے۔ یکساں جوش و خروش کے ساتھ ساری سلطنت میں اس پر عمل نہ ہو سکا۔ بلکہ بعض جگہوں پر ہندوؤں سے مصالحت کر لی گئی۔ ڈیلا ویل بیان کرتا ہے کہ کمبے میں گاؤ کشی ممنوع تھی لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ غیر خدا پرست کو اس رعایت کے لیے کثیر رقم ادا کرنی پڑی[148]۔ مان ریکو بھی لکھتا ہے کہ ہندو اضلاع میں جانوروں کا مارنا منع تھا۔ چنانچہ ایک بار جب وہ اڑیسہ میں سفر کر رہا تھا تو اس کے ساتھی نے ایک مور مار ڈالا۔ اس جرم میں اس کے عضو کاٹ دیے جانے کا حکم ہوا۔ مگر بہت کہنے سننے پر یہ سخت سزا درہ[150] زنی میں بدل گئی۔ اس نے زائرین پر محصول لگنے کا بھی ذکر کیا ہے[151]۔

نظم و نسق پر عام تبصرہ

شاہجہاں کے انتظامی طریق کار نے اپنی گرمی و قوت حیات کو ظاہری صورت میں بر قرار رکھا۔ بلخ و قندھار اور دکن کی مہمات سلطنت میں امن و چین کا غلبہ اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ اس کی حکومت پائدار تھی۔ بر نیر اور منوچی کا یہ کہنا کہ درجات کی ترقی سست و بتدریج تھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کارگزاری کی قابلیت کا اب بھی لحاظ کیا جاتا تھا[152]۔ شاہجہاں کی سخت منصف مزاجی کی بہت سی مثالیں منوچی کے یہاں ملتی ہیں اور ٹیورنیر کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شاہجہاں کے دور حکومت میں اس پر اس سختی سے عمل ہوتا تھا کہ کبھی کسی شخص کو چوری کے الزام پر سزا دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی[153]۔ راستوں کے تحفظ کے سلسلے میں انصاف پسندی کی سخت گیری اور بھی نمایاں تھی۔ بیجا نہ ہوگا اگر ان شہادتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اب تک مغلیہ حکومت کی خصوصیات میں شعور انصاف اور عوام کی بہبود کا جذبہ کار فرما رہتا۔ بشرطیکہ حکمران کے اغراض و مقاصد سے کسی خاص تصادم کا اندیشہ نہ ہوتا۔

لیکن شاہجہاں کا دور حکومت اضداد کا ایک نمونہ ہے۔ ایک طرف ترغیر معمولی شان و شوکت و عظمت کا مظاہرہ تھا دوسری طرف زوال پذیری کے بھی آثار کم نہ تھے۔ اب تک ہم نے اوّل الذکر کا بیان کیا۔ آیئے اب دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے۔ بہت معمولی غور و فکر سے زوال کا سرچشمہ نظر آئے گا۔ جن خرابیوں نے نظم و نسق کا محاصرہ کرلیا تھا ان ہی میں یہ پوشیدہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظم و نسق میں بعض خرابیاں خلقی تھیں لیکن بہت سی خرابیوں کا وجود احتیاط و دور اندیشی کی کمی کا نتیجہ ہیں۔ ان کمزوریوں نے آہستہ آہستہ مگر یکسانیت کے ساتھ اپنا کام کیا اور مغلیہ سلطنت کو زوال سے ہمکنار کر دیا۔

فوجی انتظام کے معائب

فوجی انتظام جو حکومت کا خاص پشت پناہ تھا ڈھیلا ہو گیا تھا۔ علاوہ اسکی جبلی خرابیوں کے جو نظم[154] و ضبط کی عدم موجودگی سے پیدا ہو گئی تھیں، منفقہ عسکری محرکات[155] اور ہاتھیوں[156] پر غیر معمولی اعتماد پر ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نظم و نسق میں کافی سنگین خرابیاں داخل ہو گئیں تھیں۔ جاگیری نظام کی توسیع اور بعدہ' شعبہ داغ و تصحیح میں بیجا نرمی نے منصب داری پر ضرب کاری لگائی۔ امتیازی اعزازات کی مزید بھرمار نے افرا تفری کو اور زیادہ پراگندہ کر دیا۔ مزید برآں نابالغوں کو منصب عطا کرنے کے مہلک اقدام کا بھی وجود اسی زمانہ میں ہوا[157]۔ اس سلسلہ میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ متوفی افسروں کی خدمات کا خیال کرنا بھی ضروری تھا۔ لیکن ان کے نابالغ وارثوں کو منصب عطا کرنا انتظامیہ کی ترقی کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا۔

علاوہ بریں عسکری حجم بہت بڑھ گیا تھا، اگرچہ اندرون ملک کے لیے یہ کار آمد تھا لیکن ولایتوں خاص کر ایرانیوں کے سلسلہ میں کار آمد نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بہادر اور جانباز سپاہیوں کی کمی نہ تھی مگر ان کا فوجی ساز و سامان بار گراں ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ فوجیں آہستہ روی پر مجبور تھیں اور کوئی کرتب یا بہادری کا ایسا کارنامہ جو اکبر کی گجرات کی مہم میں ہوا اب ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ بھی تھا کہ فوجیں کھلے میدان میں اچھی طرح لڑ سکتی تھیں لیکن ناہموار اور شکستہ پہاڑیوں کے محاذ پر بے کار ہو جاتی تھیں۔ احمد نگر کو فتح کرنا افواج کی کثرت تعداد سے ممکن ہوا لیکن مدت کارگزاری بہت طویل ہو گئی اور بلخ میں تو فوج کی کثرت تعداد بھی کام نہ آئی۔

محکمہ مالیات کی لاپرواہی

فوجی نظام میں جو ڈھیلا پن آ گیا تھا وہی مالیات کے شعبہ میں بھی آ گیا۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کی آمدنی بڑھ کر چار کروڑ روپیہ تک ہو گئی تھی لیکن وہ براہ

راست رابطہ حکومت اور رعایا میں اکبر قائم کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے ایک مدت تک کوشش کی تھی اب نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں جیسا اوپر عرض کیا گیا، کاشتکاروں کا بوجھ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ برنیر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ زمین بغیر کاشت کے پڑی تھیں[159]۔

رشوت

انتظامی نظام کا شر انگیز وہ ہمہ گیر دستور تھا جس میں بادشاہ اور بلند پایہ حکام کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ یہ دستور نور جہاں نے قائم کیا تھا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ لیکن شاہجہاں کے دور میں بد تر ہو گیا۔ ایک رضا کارانہ تحفہ کے بجائے اب وہ جبری ہو گیا تھا۔ ہر جشن کے موقع پر شہنشاہ اپنے درباریوں سے نذرانے کی توقع کرتا تھا۔ اور اسی طرح ہر درباری اپنے موقع پر اپنے ماتحتوں سے نذر وصول کر لیتا تھا۔ یہ رشوت ستانی کا سنہرا روپ تھا۔ قریب قریب ہر مغربی سیاح[160] نے اس کو قلم بند کیا اور سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے۔

دوسری ایشیائی سلطنتوں سے رابطہ

یہ بات مغل سرکار اور دوسری ایشیائی سلطنتوں اور ہندوستان میں آئے ہوئے مغربی تاجروں کے ساتھ تعلقات کے مختصر بیان کے بعد ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایران وماوراالنہر کے تعلقات کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب یہاں ہندوستانی مغلوں اور ترکی کے سلطان و شریف مکہ کے تعلقات پر روشنی ڈالیں گے اگرچہ آخر الذکر کے ساتھ رابطہ دنیاوی نہ تھا بلکہ مذہبی تھا۔

ترکی سے مراسلات کی ابتدا

ترکی اور مغلیہ سرکار سے رابطہ کچھ عجیب حالات میں شروع ہوا۔ 1637ء میں گھوڑوں کا ایک ہوشیار تاجر جس کا نام ظریف تھا۔ شہنشاہ سے پروانہ لے کر شاہی اصطبل[161] کے لیے عمدہ گھوڑے خریدنے عرب وترکی گیا[161]۔ شاہجہاں نے

افضل خان کو حکم دیا کہ باز نطان کے وزیر اعظم کو ظریف کے لیے ایک سفارشی خط لکھ دے۔ علاوہ اس کے شہنشاہ نے ظریف کو ایک خط اور چند تحائف معہ ایک شمشیر کے سلطان مراد چہارم کو دیے۔

ظریف ترکی میں

ظریف لاہری بندرگاہ سے روانہ ہو کر مکہ اور مصر کا چکر لگاتا ہوا موصل پہنچا۔ یہاں باز نطان کے حکمران نے شرف حضوری بخشا۔ شاہجہاں کا خط پا کر مراد بیحد خوش ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی ایک مرصّع تلوار پا کر ہوئی جو شاہجہاں نے اس کے لیے بھیجی تھی۔ مراد اس وقت بغداد کے خلاف جنگ کرنے جا رہا تھا۔ اس تلوار کو اس نے فال نیک سمجھا۔ اس نے ظریف سے موصل میں اس وقت قیام کرنے کی فرمائش کی جب تک وہ پانی مہم سے واپس نہ آجائے[162]۔

ارسلان آقا ہندوستان بھیجا گیا

مہم سے واپس ہو کر مراد نے ارسلان آقا کو بہ حیثیت سفیر شاہی دربار میں بھیجا۔ ظریف اس کے ساتھ ہی تھا ان لوگوں نے بصرہ سے ٹھٹھ تک ساتھ ہی بحری سفر کیا۔ شاہجہاں نے ترکی سفیر کو اپریل 1640ء میں شرف حضوری کشمیر میں بخشا۔ ارسلان آقا آٹھ مہینے ہندوستان میں رہنے کے بعد اپنے وطن واپس گیا[163]۔

سید محی الدین کا آنا

بعد کے دس برس تک ترکی و ہندوستان میں سفیروں کی آمد و رفت نہ ہوئی۔ 1650ء میں سورت کے افسروں نے ترکی سفیر محی الدین کی آمد کی اطلاع دی۔ شاہجہاں نے بڑے التزام سے شمال آنے کے لیے متعدد مقام پر سید کے استقبال کا حکم دیا۔ سورت کے افسروں کو حکم ہوا کہ دس ہزار روپیہ کی تھیلی سفیر کو نذر کی جائے۔ ایسے ہی نذرانے اجین اور دہلی میں بھی دیئے گئے۔ برہان پور اور مانڈو میں

اسے دوہزار روپیہ کی تھیلیاں پیش کی گئیں۔ نومبر 1651ء میں اسے رخصت کیا گیا۔

احمد سعید ترکی بھیجا گیا

سید محی الدین کے ہمراہ یہاں سے حاجی احمد سعید مبادلہ میں سفر بنا کر ترکی[165] روانہ کیا گیا۔ شاہجہاں نے اپنے خط میں بلخ و بدخشاں کی لڑائی کا حال مفصل تحریر کیا۔ اس نے اپنی کارگزاریوں کو مذہب کی بنا پر جائز قرار دیا[166]۔ 11/ جون 1653ء کو ترکی سلطان کی حضوری میں حاجی پیش[167] ہوا۔

ذوالفقار ہندوستان بھیجا گیا

سلطان محمد نے اس بار ذوالفقار آقا کو سفیر بنا کر ہندوستان روانہ کیا۔ حاجی احمد سعید بصرہ تک اس کا ہم سفر رہا۔ یہاں سے دونوں الگ ہو گئے۔ ترکی سفیر بصرہ سے بحری سفر کر کے دسمبر 1653ء میں سورت پہنچا۔ جیسا استقبال اس کے پیش رو کا کیا گیا تھا ویسا ہی اس سفیر کا بھی کیا گیا۔ بادشاہ نے مارچ 1654ء میں اسے شرف حضوری بخشا۔ سلطان محمد نے اپنے خط میں[169] نظر محمد کی امداد طلب کرنے کے ذکر کے ساتھ ان تلخ شکایتوں کو بھی لکھا تھا جو شاہجہاں سے نظر محمد کو پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن سلطان نے شاہجہاں کی ان باتوں پر اپنے مطمئن ہونے کا اظہار کیا جو آخر الذکر نے اپنی کارگزاریوں کے جواز میں اس خط میں لکھا تھا جو حاجی احمد سعید لایا تھا۔

قائم بیگ کا مشن ترکی میں

سلطان محمد کے اس بزرگانہ طرز تحریر پر شاہجہاں بہت ناراض ہوا۔ 1654ء میں اس نے اپنا جواب[170] قائم بیگ کے ہی ساتھ روانہ کیا۔ اس نے بری طرح سلطان کے انداز بیان پر نکتہ چینی کی۔ اس کی کم عمری پر طنز کرتے ہوئے اس کے مشیر کاروں کا ناتجربہ کاری کی بھی مذمت کی۔ اس کے بعد سے شاہجہاں کے عہد حکومت تک ترکی اور ہندوستان کے سفیروں کے مبادلہ کا کوئی اندراج نہیں ملتا۔

مکہ

شاہجہاں کے دور حکومت میں متواتر زر کثیر شریف مکہ اور مکہ[171] مدینہ کے لوگوں کی امداد کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ محمد وارث لکھتا ہے کہ تخت نشینی کے وقت سے لے کر 1651ء تک شاہجہاں نے مکہ کے لیے تخمیناً دس لاکھ روپیہ روانہ کیے[172]۔ روپیہ بھیجے جانے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ جب کوئی سر برآوردہ افسر حج کے لیے یہاں سے جاتا تو اس کے ساتھ ایسے تجارتی مال بھیجے جاتے جن کا منافع مکہ میں سو فیصدی ہوتا۔ یہ منافع معہ اصل کے شریف اور مکہ و مدینہ کے غرباء و مساکین میں تقسیم ہو جاتا۔

مغربی تاجر: پرتگالی

اس عہد میں پرتگالیوں کی طاقت کا ہندوستان میں تیزی سے زوال ہوا۔ ڈچ اور انگریزوں کے اقتدار کو عروج ہوا۔ عہد اکبر کی ایک قلیل مدت کے سوا مغلیہ حکومت سے پرتگالیوں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ بہ جبر مراعات حاصل کرتے رہے، کبھی کاروباری جہاز گرفتار کر لیا کبھی حاجیوں کے جہاز روک لیے۔ کسی ہندوستانی کشتی کی مجال نہ تھی کہ وہ بغیر پرتگالی پروانہ راہداری حاصل کیے کھلے سمندر میں رواں ہو سکے۔ یہ پروانۂ راہداری کے لیے ڈیمن اور ڈپو کے افسران بھاری رقم وصول[173] کر لیتے۔ اس لیے مغل بادشاہوں کی نظر میں ان کی حیثیت بدکار سے زیادہ نہ تھی اور بہ جبر اس لیے برداشت کرنا پڑتا تھا کہ چھٹکارا کی کوئی صورت نہ تھی۔

1630ء میں ان کے گوا کے گورنر کونڈے ڈی لن ہیرس نے اپنا نمائندہ سورت بھیجا۔ کہلایا کہ پرتگالی سورت میں آبادکاری کے لیے تیار ہیں۔ جتنی تجارت انگریز اور ڈچ مہیا کرتے ہیں وہ اہل پرتگال کر دیں گے بشرطیکہ ان دونوں

(a) Canda de linhares. (مترجم)

(b) Rastall. (ایضاً)

کو نکال باہر کیا جائے۔ لیکن اس وقت سورت میں پر تاگلیوں کی مخالفت شباب پر تھی۔ کیونکہ انہوں نے ایک ہندوستانی جہاز حال ہی میں پکڑ لیا تھا۔ سورت حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اس لیے کہ انہوں نے دوسرا ہندوستانی جہاز "میوسائی" گرفتار کر لیا تھا۔ اور تیسرے جہاز 'شاہی' پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ لیکن سورت کے سوداگروں نے انگریزوں کو ملا لیا۔ انگلستان سے راسٹیل بحری بیڑا لے کر آرہا تھا اس نے ہندوستانی جہاز کو پرتگالیوں کی دست برد سے بچا لیا[174]۔

اس اثناء میں شاہجہاں پرتگالیوں سے بیزار گیا ہنوز اس کا قیام دکن میں تھا۔ اس نے عادل شاہ جہاں کو آمادہ کیا کہ گوا کا راستہ بند کر دے۔ اس تدبیر اور لنکا میں خسارہ اٹھانے کے خمیازہ سے پرتاگلیوں کے حواس درست ہوئے۔ انہوں نے سورت کے حکام سے مصالحت کر لی۔ میوسائی جہاز واپس کر دیا، انگریزوں اور اہل ڈنمارک کے اخراج کے مطالبات بھی ہٹا لیے۔ اس کے عوض میں تسلیم کر لیا گیا کہ وہ سمندری سفر کے لیے پروانے جاری کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہوا کہ ان کی ضبط شدہ اراضی جائداد بحال کر دی گئی۔

اب پرتگالیوں کو صرف یہ خوف رہا کہ ایسا نہ ہو کہ شاہجہاں بیجاپور کو زیر کر کے گوا[175] میں ان کی محافظت ختم کر دے۔ اس لیے جب شاہجہاں نے 1635ء میں دکن پر حملہ کیا تو شاہ اسپین نے اپنے گوا کے افسروں کو حکم دیا کہ بیجاپور اور احمد نگر دونوں کی مدد کریں۔ 1638ء میں مغل حکام سے کھلم کھلا ایک جھڑپ اس وقت ہوئی جب آخرالذکر نے ڈیمن[176] اور ڈیو کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن صدر، فرم لن، سورت[177] کے انگریزی کارخانے کے سربراہ نے صلح کرا دی۔

ڈچ

(a) President fremlin. (مترجم) (b) fater van den (مترجم)
(c) jater picter gillesz. (ایضاً) (d) Batavla (ایضاً)
(e) Jan Tack (ایضاً)

بحری اور تجارتی برتری دونوں میں پرتگالیوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اہل ڈنمارک نے لے لی۔ ان کا پہلا کارخانہ سورت میں پاٹر ڈان ڈین برویک کے ہاتھوں قائم ہوا۔ اور دو سال بعد جیٹر پائٹر گیلس وان ڈیوسٹن نے اطمینان بخش تجارتی مراعات شہزادہ شاہجہاں سے حاصل کر لیں جو اس زمانے میں گجرات[178] کا ناظم تھا۔ یہ لوگ جہانگیر کے آخر عہد حکومت تک امن چین سے تجارت کرتے رہے۔ چنانچہ شاہجہاں جب جنار سے آگرہ تاج پوشی کے لیے جا رہا تھا تو ڈچ کے لوگوں نے اسے تحائف پیش کیے اور اس نے بھی ان کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کیا[179]۔ لیکن مارچ 1628ء میں ان کے گماشتوں کو اس لیے گرفتار کر لیا گیا کہ وہ بغیر شہنشاہ کی اجازت کے شورہ خرید رہے تھے مگر مختصر سی معاملہ فہم رشوت دے کر رہا کرا لیے گئے۔

اب تک اہل ڈنمارک اور انگریزوں کے تعلقات خوش گوار چلے آ رہے تھے لیکن 1635ء میں کشیدگی پیدا ہوئی اس لیے کہ انگریزوں نے پرتگالیوں سے صلح کر لی[180]۔ ڈچ کارخانہ کے سربراہ پائٹرس زون نے سورت کے ناظم کو ترغیب دی کہ وہ بادشاہ کے پاس انگریزوں کے خلاف کارروائی کرے۔ اس کے جواب میں اہل ڈنمارک کو مراعات کی امید دلائی گئی بشرطیکہ وہ پرتگالیوں کو ڈیمن اور دیو سے نکال باہر کریں اور اس پر رضامند ہو جائیں کہ صورت کی جملہ بحری تجارت جو سردست انگریزوں اور پرتگالیوں کے حصہ میں ہیں اس پر قبضہ کر لیں۔ پائٹرس زون شرائط منظور کرنے پر تیار تھا۔ لیکن اس کے افسران بالا جو بٹاویا میں تھے، راضی نہ ہوئے۔ ان کو ان شرائط کے منظور کرنے سے باز رکھا۔ بالآخر اس گفت و شنید میں مغلیہ حکام سے یہ طے ہوا کہ ڈچ کونسل کی آزاد تجارت کا اختیار دیا جاتا ہے اور اس مراعات خصوصی کے عوض وہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ داخل خزانہ کریں گے۔ یہ بھی طے ہوا کہ وہ لوگ نہ جنگی جہاز بنائیں گے نہ بجز سوالی کے کسی اور بندرگاہ پر اپنی کشتیاں ٹھہرائیں گے۔

ان خوشگوار حالات میں اہل ڈنمارک کی تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ انہوں نے انگریزوں اور پرتگالیوں کو بہت پیچھے کر دیا۔ 1642ء میں ان کا ایک وفد شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے اور بھی زیادہ کار آمد مراعات[181] حاصل کیں۔ لیکن آگے چل کر چھ سال میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ جن سے اہل ڈنمارک اور مغل حکام دونوں ایک دوسرے سے بددل ہوگئے۔ اہل ڈنمارک نے ٹین کی تجارت کو اجارہ داری کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کی۔ اس اقدام پر گجرات کے سوداگر برہم ہوئے انہوں نے بادشاہ سے شکایت[182] کی۔ دوسری طرف شائستہ خان نے استحصال بالجبر سے ڈنمارک والوں کو کافی نقصانات پہنچائے اور صوبہ جاتی افسروں نے بنگال میں بھی ان کو پریشان کیا۔ جان ٹاک[a] کو 1648ء میں ڈنمارک والوں نے دادرسی کے لیے شہنشاہ کے پاس بھیجا۔ شائستہ خان کو تنبیہ کی گئی اور سورت کے افسروں کو حکم ملا کہ ڈچ سوداگروں کی جائیداد واپس کر دیں۔ لیکن بنگال میں تجارتی مراعات حاصل کرنے کی جان ٹاک کی درخواست نامنظور ہوئی۔

اس اثناء میں بٹاویا کے پرتگالی حکام نے سورت میں مغل ظلم و ستم کی روداد سن کر ایک بحری بیڑا انگریزوں اور مغلوں سے انتقام لینے کے لیے روانہ کیا۔ اس بیڑا کے سپہ سالار نے شاہجہاں کا ایک جہاز گرفتار کر لیا۔ مطالبہ کیا کہ اس کے ہم وطنوں کے نقصانات کی پوری تلافی کی جائے۔ سورت کے حکام نے ڈچ لوگوں کے نقصانات کا پورا بدل دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ یہ بھی وعدہ کیا آچن میں آزاد تجارت سے وہ دست بردار ہو جائیں گے۔ سامان رکھنے کے لیے ایک خاص گودام گھر بنانے کی اجازت دی جائے گی اور شہنشاہ سے درخواست کی جائے گی کہ اڑیسہ اور بنگال میں ان لوگوں کے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

جان ٹاک دوسری بار دہلی گیا۔ شاہجہاں نے اس کا خیر مقدم پہلی بار سے

(a) Jan Tack. (مترجم)

زیادہ اعزاز کے ساتھ کیا۔ دوسرے سال ڈچ کے لوگوں کو ٹھٹھ[183] میں تجارت کی اجازت حاصل ہوئی۔ لیکن ان کی بعض شکایتیں ہنوز باقی تھیں۔ مثلاً ان کے نمائندوں کے ساتھ بنگال میں جو سلوک ہوا تھا، اس کا کوئی معاوضہ نہ ملا تھا۔ اس لیے تیسرا وفد جان ٹاک اور جان ہاورٹ کی قیادت میں بھیجا گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ شہنشاہ دہلی میں نہیں اس لیے واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔

شاہجہاں کی واپسی پر ڈچ کے قاصدوں نے کچھ خاص درباریوں کو اپنا ہمدرد بنا لیا۔ ان ہمدردوں میں جہاں آرا کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس کی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ سورت اس کی ملکیت تھا۔ 31/دسمبر 1652ء کو یہ قاصد حضور شاہ پیش ہوا۔ چنگی سے مستثنیٰ کیے جانے کی درخواست نامنظور ہو گئی لیکن اس کی اجازت دی گئی کہ 55 ہزار روپیہ بالمقطع ادا کر سکتے ہیں۔ نیز ان کی یہ درخواست بھی رد ہوئی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ کرایہ کے سامان پر محصول نہ لگائے جائیں اور ڈچ کے وہ پناہ گزیں جو مسلمان کر لیے گئے تھے ان کو واپس کر دیا جائے۔ لیکن ان کی موافقت میں ایک فرمان جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا کہ بنگال میں راستوں کی چنگی سے ان کو مستثنیٰ کیا گیا۔ یہ بھی اجازت مل گئی کہ وہ اپنی کشتیوں کی مرمت سورت میں کر سکتے ہیں اور سوالی میں ایک گودام گھر بنا سکتے ہیں۔ اس کے عوض میں ڈچ لوگ ہندوستانی کشتیوں کو آزادی سے آچین اور ڈچ کے دوسرے مقبوضات تک آنے جانے کا راستہ بغیر روک ٹوک کے دینے پر راضی ہو گئے۔

چونکہ دہلی میں قیام مہنگا تھا اس لیے ٹاک اور برگ ہاوٹ آگرہ واپس آئے۔ جب انہوں نے موعودہ فرمان دیکھا تو یہ محسوس ہوا کہ یہ اطمینان بخش نہیں۔ برک ہاوٹ پھر دہلی واپس آ گیا چونکہ وہ کوئی تحفہ نہ لایا تھا اس لیے اس کو حضور میں نہ پیش کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈچ اور مغلوں کے تعلقات اس بنا پر شاہجہاں کے دور حکومت تک ناخوشگوار رہے۔ بنگال میں جان ورپورٹن نے کوشش کی کہ شہزادہ شجاع سے کچھ تجارتی مراعات حاصل کرے لیکن چونکہ معاملات حضور

شاہ در پیش تھے اس لیے اس نے دخل اندازی مناسب نہ سمجھی۔ 1656ء میں چوتھی بار جان ٹاک آگرہ سے دہلی گیا۔ گمان غالب ہے کہ اس کے جانے کا مدعا اپنے نمایاں نقصانات کو تلافی سے وابستہ تھا[186]۔

تجارتی اور بحری برتری کے سلسلہ میں انگریز اہل ڈنمارک کے زبردست حریف تھے۔ وہ ہندوستان پہلے ہی آگئے تھے۔ آہستہ روی مگر مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی تجارت کو ترقی دے رہے تھے۔ جہانگیر کے عہد حکومت کے اختتام تک ان کے فلاح و بہبود کے مسائل بنکھم اور کلیمنٹس پیش کرتے رہے۔ آخر الذکر آگرہ کے کارخانے میں نمبر 2 کا افسر تھا۔ دسمبر 1627ء میں شاہجہاں گجرات آیا، یہاں سے آگرہ جاتے ہوئے سورت کے کارخانے کا صدر کیرج اسے بروچ میں تحفے پیش[185] کرنے گیا۔ نئے شہنشاہ کو خراج عقیدت بنکھم اور کلیمنٹس نے آگرہ میں پیش کیا۔ مارچ 1638ء میں ان لوگوں کو بھی اسی جرم پر قید کیا گیا جس کی سزا ڈچ لوگ بھگت چکے تھے۔ لیکن جلد ہی خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کے ایک سال بعد انگریزوں کو سندھ میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔ 1630ء میں رسٹیل نے ایک مغلیہ جہاز پرتگالیوں کے ہاتھ سے بچایا[186]۔

1630-31 کے قحط نے انگریزوں کو شدید نقصانات پہنچائے۔ یہاں تک کہ بجز سورت کے کارخانہ کے ان کو اپنے جملہ دکنی کارخانے بند کرنے پڑے۔ اس حادثہ نے جوان کو مالی نقصانات پہنچائے تھے۔ اس سرد بازاری میں ہندوستانی سوداگروں کی یہ کوشش کہ نیل کی تجارت کی اجارہ داری ان کو مل جائے، انگریزوں کے لیے اور بھی زیادہ مضر ثابت ہوئی۔ سورت میں نئے ناظم کی مخالفت نے ان کے حالات بد سے بدتر کر دیئے[187]۔ انگریزی کارخانہ کے صدر متھ اولڈ نے 1635ء میں پرتگالیوں سے مصالحت کرلی۔ اس نے اپنا مرکز تجارت کمبے[188] منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے اس ارادہ نے ہندوستانی سوداگروں کو ہوشیار کر دیا۔ انہوں نے شہنشاہ سے شکایت کی شاہجہاں نے نیل کی تجارت سے

بندش ہٹادی لیکن یہ بھی حکم دیا کہ جو جہاز سورت آئیں وہ بجز سوالی کے کہیں اور نہ لنگر انداز ہوں۔ او یہ بھی منع کر دیا کہ یہ لوگ جنگی جہاز ہندوستان میں نہ بنائیں۔ اہل ڈنمارک کی طرح انگریزوں کو بھی حکم دیا گیا کہ ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ داخل خزانہ کریں۔ لیکن متھ اولڈ ان شرائط کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

اس درمیان میں خبر آئی کہ انگریز بحری ڈاکوؤں نے سورت کے جہاز توفیق اور ڈیو کے محمدی، جہاز کو گرفتار کر لیا ہے[189]۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ متھ اولڈ سورت میں اور رابنس، احمد آباد میں قید کر دیے گئے۔ آگرہ اور ٹھٹھ میں انگریزی مال و اسباب قرق ہو گیا۔ لیکن متھ اولڈ 8 ہفتہ بعد رہا کر دیا گیا۔ مئی 1636ء میں اس نے جان ڈریک کو تلافی کے لیے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ ٹھٹھ اور دوسرے مقامات پر جو سامان قرق کیا گیا تھا وہ بحال کر دیا گیا لیکن سورت کے ناظم کو کوئی سزا نہ دی گئی۔ بلکہ زخم پر نمک چھڑکا گیا۔ انگریزوں کو اسلحہ رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ مصالحت آسودگی سے کوسوں دور تھی۔ اس لیے 1637ء میں ہارن فورٹ سورت[190] سے آگرہ بھیجا گیا۔ وہ ڈیڑھ سال تک وہاں ٹھہرا رہا۔ اس مدت میں اس نے بادشاہ کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ توفیق اور محمدی کے سلسلہ میں اس کے ہم وطن بے قصور ہیں۔ اس کو اطمینان دلایا گیا کہ آئندہ ایسے حالات میں ان کے مطالبات کی حفاظت کی جائے گی، ساتھ ہی ساتھ بنگال میں انگریزوں کی تجارت کی توسیع کے لیے ایک فرمان بھی جاری کر دیا گیا۔

1643ء[191] جو حسب خواہش مراعات ڈچ کو ملی تھیں اسی نوعیت کی مراعات حاصل کرنے کے لالچ میں انگریزوں نے بھی بیش قیمت تحائف شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ ان کی امید پوری ہوئی۔ شہنشاہ نے ایک فرمان کے ذریعہ ان کے سارے مطالبات پورے کر دیئے۔ لیکن بعد کے سات برسوں میں مختلف خلفشار رونما ہوتے رہے۔ چنانچہ جولائی 1650ء میں رچرڈ ڈے وچ، اس لیے دہلی بھیجا گیا کہ شہنشاہ[192] کی خدمت میں اپنی شکایتیں پیش کرے۔ چونکہ نذر

گزارنے کے لیے وہ تحائف سے لیس تھا اس لیے شاہجہاں آسانی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک فرمان عطا کیا گیا جس کے رو سے انگریزوں کو راستے استعمال کرنے کے محصول سے آزادی دے دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ سورت اور سندھ کے حکام کو ہدایت کی گئی کہ انگریز تاجروں کو پریشان نہ کیا جائے۔ اس کے بعد سے انگریزوں کی تجارت بڑی تیزی سے بڑھتی گئی یہاں تک کہ شاہجہاں کی حکومت کے اختتام تک ان کے کارخانوں کا حال بنائے اطمینان ہو گیا۔

باب 12

آخری منزل

یہ صحیح کہا گیا ہے کہ چغتائی خاندان کے حکمرانوں کی زندگی زیادہ تر خیموں میں بسر ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خیمہ و خرگاہ کی یہ زندگی جس میں ہمیشہ مقام کی تبدیلی ہوتی رہتی تھی صرف تعیش کے لیے نہ تھی بلکہ اس کے علاوہ اور بھی ایسے متحرک عوامل تھے جو خیمہ کو گھر بنانے پر مجبور تھے۔ اس کا سب سے پہلا سبب نظام حکومت کی نوعیت تھی جسے فوجی آمریت بتایا گیا ہے۔ اس قسم کے نظام میں حکمراں کی ذات حکومت کی پوری مشین کی قوتِ تحریک کا محرک ہوتی ہے۔ اس کو رواں دواں رکھنے کے لیے اس کی موجودگی از بسکہ ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا وہ میدان عمل سے قریب رہے گا اتنی ہی مستعدی و بیداری اس کے افسران میں کار فرما ہوں گی۔ دوسرا سببِ حکمرانوں کے تسخیر مملکت کا جذبہ تھا۔ بجز بد قسمت ہمایوں کے بابر سے اورنگ زیب تک ہر بادشاہ توسیع سلطنت کی اس نا آسودہ تشنگی کا شکار تھا۔ تیسرا سبب اگر عوام سے قریب تر ہونے کا احساس نہ رہا ہو تو بھی صوبائی حکومتوں سے ذاتی قرب حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ ملک بھر میں گشت کرنے کے رویہ نے حکمرانوں سے ناظموں

کی وفاداری کا سامان فراہم کیا اور بعض اوقات اسی میں انتظامیہ کی بداعمالی کی نشو و نما کی بھی روک تھام کی...... بادشاہوں کو مروجہ بدکاری سے واقفیت بخشی۔ جن کا دور کرنا چغتائی حکمرانوں کی دائمی خصوصیت میں داخل تھا، اسی لیے مغلیہ خاندان کے اوّل چھ حکمرانوں کی زندگی سخت محنت و مشقت کی زندگی تھی۔

شاہجہاں کا آگرہ میں غیر حاضر ہونا

اپنی بتیس سال کی حکومت میں تخمیناً نصف مدت تک شاہجہاں دارالسلطنت سے باہر رہا۔ اس موقع پر اس کے نجی معاملات کا ایک مختصر بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اپنی تخت نشینی کے سال بھر کے اندر ہی آگرہ چھوڑ کر اسے گوالیار جانا پڑا۔ تاکہ وہ جھجار سنگھ کی سرکوبی کر سکے۔ لیکن آخر الذکر نے اطاعت قبول کر لی اور شہنشاہ ایک ماہ سے کچھ زیادہ مدت کی غیر[2] حاضری کے بعد دارالسلطنت واپس آگیا۔ اسی سال کے ماہ دسمبر میں اس کو پھر آگرہ چھوڑنا پڑا۔ اس لیے کہ خان جہان لودی کو دکن بھاگ جانے پر سزا دینی تھی۔ شاہجہاں رانتھمبور کے راستہ سے چاندا اور مالوہ ہوتا ہوا، یکم: مارچ 1630ء کو برہان[3] پور پہنچا، یہاں دو سال تک قیام رہا۔

حسن آرا کی ولادت

برہان پور میں شہنشاہ کی دختر[4] حسن آرا بیگم کی ولادت ہوئی۔ اس وقت شاہجہاں کی زندگی خوش حالی میں گزر رہی تھی۔ نظام شاہی قلعہ جات یکے بعد دیگرے قبضہ میں آرہے تھے۔ خان جہاں کا تعاقب سرگرمی سے جابجا کیا جارہا تھا۔ بالآخر وہ سندھ میں گرفتار ہوا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کامیابی کا دربار میں جشن عام منایا گیا۔ دعوتیں ہوئیں، افسروں کے درجات میں اضافہ کیا گیا۔ لیکن ایک فوری حادثہ نے نہ صرف شاہجہاں کی مسرت کم کر دی بلکہ ایک ایسا غم بن گیا جو عمر بھر اس کو یاد آتا رہا۔

ممتاز کی موت

بروز چہار شنبہ بتاریخ 7/ جون 1631ء کو ممتاز محل کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ وضع حمل کی تکلیف برداشت نہ کر سکی۔ نڈھال ہونے لگی۔ جہاں آرا

بیگم سے کہا کہ میرے بستر مرگ کے قریب شہنشاہ کو بلا دیا جائے۔ شہنشاہ قریب ہی کے دوسرے کمرے میں تھا۔ جلدی سے اس کمرہ میں آیا جہاں اس کی ملکہ تھی۔ ممتاز محل نے آنکھیں کھولیں بچوں کو شوہر کے حوالے کیا اور الوداع کہتے ہوئے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ یہ سارا حادثہ اتنے کم وقفہ میں ہوا کہ شاہجہاں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔[5]

شاہجہاں کا غم

سارے دربار پر غم و اندوہ کی فضا طاری ہو گئی۔ افسروں نے سفید ماتمی لباس پہنے، ایک ہفتہ تک شاہجہاں جھروکہ نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب زندگی سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ شدت احساس سے اس کے بال سفید ہو گئے۔ دو سال تک وہ محفل رقص و سرور وغیرہ سے بیگانہ رہا۔ لباس فاخرہ کے استعمال سے بھی اس نے گریز کیا۔ عید اور دوسرے ایسے مواقع پر دہ زار و قطار اشک بار ہوتا۔ اپنی جملہ بیویوں میں سب سے زیادہ عزیز بیوی کا ماتم کرتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے بار بار کہا کہ اگر یہ مقدس فرض جو مجھ پر عائد کیا گیا ہے اگر خداوند کریم کا عطیہ نہ ہوتا تو سلطنت اپنے لڑکوں میں تقسیم کر کے میں دنیا سے دست بردار ہو جاتا۔[6]

ممتاز کی لاش آگرہ لائی گئی

کچھ دونوں کے لیے ممتاز محل کی لاش دریائے تاپتی کے اس پار زین آباد باغ میں سپرد خاک کر دی گئی۔ شہزادہ شجاع، وزیر خان اور ستنی النساء ملکہ کی دایہ خاص کی زیر نگرانی لاش ابتداء دسمبر 1631ء میں آگرہ لائی گئی۔ یہاں جمنا کے کنارے اس زمین پر دفن کی گئی جو کبھی راجہ مان سنگھ کی ملکیت تھی۔ اس کے پوتے جے[7] سنگھ سے شاہجہاں نے برائے نام قیمت دے کر خریدلی۔ 17 سال کے اندر یہاں اس کی قبر پر ایک ایسا شاندار مقبرہ بنایا گیا جو ایک وفادار شوہر کی وفادار بیوی سے محبت کی دائمی یادگار ہے۔

شاہجہاں آگرہ واپس آتا ہے

6/مارچ 1632ء کو دربار برہان پور روانہ ہو کر اسی سال کے جون[8] میں آگرہ واپس آگیا اور شاہجہاں دو سال تک دارالسلطنت میں قیام پذیر رہا۔ واپسی کے پندرہ دن بعد شہنشاہ نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ[9] مراد کی رسم مکتب رسمی انداز میں ادا کی۔ ملا مراق اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔ لیکن اس موقع پر کوئی دعوت نہیں ہوئی اس لیے کہ شہنشاہ کا زخم دل ہنوز تازہ تھا۔

دارا کی شادی

تولے جانے کی اکتالیسویں شمسی رسم ادا کرنے کے بعد شاہجہاں نے اپنی اولاد اکبر، دارا شکوہ[10] کی شادی رچانے کی تیاری کا حکم دیا۔ ممتاز محل کی زندگی ہی میں شہزادہ پرویز کی لڑکی سے اس کی نسبت طے ہو چکی تھی۔ جب دربار دکن میں تھا۔ اسی وقت شادی کے سلسلہ میں احکام جاری ہو گئے تھے کہ گجرات، بنرس، ست گاؤں، مالدہ، سونار گاؤں اور پٹن وغیرہ سے کمیاب و قیمتی اشیاء فراہم کی جائیں، آگرہ اور لاہور کے جن افسروں کے سپرد شاہی امور خانہ داری تھے ان کو ہدایت کی جا چکی تھی کہ جواہرات، نقری و طلائی اسباب اور اس قسم کی دیگر چیزیں جن کی شادی میں ضرورت پڑنے والی ہو سب مہیا کریں۔ لیکن ملکہ کی اچانک موت نے اس تیاری کو کم کر دیا تھا۔ اب پھر جنوری 1633ء میں جشن شادی کی سرگرمی شروع ہوئی۔

شادی کے تحائف کی ایک نمائش 25/جنوری کو دربار عام میں ہوئی۔ اس کی نگرانی جہاں آرا بیگم اور ساتی النساء خانم کے سپرد کی گئی۔ سہ پہر کو شہنشاہ و مستورات حرم، نمائش دیکھنے گئے اور شام کو شاہی افسروں کو اجازت ملی۔ سمدھن نے بھی اسی طرح اسی ایوان میں اپنے تحائف آراستہ کیے اور شاہجہاں ان کو دیکھنے گیا۔ یکم فروری کو رسم حنابندی ادا کی گئی اور شاہی سرود خانہ جواب تک خاموش تھا

پھر نغمہ سنج ہوا، گویا اعلان ہوا کہ سوگ کا زمانہ ختم ہو گیا۔ پان، الائچی، خشک میوہ جات حاضرین دربار میں تقسیم ہوئے اور شام کو آتش بازی کے ایک دل کش مظاہرہ نے، جمنا کے کنارے اہل آگرہ کو سامان فرحت و نشاط فراہم کیا۔ دوسرے دن شہزادے شجاع، اورنگ زیب، مراد، معہ آصف خان و دیگر ممتاز امراء کیساتھ دارا کے مکان پر مبارک باد و تحائف شادی پیش کرنے گئے۔ بعد ازاں ایک شاندار جلوس بنایا گیا۔ دارا ہاتھی پر سوار ہوا۔ درباری چمکدار پوشاک زیب تن کر کے پیچھے روانہ ہوئے، بعض گھوڑے پر تھے اور بعض پیدل۔ اس طرح نوشاہ دیوان عام تک پہنچایا گیا۔ یہاں شاہجہاں نے اپنے تحائف سے سر فراز کیا۔ ہندوستانی رسم کے لحاظ سے، موتیوں، زمرد اور لال کا سہرا سر پر باندھنے کی وہ رسم ادا کی گئی جو جہانگیر نے شاہجہاں کی شادی میں ادا کی تھی۔ شام کو ساحل جمنا پر شاندار چراغاں اور آتش بازی کے مظاہرے دعوت چشم و گوش کا سامان ثابت ہوئے۔

رقص و سرود و دیگر تفریحات کا سلسلہ رات کے 2 بجے 2 گھڑی تک چلتا رہا۔ یہ ساعت عقد کے لیے نیک تھی۔ وقت مقررہ پر شاہجہاں نے قاضی محمد اسلم کو شاہ برج میں طلب کیا۔ اس نے حضور شاہ نکاح پڑھایا۔ پانچ لاکھ روپیہ مہر مقرر ہوا۔ عروس و نوشاہ پر سونے چاندی کے سکے نچھاور کیے گئے، لوٹنے کے لیے حاشیہ بردار اس طرح ٹوٹ پڑے کہ بعض بعض لوگ ٹکرا کے سر کے بل گر پڑے۔ دارا اور اس کی بیوی کی شادمانی کی دعاؤں سے فضا گونج اٹھی۔ شعرا نے قطعۂ تاریخ سنائے۔ یہ سلسلۂ جشن و نشاط اس وقت ختم ہوا جب شہنشاہ دارا کے گھر گیا۔ اس تقریب میں تیس لاکھ روپئے خرج ہوئے۔ جس میں سے چھ لاکھ شاہی خزانے کا عطیہ تھا۔ 16 لاکھ جہاں آرا بیگم اور بقیہ عروس کی ماں نے خرچ کیے۔

شجاع کی شادی

اس شادی کے فوراً بعد ہی شجاع کی بھی شادی اسی شان و شوکت سے رچائی گئی جس طرح اس کے بڑے بھائی دارا کی ہوئی تھی۔ اس کی شادی مرزا رستم

صفوی کی لڑکی سے 23/ فروری کو ہوئی۔ چار لاکھ دین مہر مقرر ہوا۔

اورنگ زیب کا ہاتھی سے لڑنا

درباری کی زندگی معمول پر آگئی۔ اگرچہ شاہجہاں کا زخم سوگ ابھی تک کافی تکلیف دہ تھا۔ لیکن غم غلط کرنے کے لیے اس نے زندگی کی دوسری دلچسپیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ رقص، و سرود، کھیل کود، اور اسی طرح کی دوسری تفریحات کی تجدید ہوئی۔ شہنشاہ نے ہر ایک میں دلچسپی سے حصہ لیا۔ 28/ مئی 1633ء کو اس نے دو ہاتھی لڑنے کے لیے جھروکہ درشن کے سامنے چھڑوائے۔ ایک ہاتھی کا نام سدھاکر اور دوسرے کا نام صورت سندر تھا۔ تھوڑی دیر دونوں گتھم گتھا ہو کر لڑتے رہے پھر الگ ہو گئے۔ جوش غیض و غضب میں سدھاکر بے راہ ہو کر بجائے اپنے مقابل پر حملہ کرنے کے اورنگ زیب کی طرف بڑھا اس پر حملہ کر دیا۔ اورنگ زیب اس وقت مشکل سے 14 سال کا تھا۔ مستقل مزاجی سے کھڑا رہا اپنے گھوڑے کو قابو رکھا۔ ہاتھی کے سر پر نیزہ مارا۔ ہاتھی واپس ہوا، پھر حملہ کیا اورنگ زیب کے گھوڑے کو گرا دیا۔ لیکن شہزادہ کود کر زمیں پر کھڑا ہو گیا۔ تلوار کھینچ لی۔ غضبناک جانور کا مقابلہ کیا۔ دم کے دم میں شہزادہ شجاع اور راجہ جے سنگھ امداد کے لیے موقع پر پہنچ گئے۔ ہاتھی پر حملہ آور ہوئے۔ نیزوں کی بوچھار اور آتش بازی کے درمیان "صورت سندر" بھی دوبارہ مقابلہ کے لیے آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوفزدہ ہو کر سدھاکر بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہجہاں نے گرم جوشی کے ساتھ شہزادہ کو گلے لگا لیا۔ دادِ شجاعت دی اور بہادر کے خطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ تین دن بعد اورنگ زیب کی پندرہویں سال گرہ کے موقع پر شہنشاہ نے اسے سونے میں تولایا۔ پانچ ہزار مہر اور ساتھ ہی ساتھ سدھاکر[12] ہاتھی بھی انعام میں دیئے۔

اسی سال اگست میں شاہجہاں علیل ہوا لیکن تین دن کے بعد اچھا ہو گیا[13]۔

دوسرے سال جنوری میں آگرہ سے کشمیر جنت ہندوستان[14] کی سیر کو روانہ ہوا۔

راستہ میں شہزادہ دارا سخت بیمار ہو گیا۔ خاندانی طبیب وزیر خان کو دار السلطنت سے علاج کے لیے طلب کیا گیا[15]۔ لاہور میں مختصر قیام کے بعد شہنشاہ نے سفر کشمیر پھر شروع کیا۔ منزل مقصود پر وہ 5/ جون 1634ء کو پہنچا[16]۔ اس صوبہ کے حسن دلفریب نے شاجہاں کو مسحور کر لیا۔ اگرچہ اس کے پاس مصوروں کا کوئی عملہ نہ تھا کہ اس حسن خداداد کا مرقع تیار کرے لیکن اس کے دربار میں زبردست اہل قلم موجود تھے انہوں نے کشمیر کی منظر کشی مصورانہ زبان میں پیش کی۔ اگرچہ بلحاظ سیرت انداز بیان شاعرانہ ہے مگر صورت کے اعتبار سے نثر ہے[17]۔

اس نے اوائل ستمبر[18] میں کشمیر کو خیر باد کہا۔ نومبر 16/ کو لاہور[19] پہنچا۔ یہاں دو مہینے تک قیام پذیر رہا۔ وہ دار السلطنت[20] کے لیے روانہ ہوا۔ شہزادہ مراد کے چیچک نکل آئی تھی اس لیے وزیر خان اور ساتی النساء[21] خانم کی نگرانی میں اس کو چھوڑ کر 16/ جنوری 1635ء کو دار السلطنت کے لیے چل پڑا۔ دہلی میں تھوڑے دن تک رک کر 12/ مارچ 1635ء کو آگرہ[22] پہنچا۔

دکن کا سفر دوبارہ

آگرہ سے شہنشاہ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر جھجار سنگھ نے جاہ طلبی کا ارادہ کیا۔ دکن کی غیر اطمینانی صورت حال اور اس کی بغاوت سے مجبور ہو کر شاجہاں کو ستمبر کے اواخر میں آگرہ چھوڑنا پڑا۔ باری پہنچ کر اس نے راہ بدل دی اور بندیل کھنڈ چلا گیا[24]۔ جنوری 1636ء کے اوائل میں اس نے نربدا[25] پار کیا اور سیدھے دولت آباد کی طرف کوچ کر گیا۔ چھ ماہ کی شدید مشقت کے بعد صوبہ احمد نگر میں امن قائم کرنے اور بیجاپور و گولکنڈہ سے خاطر خواہ صلح کرنے میں وہ کامیاب ہوا۔ جولائی[27] کے اوائل میں دکن سے روانہ ہوا۔ اجین اور مانڈو ہوتے ہوئے 25/ نومبر کو اجمیر[28] پہنچا۔ یہاں ایک ہفتہ قیام رہا اس کے بعد آگرہ کا رخ کیا جہاں 5/ جنوری 1637ء کو پہنچا[29]۔

اورنگ زیب کی شادی

مارچ میں شاہجہاں بیمار ہوا۔ لیکن 29/[30] دن کے بعد اچھا ہو گیا۔ دوسرے مہینہ کے وسط میں اپنی شادی کے سلسلے میں شہزادہ اورنگ زیب دولت آباد سے آگرہ آیا۔ اس کی شادی دل آرا بیگم بنت شاہ نواز خان سے ہونے والی تھی۔ چنانچہ 8/ مئی 1637ء کو مروجہ شان و شوکت[31] کے ساتھ شادی کے رسوم ادا کیے گئے۔

کابل کی پہلی سیاحت

فروری 1638ء میں علی مردان خان نے قندھار مغل افسروں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد سے 15 سال تک شاہجہاں کی توجہ شمالی مغربی سرحد پر مرکوز رہی، پہلی بار وہ کابل[32] کے لیے اگست 1638ء میں روانہ ہوا۔ یہاں جانے میں دو مقصد پیش نظر تھے ایک تو قندھار پر ایرانیوں کے مجوزہ حملوں کی روک تھام کرنا اور دوسرے ماوراالنہر کی صورت حال سے آگہی کرنا۔ 18/ مئی 1639ء کو شہنشاہ کابل پہنچا۔ تخمیناً چار مہینے قیام کے بعد ستمبر[33] میں لاہور واپس آیا۔ یہاں سے کشمیر دربار گیا۔ اب کی بار یہاں دو سال مسلسل قیام رہا۔ اسی زمانے میں آصف خان کا انتقال[35] 11/ نومبر کو 1641ء ہوا۔ اور مراد کی شادی جولائی 1642ء میں رچائی[36] گئی، اوائل جنوری 1643ء میں دربار آگرہ[37] واپس آیا۔

جہاں آرا کا جلنا

چند دنوں کے لیے شاہجہاں اجمیر[38] ضرور گیا لیکن بقیہ دو سال تک اس کا قیام لاہور ہی میں رہا، مارچ 1644ء میں جہاں آرا کے لباس میں آگ لگ گئی اور وہ بری طرح جل گئی۔ اس حادثہ پر شاہجہاں کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس کے علاج کے لیے بہترین اطباء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کے علاوہ اس نے حکم دیا کہ ایک ہزار روپیہ روزانہ بطور خیرات غرباء و مساکین میں تقسیم کیا جائے۔ شہزادی چار ماہ تک بستر علالت پر رہی اس پوری مدت میں اس کی صحت یابی کی دعا مانگنے کا

سلسلہ جاری رہا۔ شہزادگان اورنگ زیب اور مراد اپنے صوبہ جات سے بیمار بہن کی عیادت کو آئے۔ شفاء کلی حاصل ہونے پر 25/ نومبر کو ایک شاندار گراں قدر دعوت دی گئی۔ شہزادہ اورنگ زیب سے شاہجہاں ناراض تھا اس جشن کے اختتام پر اپنی بہن کی سفارش پر اورنگ زیب اپنے پہلے عہدہ اور[39] سے سرفراز ہوا۔

اسی زمانہ میں ایک دوسرا حادثہ میر بخشی صلابت[40] خان کا قتل کیا جاتا ہے۔ اس کا قاتل راؤ امر سنگھ ولد راجہ گج سنگھ تھا، امر سنگھ علالت کی وجہ سے کچھ عرصہ تک دربار سے غیر حاضر تھا۔ 26/ جولائی 1644ء کو وہ واپس آیا۔ صلابت خان اس کو دارا کے مکان پر لے گیا تا کہ شہنشاہ کے حضور میں اسے پیش کرے۔ جہاں آرا کی علالت کے سلسلے میں شاہجہاں کا اس وقت قیام دارا کے یہاں تھا۔ امر سنگھ بائیں جانب کھڑا ہوا۔ شاہجہاں، بعد نماز مغرب کسی افسر کو حکم لکھنے میں مشغول تھا۔ صلابت خان تخت کے داہنے طرف کی جگہ چھوڑ کر نیچے آ گیا۔ کسی افسر سے باتیں کرنے لگا۔ یک بیک امر سنگھ خنجر نکال کر اس کی طرف دوڑا، صلابت خان کے بائیں جانب خنجر قبضہ تک اتار دیا۔ صلابت خان گرا اور اسی مقام پر مر گیا۔ اس ناجوان مردانہ اور بغیر اشتعال کے حملہ کو دیکھ کر خلیل اللہ خان اور ارجن ولد وٹھل داس نے امر سنگھ کو گھیر کر قتل کر دیا۔ امر سنگھ کے دوست اور ماننے والوں نے ارجن سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ بعد میں محل کے قریب ہی ان لوگوں نے ایک لڑائی چھیڑ دی جس میں میر خان میر توزک اور ملوک چند مشرف مارے گئے۔ آخر میں سید خان جہاں اور رشید خانی انصاری نے امر سنگھ کے جتھا کے سرداروں پر حملہ کر کے ان کو تہ تیغ کر دیا۔

شاہجہاں دیار مغرب میں

1645ء کے اوائل میں شاہجہاں آگرہ[41] سے روانہ ہوا۔ تین سال مغربی صوبہ جات میں صرف کیے۔ 1645ء کی گرمی[42] میں کشمیر کی سیر کو گیا۔ بلخ اور بدخشاں کی مہمات کی نگرانی کے سلسلہ میں دربار کابل گیا۔ بالآخر یہ محسوس ہوا کہ

ہندوکش پہاڑ کے ادھر قبضہ بحال رکھنا ناممکن ہے۔ اس لیے اس نے اپنی افواج واپس بلا لیں۔ جون 1647ء کے آخری ہفتہ میں کابل سے روانہ[42] ہوا، لاہور اور دلی[44] ہوتے ہوئے آگرہ پہنچا۔

نیا دارالسلطنت

آگرہ آتے ہوئے اس نے دلی کے افسروں کو حکم دیا کہ دلی کی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ تیزی سے مکمل کیا جائے[45]۔ دو مہینے کے اندر ہی افسروں نے دہلی محل کو رہنے ک قابل بنا دیا او شہنشاہ نے 27/ مارچ 1648ء[46] کو آگرہ چھوڑ دیا۔ شاہجہاں کے تولے جانے کی قمری تاریخ 8/ اپریل کو تھی۔ اس کے پیش نظر نئے محل کی رسم افتتاح بھی اسی دن ادا کی گئی۔ اس رسم کو دلکش و پر شوکت بنانے کی ہر امکانی کوشش کی گئی۔ سکندر لودی کے عہد حکومت سے مسلم سلطنت دارالسلطنت آگرہ بنایا گیا۔ ہر ظاہری شکل و صورت سے محسوس ہوتا تھا کہ ایک نیا عہد پیدا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دہلی کبھی کسی سلطنت کو راس نہیں آئی۔ توہم پرستوں کے نزدیک دارالسلطنت کی تبدیلی مغلیہ سلطنت کے زوال کا پہلا قدم تھا۔

قندھار کا نکل جانا

مشکل سے چھ مہینے شاہجہاں نئے دارالسلطنت میں رہا ہو گا کہ نئے خطرے نے اسے مغرب آنے پر مجبور کر دیا۔ شاہ عباس ثانی نے قندھار پر حملہ کیا اور قبضہ بھی کر لیا۔ مغلیہ عسکری اعزاز کا مطالبہ تھا کہ اسے واپس لیا جائے۔ اسی لیے نومبر 1648ء کے اوائل میں شاہجہاں کو دہلی چھوڑنا[47] پڑی۔ 18: ماہ تک باہر رہا۔ اضطراری انداز میں اس نے اپنے گمشدہ وقار کو واپس لانے کی کوشش کی۔ بہ نفس نفیس فوجوں کی رہنمائی کرتا رہا۔ لیکن کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ بالآخر اس نے کابل میں اپنا خیمہ منتقل کر لیا اور 4/ جنوری 1650ء کو اپنے دارالسلطنت[48] واپس آیا۔

جشن عظیم

اپنی مایوسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شاہجہاں نے حکم دیا کہ شاہی دارالسلطنت کے دہلی[49] میں مکمل قیام کی خوشی میں عظیم الشان جشن منایا جائے۔ 1648ء میں نئی عمارتیں تکمیل کی آخری منزل تک نہ پہنچی تھیں۔ اب سلسلہ تعمیر ختم ہو گیا تھا۔ تخت طاؤس آگرہ سے منگایا گیا تھا۔ دور دراز سے حکام اس جشن عظیم میں شرکت کے لیے طلب کر لیے گئے تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے دہلی مسرت و شادمانی کا شہر ہو گیا۔ ہر قدم پر لوگ رقص و سرور کی مسرت حاصل کر رہے تھے۔ بادشاہ زندہ باد، کی صداؤں سے آسمان گونج رہا تھا۔ ان ضیافتوں کا اختتام 10: مارچ 1659ء کو ہوا۔

کشمیر کی آخری سیر

تقریباً ایک سال بعد فروری 1651ء میں شاہجہاں اپنی آخری سیر کشمیر کے لیے روانہ ہوا۔ آنے والا موسم گرما وہیں گزارا، ستمبر کے وسط میں لاہور واپس آیا یہاں اس نے قندھار کی دوسری مہم کی تیاری کے سلسلے میں رہنمائی کی۔ 16/ فروری 1652ء کو لاہور[51] چھوڑ کر 31/ اپریل کو کابل[52] پہنچا اور 2/ دسمبر کو بڑی مایوسی کے ساتھ دہلی[53] واپس آگیا۔

شاہجہاں دہلی میں رہتا ہے

آئندہ چار سال تک برابر شاہجہاں دہلی میں قیام پذیر رہا۔ صرف دو بار مختصر وقفہ کے لیے باہر گیا۔ ایک بار آگرہ اور ایک بار اجمیر گیا۔ نومبر، دسمبر 1653ء میں موتی مسجد[54] دیکھنے گیا، اس کے بعد آنے والے سال کی جنوری میں ایک جس روپ مراٹھیا[55] نے شہنشاہ کی بھرے دربار میں جان لینے کی ناکام کوشش کی۔ تخت کے پہلے زینے تک وہ پہنچ گیا لیکن نوبت خان کوتوال نے قاتل کے سینے پر ایسا عصا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس نے دوسری بار اٹھنے اور حملہ کرنے اور زینہ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن خواجہ رحمت اللہ نے تلوار سے اس پر حملہ کیا، کاٹ کر

اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ ان دونوں مخبروں کی وفاداری و مستعدی پر انعام دیا گیا۔

سلیمان شکوہ کی شادی

اسی سال مارچ میں دارا کے خلف اکبر سلیمان شکوہ کی شادی راؤ امراؤ سنگھ کی لڑکی سے ہوئی۔ امراؤ سنگھ راجہ جے سنگھ کا بھانجا تھا۔ شہزادی ایک ماہ شادی سے پہلے دلی بلائی گئی۔ اس کو حرم میں غالباً اس لیے رکھا گیا کہ مغلیہ اداب و تہذیب سے آگاہ ہو جائے۔ اس کے بعد اسے مسلمان کر لیا گیا۔ تب شادی کی رسمیں ادا کی گئیں [56]۔

میواڑ کا جگت سنگھ

جب شاہجہاں سلطنت کے دیگر امور میں مصروف تھا تو میواڑ کے رانا جگت سنگھ نے چتوڑ کے قلعے کی مرمت شروع کر دی۔ یہ بات اس معاہدہ کے خلاف تھی جو جہانگیر اور رانا امر سنگھ کے مابین طے ہوا تھا۔ جگت سنگھ کا انتقال 1652ء میں ہوا۔ اس کی جگہ راج سنگھ مسند نشین ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو کے کام کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب یہ بات شہنشاہ کے گوش گزارش کی گئی تو وہ رانا کی جسارت پڑ بڑا مشتعل ہوا۔ 24/ ستمبر 1654ء کو دہلی سے دو مقصد لے کر چلا۔ ایک تو اجمیر کی زیارت کا اور دوسرا راج سنگھ کو نیچا دکھانے کا، اجمیر سے اس نے اسعد اللہ خان کو تیس ہزار فوج دے کر مرمت مسمار کرنے کے لے روانہ کیا۔ شائستہ خان کو حکم ہوا کہ بشرط ضرورت میواڑ کے لیے معہ اپنی فوج کے وہ تیار رہے۔ شہزادہ اورنگ زیب کو کہا گیا کہ وہ اپنے لڑکے سلطان محمد کو ایک ہزار فوج کے ساتھ مانڈسور بھیج دے۔ لیکن راج سنگھ نے اطاعت قبول کر لی اور چتوڑ مسمار کر دیا گیا [57]۔

شاہجہاں اجمیر سے واپس آتا ہے

14/ نومبر 1654ء کو شہنشاہ اجمیر [58] سے رخصت ہو کر ایک مہینہ بعد فتح پور

پہنچا۔ راہ سفر میں سلطان محمد کو حضوری کا شرف بخشا گیا[59]۔ فتح پور میں تین دن قیام کرنے کے بعد شاہجہاں آگرہ میں گیا جہاں صرف ایک دن ٹھہرا۔ اس موقع پر شہزادہ دارا و علی مراد خان نے پہلی بار موتی مسجد دیکھی۔ بادشاہ کشتی کے ذریعہ اپنی بیوی کا مقبرہ دیکھنے گیا۔ 18/ دسمبر کو وہ آگرہ سے روانہ ہو کر دس دن بعد دارالسلطنت[60] پہنچا۔ ایک سال تک کوئی مخالف بات نہ ہوئی۔

دلی میں وَبا

دسمبر میں 1656ء ایک وبا دلی میں نازل ہوئی۔ شاہجہاں معہ اپنے دربار کے شکار کے لیے گنگا کنارے گڑھ مکیتشور گیا۔ وہاں سے 31/ جنوری 1657ء کو دارالسلطنت[61] واپس آیا۔ لیکن وبائی فضا برقرار تھی۔ وہ دہلی سے پھر 6/ فروری کو مخلص پور[62] چلا گیا۔ یہ مقام ساحل جمنا پر تخمیناً سو میل کے فاصلہ پر اتر کی طرف ہے۔ یہاں کی خنک آب و ہوا کی وجہ سے شہنشاہ نے اسے گرمی کے لیے پناہ گاہ بنا لیا تھا۔ اپنے اور اپنے بڑے لڑکے کے لیے یہاں خوبصورت محلات بنوائے تھے۔ اس کا خوبصورت نام فیض آباد رکھ دیا تھا۔ یہاں اس نے اپنے عہد حکومت کے پہلے دور کے بخیر و خوبی ختم ہونے پر ایک عظیم دربار بھی کیا تھا۔

شاہجہاں علیل

مخلص پور سے اپریل 1657ء کے خاتمہ پر شاہجہاں دارالسلطنت واپس ہوا اور 6/ ستمبر کو دفعتاً بیمار ہو گیا۔ اس کو عسرالبول و قبض کی شکایت ہو گئی۔ ایک ہفتہ شاہی طبیب علاج میں بیکار سر مارتے رہے۔ مرض بڑھتا ہی گیا۔ اس کے نیچے کے اعضا سوج گیے۔ تالو و زبان بہت خشک ہو گئے۔ اور کسی وقت بخار کی علامت ظاہر ہوتی۔ اس مدت میں مریض نے نہ کوئی غذا کھائی نہ کوئی فرحت بخش چیز، دوا کا کوئی اثر نہ ہوا اس کی نقاہت و علالت شدید ہو گئی۔ وہ مردانہ[63] وار ان تکلیفوں کو برداشت کرتا رہا۔

وراثت کے سوال کی اہمیت

شہنشاہ کی شدت علالت کی خبر سے سلطنت میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی افق

پر سیاہ بادل جمع ہونے لگے۔ وقتی طور پر جو سوال عام توجہ کا مرکز بنا وہ یہ تھا کہ اس کے بعد کون جانشین ہوگا؟ جب سے مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں شروع ہوئی اسی وقت سے اس مسئلہ کا فیصلہ زبان تیغ سے ہوا۔ اگرچہ بابر نے تخت و تاج کی وراثت کے مسئلہ کو خلف اکبری کے نظریہ سے حل کرنے کی کوشش کی لیکن مروجہ دستور کے تصادم نے اس کو زمین میں جڑ پکڑنے نہ دیا۔ خوب معلوم ہے کہ اس نے ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ لیکن کامران نے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور مرزا ہندال نے تو آگرہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہمایوں نے اپنے عہد میں اکبر کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ جب تک مرزا حکیم زندہ رہا اس نے بڑے بھائی کی شاہی نہ تسلیم کی۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس کے لڑکے خسرو نے بادشاہ ہونے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ اسی طرح مسلم ہندوستانی میں حصول تاج و تخت کے لیے جنگ کا سوال بجائے استثناء ہونے کے ایک ضابطہ بن گیا۔

یہ لڑائی اتنی خوں ریز کیوں تھی؟

سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے کی کوئی جنگ وراثت اتنی خون ریز و زلزلہ خیز مغلیہ حکومت میں کیوں نہ ہوئی؟ وجہ کی تلاش میں دور نہیں جانا ہے۔ کسی زمانہ میں مدعیان وراثت کی طاقتیں اتنی متوازن نہ تھیں۔ کامران، ہندال، حکیم اور خسرو کسی کے پیچھے بڑی جماعت نہ تھی۔ لیکن شاہجہاں کے چاروں لڑکوں میں ہر لڑکا بجائے خود حکمراں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیمور یہ چنگیزی روایات کی سخت پابندی کے لحاظ سے ساری مغلیہ سلطنت مستقبل کے دعویٰ داروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

دارا

ولی عہد دارا الٰہ آباد، پنجاب اور ملتان، ایسے زرخیز صوبہ جات پر بحیثیت نائب سلطان کار فرما تھا۔ اسی کو مفتخر خطاب شاہ بلند اقبال کا مل چکا تھا۔ اس کو عدیم المثال اعزاز چالیس ہزار سوار کا حاصل تھا۔ ایک طلائی کرسی پر تخت کے قریب

جلوہ افروز ہونے کا شرف بھی نصیب تھا۔ عہدہ و اعزاز کا ہر خواہشمند شہنشاہ کے لیے اس کے توسط کا حاجت مند ہوتا۔ مختصر یہ کہ ہر طرح لوگوں کو اس کا احساس دلایا گیا تھا کہ وہ مستقبل کا بادشاہ ہے اور شاہجہاں کے بعد اس کو مالک تخت و تاج بنانے کی سہولت مہیا کی گئی تھی۔

اگرچہ دارا مذہبی امور میں وسیع الخیال تھا۔ فلسفہ وحدت الوجود کا وہ معتقد تھا لیکن متلون مزاج، مغرور، چڑچڑا اور بے عمل تھا۔ وہ خوشامد پسند تھا۔ اس کا دربار خوشامد خوروں کا اجتماع تھا۔ دربار کی زندگی اور شہنشاہ کی بے پناہ محبت نے اس کو برباد کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو انتظامی شعور اور حسب ضرورت تسخیر قلوب کے فن سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اس لیے مزاج و تربیت کے لحاظ سے وہ اس کا اہل نہ تھا کہ اس سخت آزمائش کا مقابلہ کر سکے، جو اب درپیش تھی[64]۔

شجاع

دوسرا لڑکا شجاع بنگال کا ناظم تھا۔ وہ غیر معمولی ذہین، پاکیزہ مذاق اور دلکش مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن مستقل تعیش پسندی، بنگال کی سہل انتظامی اور اس کمزور کر دینے والے ملک کی سترہ سالہ سکونت نے اس کو کمزور، کاہل، لاپروا بنا دیا تھا۔ محنت شاقہ، صبر آزما جدوجہد، چوکس احتیاط کے اہم امتزاج سے بے بہرہ کر دیا تھا۔ اس کا انتظام ڈھیلا ڈھالا تھا، اس کی فوج ناکارہ تھی، جملہ شعبہ جات کاہلی و آرام طلبی کے شکار تھے۔ بنگال کی وبائی آب و ہوا نے اس کی صحت خراب کر دی تھی۔ یہاں تک کہ صرف 41 سال کی عمر میں اپنے کو ضعیف و نحیف سمجھنے کا احساس ہو گیا تھا حالانکہ اس کی ذہنی قوتیں اب بھی اتنی ہی پرکار تھیں جتنی اس سے قبل تھیں۔ لیکن ان کو بروئے کار لانے کے لیے زبردست حادثات کی ضرورت تھی جو کبھی کبھی فوری و عارضی چمک کی طرح نمایاں ہوتے[65]۔

اورنگ زیب

تیسرا لڑکا اورنگ زیب دکن میں نیابت سلطانی کر رہا تھا۔ وہ اپنے تینوں

بھائیوں سے مزاج و کردار کے لحاظ سے بالکل الگ تھا۔ وہ سنہری خوبیوں کا مالک تھا۔ سولہ سال کی عمر سے اس نے انتظامی مراحل و سرکاری مہمات کی دشوار گزار راہوں میں زندگی بسر کی۔ اس کی پر استقلال ہمت، غیر متزلزل عزم، اور غیر معمولی قوت برداشت، اعتقاد نہ سہی مگر خراج تحسین اپنے ہم عصروں سے حاصل کرتی رہیں۔ بلخ و قندھار میں، ملتان و گجرات میں، سندھ اور دکن میں ہر جگہ اس نے ثبوت دیا کہ وہ کتنی سخت دھات کا بنا ہوا ہے۔ وہ میدان میں بھی اتنا ہی محتاط و ہوشیار تھا جتنا پر امن فن حکمرانی میں۔ اگرچہ محبت سے زیادہ اس کا خوف دلوں میں تھا۔ مگر وہ انسان کے کردار کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکتا تھا۔ اس راز سے بخوبی واقف تھا کہ کیسے اور کہاں کس شخص کو استعمال کرے۔ ان ہی خصوصیات نے اس کو اس قابل بنایا کہ شکست کے پنجہ سے فتح چھین لے۔

مراد

چوتھا لڑکا مراد، مالوہ اور گجرات میں نیابت سلطانی کر رہا تھا۔ اس کا کردار مجموعہ اضداد تھا۔ وہ بے باک دلیر تھا۔ لیکن عیش و عشرت کا بھی دلدادہ تھا۔ اس میں سپاہیانہ مستعدی اور حملہ آوری کی بھی صلاحیت تھی۔ لیکن کامیاب سپہ سالار کے جوہر نہ تھے۔ وہ پرجوش و غیر کاروباری ذہن کا مالک تھا لیکن خلیق بھی تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا خالی الذہن نوجوان تھا جو حصول تخت و تاج کے جذبے سے سرشار تھا۔ لیکن وہ جوڑ توڑ اور احتیاط کا ایسا آدمی نہ تھا جو غور و فکر سے سوچے سمجھے منصوبوں کی تخلیق و تکمیل کر سکے۔

دوسرے تین بھائیوں کا دارا کے خلاف اتحاد

تینوں بھائیوں جو اس قدر کردار میں الگ تھے ان کا ایک رشتہ اتحاد بھی تھا اور وہ دارا کی مخالفت کا مشترک جذبۂ رشک و حسد تھا۔ محمد امین مصنف ظفر نامہ لکھتا ہے کہ قندھار کی دوسری مہم کی ناکامی کے بعد شجاع و اورنگ اپنے اپنے صوبجات جاتے ہوئے ایک ساتھ دہلی آئے۔ جہاں 6 دن رک کر انہوں نے اپنا رشتہ

ارتباط مضبوط کیا۔ شجاع اورنگ زیب کے گھر گیا تین دن تک وہاں رہا اور اسی طرح اورنگ زیب نے تین دن تک بڑے بھائی کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے علاوہ شجاع نے اپنی لڑکی سلطان محمد سے منسوب کی اور اورنگ زیب نے اپنی لڑکی کی نسبت زین العابدین[66] سے کر دی۔

خط وکتابت

شہنشاہ کی پر خطر علالت کی اطلاع ملنے پر اورنگ زیب، شجاع اور مراد میں مراسلات کا باہمی سلسلہ تیزی سے شروع ہوا۔ جلد جلدی خطوط کی آمد و رفت کے لیے مناسب مقامات پر گجرات اور بنگال کے درمیان دکن اور اڑیسہ[67] کے راستوں پر چوکیاں بٹھادی گئیں۔ ان میں سے بعض خطوط جو تلف ہونے سے بچ کر ہم تک پہنچے میں ان میں ایسی چونکا دینے والی کہانیاں ہیں جن سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے دارا کا تختہ الٹنے کے لیے کیا کیا منصوبے تیار کیے تھے۔ یہ بات صاف ہے کہ شجاع کا بنگال سے قدم بڑھانا اور مراد اورنگ زیب کا دکن سے روانہ ہونا ایک باہمی پیش رفت مصالحت کے تحت تھا۔ جس کی روشنی میں انہوں نے طے کیا تھا کہ وہ سب آگرہ کے قریب ملیں[68] گے۔

اورنگ زیب کی مصنوعی فکر مندی

ان مراسلات کے مطالعہ سے ایک دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اورنگ زیب التماس واحترام کے ساتھ اپنے دونوں بھائیوں کو مخاطب کرتا تھا۔ اورنگ زیب اور مراد دونوں شجاع کو القاب میں لکھتے ہیں کہ "بھائی جیو" اور اورنگ زیب، شجاع کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ تینوں بھائیوں کے دربار میں دوسرے دو بھائیوں کے نمائندے ہونے چاہئے تاکہ یکجہتی میں سہولت اور اتحاد میں پختگی ہوتی[69] رہے۔ دوسرے خط میں اس نے شجاع کو لکھا کہ اگر دشمن ہم میں سے صرف ایک پر حملہ کرے تو دوسرے دو بھائی بچانے کی کوشش کریں۔ بالآخر مہم شروع ہونے سے پہلے ہی اورنگ زیب نے شجاع کو ہوشیار کیا کہ وہ دارا[70]

کے خوشامدانہ اور مصالحت پسندانہ رویہ سے دھوکا نہ کھائے۔

اورنگ زیب اور مراد کی خط و کتابت

دلچسپی کے لحاظ سے مراد اور اورنگ زیب کے باہمی خطوط بھی مذکورہ بالا مراسلات کے ہم پایہ ہیں۔ غالباً اس کے پہلے خطوط میں سے ایک ایسا خط ہے جس میں مراد نے اورنگ زیب سے شکایت کی ہے کہ آپ نے بیجاپور کی جنگ کے کامیاب خاتمہ کا حال مجھے نہیں لکھا۔ اس کوتاہی کی وجہ غالباً آپ کی مصروفیت ہے۔ ورنہ آج کے حالات میں مراسلات کی تاخیر نامناسب ہے چونکہ ہمارے معاہدے کی ایک شرط باہمی خبر رسانی ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ روحانی و دنیاوی ذرائع سے جو کچھ آپ کو علم ہوا ہو اس سے مجھے بھی آگاہی بخشئے۔ نیز یہ بھی میں عرض کروں گا کہ "بھائی جیو" کو بنگال[71] میں بھی کچھ لکھیے۔ اورنگ زیب نے مراد کو لکھا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ انتظام تبادلہ و تقرر میں دشمن کا اثر ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب وہ خزانہ فراہم کرنے اور ایک فوج تیار کرنے کی فکر میں ہے...... اس وقت ہم کو بڑی احتیاط سے کام کرنا ہے اور اپنے خطوط میں کوئی نامناسب بات نہ لکھنی چاہیے[72]"۔ اس کے بعد فوراً ہی اورنگ زیب اور مراد میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ شرط تھی کہ دارا پر فتح حاصل ہونے کے بعد مراد کو سلطنت کا مغربی علاقہ دیا جائے گا۔

اورنگ زیب کا اصل مقصد

اورنگ زیب کا یہ کہنا کہ دارا سے جنگ کرنے کا اصل مقصد شہنشاہ کو اس کے پنجہ سے آزاد کرانا محض ایک فریب ایک بہانہ تھا۔ ابتدا ہی سے اپنے لیے تخت و تاج حاصل کرنے کی تدبیر وہ کر رہا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا باپ اب سلطنت کے انتظام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ شجاع اور مراد بالخصوص آخر الذکر سے اس کے وعدے کہاں تک صداقت پر مبنی تھے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے لیکن بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ریاکاری اور دورنگی سے کام لے رہا تھا۔

ہم کو اس کی دور رسی کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر مغربی صوبہ جات مراد کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ایک دوست سے زیادہ حریف ثابت ہو گا۔ کیا یہ مان لینا ممکن ہے کہ اس کو ان مہلک نتائج کا علم نہ تھا جو اس طرح کے اقدام میں اس کے جد امجد ہمایوں کو بھگتنے پڑے؟ مصلحت اندیشی نے مراد سے معاملہ کرنے پر مائل کیا تھا اور جب ایک بار طوفان ختم ہو گیا تو اورنگ زیب نے اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ یہ اقدام اخلاق و نیک نیتی کے نقطۂ نظر سے قابل ملامت ہو لیکن اورنگ زیب فلسفی کی حیثیت سے کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی نظر بادشاہت پر تھی۔

دارا اپنی جگہ مضبوط کرتا ہے

اپنی علالت کے پہلے ہفتہ بعد شاہجہاں نے دارا کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ افسروں کو حکم دیا کہ دارا کو اپنا بادشاہ سمجھ کر ہر وقت، ہر جگہ، ہر بات میں اطاعت کریں۔ فطری بات تھی کہ اب دارا اپنے استحکام کی فکر کرے۔ کبھی کبھی کوئی کوشش اس لیے ناتمام رہ جاتی تھی کہ اہم معاملات میں شاہجہاں کی رضا مندی درکار ہوتی اور کبھی اپنی قوت فیصلہ کی غلطی سے بھی بات خراب ہو جاتی۔ اس کے غور و فکر کی پہلی علامت ان احکام میں ملتی ہے جو اس نے میر جملہ، مہابت خان اور دوسرے شاہی افسروں کو دیے۔ اس نے ان لوگوں کو لکھا کہ جو افواج کمک کے لیے تم لوگ بیجاپور لے گئے تھے وہ سب لے کر دکن سے واپس آؤ۔ بعد میں اس کی خواہش کے پیش نظر شہنشاہ نے اس کے افسروں اور دوستوں کو بلند درجات پر ترقی دی۔ چنانچہ خلیل اللہ خان کو دہلی کی صوبہ داری اور قاسم خان کو گجرات[74] کی نظامت کا لالچ دیا گیا۔

حریفوں میں بیداری

صوبہ جاتی انتظام کا مجوزہ رد و بدل دوسرے شہزادوں کی زبردست ہلچل کا سبب ہو گیا۔ دارا کو باہر کر دیا جانا اس تبدیلی کا پہلا قدم تھا۔ افواہ پھیل گئی کہ مراد

سے مالوہ لے لیا جائے گا اور اورنگ زیب سے برار[75]۔ ان باتوں کے پیش نظر اب وہ مناسب وقت آگیا تھا کہ لڑائی شروع کردی جائے۔

آج ایک ہلچل مچی ہے سارے ہندوستان میں
شاہجہاں کے چاروں بیٹے لڑ گئے میدان میں
بھائیوں میں جنگ ہے، نظریں ہیں تخت و تاج پر
اور قسمت دیتی ہے آواز اس طوفان میں
کس میں دم ہے فتح کا پرچم اٹھانے کے لیے؟
سورما ہے کون؟ شاہی کس کے ہے امکان میں

مراد آزادی کا اعلان کرتا ہے

اگرچہ وسط نومبر 1657ء تک شاہجہاں بالکل صحت یاب ہو چکا تھا لیکن دکن اور بنگال میں دارا کی تیاری کی افواہوں نے ناقابل تلافی نقصانات پہنچائے۔ مراد نے اپنے دیوان علی نقی کو (ابتدائے اکتوبر میں) قتل کر دیا۔ سورت لوٹ لیا (ابتدائے نومبر میں) بالآخر اپنے بادشاہ ہونے کا[76] اعلان 5/ دسمبر کو کر دیا۔ دارا نے پہلے اسے ایک ایسا خط بھیجا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ شہنشاہ کا فیصلہ ہے۔ لکھا کہ تم کو گجرات سے برار منتقل کیا جاتا ہے۔ اس اقدام سے دارا کا یہ منشا تھا کہ اس کا ایک دشمن دوسرے دشمن کا مخالف ہو جائے گا۔ اس لیے کہ برار اورنگ زیب کے زیر تصرف تھا۔ مراد نے اس منصوبہ پر غور کیا۔ تحقیر آمیز ہنسی کے ساتھ اس حکم پر نظر ڈالی۔ نہ وہ گجرات سے منتقل ہوا نہ اورنگ زیب کے خلاف کچھ کیا[77]۔ شجاع نے بھی اسی طرح بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

شاہجہاں فوجیں بھیجتا ہے

جب شہزادوں کی نقل و حرکت کی اطلاع شاہجہاں کو دی گئی تو وہ اس پر تیار ہوا کہ ان کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجی جائیں۔ دو فوجیں مالوہ بھیجی گئیں ایک قاسم خان کی قیادت میں تاکہ مراد کو گجرات کی نظامت سے برخواست کیا جائے،

اور دوسری فوج جسونت سنگھ کی قیادت میں جو اورنگ زیب کے بڑھتے قدم کو دکن میں روک دے۔ شائستہ خان پر بجا شبہ تھا کہ وہ اورنگ زیب کی ساز باز میں پوری طرح شریک تھا۔ اس لیے اس کو مالوہ سے واپس بلا لیا گیا۔ اس اثنا میں مراد اور اورنگ زیب نے شمال کی طرف بڑھنے کا منصوبہ طے کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اوقات و منازل کا بھی تصفیہ ہو گیا تھا کہ کب اور کہاں ملا جائے گا[78]۔

اورنگ زیب میر جملہ کو قید کرتا ہے

شاہی احکام کی تعمیل میں میر جملہ دربار آ رہا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے قید کر لیا۔ اس کو قید کرنے کے بعد اورنگ زیب 20/مارچ 1658ء کو برہان پور سے روانہ ہوا۔ 3/اپریل کو اس نے دریائے نربدا پار کیا، 11/دن کے بعد مراد سے ملاقات ہوئی۔ اس درمیان میں جسونت سنگھ اور قاسم خان اجین پہنچے، دونوں شہزادوں کی نقل و حرکت کا پتہ نہ ملا تھا۔ اس لیے حالات کے مطالعہ کے لیے یہ لوگ یہاں رکے رہے۔ یہاں ایک برہمن کوی رائے اورنگ زیب کا خط لے کر جسونت سنگھ کے پاس آیا۔ اورنگ زیب نے لکھا کہ وہ مخالفت ترک کر کے خاموشی سے جودھ پور چلا جائے لیکن جسونت سنگھ نے شہنشاہ کے احکام بجالانے پر اصرار کیا۔ شہزادے کی تجویز رد کر کے جنگ کی تیاری کی۔ مخالف افواج میں ایک زبردست خون ریز جنگ دھرمت میں ہوئی۔ یہاں راجپوتوں نے حسب معمول اپنی دلیری سے کام لیا۔ شکست کی ذلت کے مقابلہ میں جان دینا بہتر سمجھا۔ دوران جنگ ایک بار یہ محسوس ہوا کہ اورنگ زیب کو شمال کی طرف بڑھنے میں ندامت کا سامنا ہونے والا ہے۔ مگر اسنے اپنے آدمیوں کو یورش کے لیے آمادہ کر کے حملہ آور راجپوتوں پر ایسا دھاوا کیا کہ شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔ جسونت سنگھ زخم خوردہ جودھ پور پہنچا۔ مسلمان آگرہ واپس[81] آئے۔

دھرمت کی معنی خیزی

دھرمت کی لڑائی فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی، دکنی جنگوں کے سورما نے دنیا کا

سامنا صرف خسارہ کے ساتھ نہیں کیا بلکہ ہندوستان میں اپنی فوجی شہرت کے ناقابل مقابلہ ہونے کا بھی سکہ بٹھادیا۔ پس و پیش کرنے والوں کو اب یک سو ہونے میں دیر نہ لگی۔ بغیر ایک لحہ کے تامل کے لوگ سمجھ گئے کہ چاروں بھائیوں میں کون ظفرو فتح کا منتخب ہوتا ہے۔ "میدان جنگ ہی میں اورنگ زیب کے لیے زمین وزماں سے مبارکباد کی صدائیں گونجیں" یہ تحریر اس کے ملازم کی قابل عفو مبالغہ کے ساتھ قلم بند[82] ہے۔

نومبر 1657ء سے شاہجہاں آگرہ ہی میں قیام پذیر تھا۔ اس کی حالیہ علالت نے اسے کمزوری و گرمی سے تاثر پذیر بنادیا تھا۔ اپنے اطباء کے مشورے پر وہ آگرہ سے 22/ اپریل 1658ء کو روانہ ہو کر بلوچ پور پہنچا۔ یہاں اس نے دھرمت کی شکست کی خبر سنی ۔ دارا نے باپ سے آگرہ واپس آنے کا اصرار کیا تاکہ باغی شہزادوں سے لڑنے کے لیے وہ ایک نئی فوج مرتب کر سکے۔ اس درمیان میں کچھ کمزر کوششیں مصالحت کے لیے ہوئیں۔ جہاں آرا نے اورنگ زیب کو خط لکھ کر یقین دلایا کہ دراصل سلطنت کے سارے معاملات شہنشاہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ نیز یہ کہ وہ بجز نماز کے اوقات کے سارا وقت رعایا کے فلاح و بہبود کی دیکھ بھال اور مذہب کی اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ اس نے اس کی غیر محتاط بے باکی سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ہر اصول عقلی و دور اندیشی کے خلاف ہے کہ عمر میں سب سے بڑے شہزادے سے جنگ کی جائے۔ تم کو راہ وفاداری و فرماں برداری پر قدم رکھنا چاہئے۔ بہتر ہے کہ اسی مقام پر رک جاؤ جہاں پہنچ گئے ہو۔ دونوں طرف مسلمانوں کی جان بچانے کے خیال سے اپنی عرضداشت حضور[83] شاہ پیش کرو۔ لیکن یہ مشورہ قابل سماعت نہ ہوا۔

اورنگ زیب شہنشاہ کو لکھتا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں نے بھی ایک ایسا ہی خط اورنگ زیب کو لکھا جس میں اس راہ سے الگ ہونے کی تاکید کی جو اورنگ زیب نے اختیار کی تھی۔ لیکن

اورنگ نے جواب دیا۔ آپ کا اب کوئی قابو سیاسی یا مالی امور پر نہیں۔ یہ اختیار سب سے بڑے شہزادے نے غصب کر لیا ہے۔ اس نے ہمیشہ میری دل آزاری کی۔ میری منفعت کے سب دروازے اس نے بند کر دیے۔ اس نے چاہا تھا کہ دکن کی مالیات کی آمدنی کم کر دے تاکہ میری فوج برباد ہو جائے۔ میں نے محنت شاقہ سے کام لے کر اہل بیجاپور کو اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ یا تو وہ خاطر خواہ محصول دیتے یا ان کا علاقہ تباہ ہو جاتا۔ لیکن بڑے شہزادے نے قاصدوں کو بھیج کر فوج کی واپسی کا حکم اس امید کے ساتھ جاری کر دیا کہ اہل بیجاپور معاملہ کر لیں گے لیکن یہ رویہ ان لوگوں کو ہمت افزا محسوس ہوا چنانچہ انہوں نے بڑی شورش برپا کی............

اگر خدانخواستہ شاہی فوج اس دیار غیر میں کسی مصیبت میں پڑ گئی ہوتی تو ہماری رسوائی تمام دنیا میں پھیل جاتی۔ اپنی عظمت و شہرت کا دربار حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ لیکن بفضلہٖ میں اس دیار سے صحیح و سلامت واپس آیا۔ مزید بر آں اتنے ہی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے آپ کو میرے خلاف کر دیا۔ یہ سمجھ کر کہ آپ مجھے خاطر میں نہیں لاتے۔ اس نے اکسایا کہ آپ میری جاگیر برار سے منتقل کر دیں اور جسونت سنگھ کو ایک زبردست فوج دے کر میرا محدود و علاقہ مجھ سے لے لیں۔ میرے قبضہ میں ایک بالشت زمین بھی نہ رہنے دیں۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب سیاسی معاملات آپ کے قابو سے باہر ہیں اور اس کی تجویز پر آپ دوسرے لڑکوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ جو کچھ کہنا ہے اسی پر فرمان جاری کر دیتے ہیں تو اپنی خودداری محفوظ رکھنے کے لیے میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بیان کرنے کا تصفیہ کیا۔ میری راہ میں جسونت سنگھ حائل ہو گیا میں نے اس کو شکست فاش دی۔ اب میں نے سنا ہے کہ شاہ بلند اقبال مجھ سے لڑنے دھول پور آئے ہیں چونکہ وہ میرے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ان کے حق میں بہتر ہو گا کہ اپنی جاگیر میں پنجاب چلے جائیں اور آپ کی خدمات

میرے سپرد کر دیں[84]۔

حلیفوں کا چنبل پار کرنا

یہ خط صاف صاف اورنگ زیب کی اس زہر آلود نفرت کے اسباب کی صاف صاف تشریح کرتا ہے جو اس کے دل میں دارا سے تھی۔ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کس قدر وہ اس عصائے شاہی کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہشمند تھا جو اس کے باپ کے ہاتھوں سے گر رہا تھا۔ اورنگ زیب اور مراد، اجین سے کوچ کر کے گوالیار پہنچے دیکھا کہ دارا کے تعینات کردہ لوگوں نے چنبل کا راستہ بند کر دیا ہے۔ ایک بندیلا سردار چمپت[85] رائے کی مدد سے اس نے ایک غیر معروف پایاب مقام بھدادار سے دریا پار کیا۔ اس کارروائی کے پیش نظر دارا پیچھے ہٹ آیا اس نے اپنی فوج سامو گڑھ میں کھڑی کی۔ صبح سے دوپہر تک ایک ایسی سخت جنگ کے بعد دارا، ہار کر آگرہ بھاگ گیا۔ اس طرح اورنگ زیب کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ دہلی کا تاج اس کی گرفت میں آ گیا۔

دارا کا فرار ہونا

سامو گڑھ سے بھاگنے کے بعد دارا کی ہمت آگرہ بھی رکنے کی نہ ہوئی۔ وہ سیدھے دہلی گیا تاکہ ایک تازہ فوج جمع کر کے فتح یاب بھائیوں سے لڑے۔ اس اثناء میں مراد اور اورنگ زیب کچھ آرام کرنے کے خیال سے میدان جنگ میں رکے رہے۔

مراد کا پچھتانا

دھرمت کی جنگ کے فوراً بعد مراد کو محسوس ہوا کہ شہنشاہ کے انتقال کے بارے میں اس کا خیال بے بنیاد تھا۔ اس احساس کے ساتھ اس نے فوراً بعد ایک خط بڑے منفعل انداز میں لکھا کہ "میرے دل میں بجز آپ کی اطاعت و عزت کے کوئی اور جذبہ نہیں لیکن غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ آپ کے متعلق بری خبر سن کر میں نے کچھ قصور بھی کیے اس کا مجھے بیحد ملال ہے۔ آپ کی علالت

کے زمانے میں "داوا بھائی جیو نے آپ کی مرضی کے خلاف ہمارے اور ہمارے دربار کے وکیل کے درمیان سلسلۂ خط و کتابت بند کرادیا۔ بالخصوص میرے خطوط آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو روک دیا۔ ایسی حالت میں میں جواب کی کیا امید کر سکتا تھا؟ فطرتاً میں اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے حاضر خدمت ہونا چاہتا تھا اس لیے حاضر دربار ہونے کے لیے روانہ ہوا۔ اجمیر کے راستے سے میں نے آنا اس لیے پسند نہ کیا کہ وہاں پانی کی قلت ہے۔ اس لیے میں مالوہ ہو کر آرہا تھا۔ یہاں اورنگ زیب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی سلام کرنے حاضر ہو رہے تھے۔ جسونت سنگھ نے ہمارا راستہ بند کر دیا۔ ہم نے اس کو شکست[86] دی۔" اس کے بعد کے ایک خط میں بھی مراد نے بڑی منت و عاجزی سے عفو و تقصیر کی باپ سے درخواست کی ہے۔

مراد کے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اسے تخت نشین ہونے کی ہوس تھی مگر باپ کی زندگی میں اس اقدام کے خلاف تھا۔ اس نے گجرات میں اپنی بادشاہی کا اعلان اس لیے کیا کہ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اسی لیے وہ اورنگ زیب و شجاع کو یقین دلاتا رہا کہ وہ حق بجانب ہے۔ آخرالذکر کو ایک خط میں لکھتا ہے "ایک عرصہ تک مجھے یقین رہا کہ شہنشاہ کا انتقال ہو گیا ہے لیکن بھائی اورنگ زیب کو باور کرنے میں اب تک تکلف ہے۔ مجھے اس کی رہنمائی پر اعتماد[87] ہے۔" اس طرح مراد کردار کا سچا تھا۔ وراثت کی جنگ میں اس کا شریک ہونا اس کے اضطراری مزاج کی وجہ سے تھا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو اپنے باپ پر ندامت و ذلت کا اتنا انبار نہ کرتا جتنا اس کے بڑے بھائی نے کیا۔

شاہجہاں کی آخری کوشش

جب آگرہ کے قریب و جوار میں مراد و اورنگ زیب داخل ہو گئے تو شاہجہاں نے اورنگ زیب کو خط لکھا کہ تمہارے دیکھنے کو بہت ہی جی چاہتا ہے تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔ اورنگ زیب نے نہایت مودبانہ جواب دیا کہ میں ساعت نیک

کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد باپ اور بیٹے میں مزید خط و کتابت ہوئی۔ ایک بار تو جہاں آرا اورنگ زیب کے پاس باپ کا پیغام لے کر گئی۔ اس نے بتایا کہ شہنشاہ تم کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا چاہتے ہیں اور دارا کو پنجاب و مغربی سرحدی علاقہ میں مخصوص کر دینا چاہتے ہیں۔ دکن معظم کو، گجرات مراد کو اور بنگال شجاع کو دے دینے کا خیال ہے۔ لیکن اورنگ زیب نے جواب دیا کہ جب تک وہ پوری طرح دارا سے نپٹ نہ لے گا وہ شہنشاہ کے دیدار کے لیے نہ جائے گا۔ جہاں آرا مایوس ہو کر واپس چلی آئی [88]۔

اورنگ زیب واقعی نہایت چالاک تھا۔ اس نے اس صورت حال کا پورا اندازہ کر لیا تھا جو اس کی راہ میں آسکتی ہے جب تک دارا کے قبضے میں ایک شمہ بھی حکومت کا باقی رہتا ہے کیسے وہ امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے؟ لیکن شہنشاہ کے معاندانہ ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا [89]۔ بایں ہمہ اورنگ زیب کا دل پسیج گیا۔ باپ کی ملاقات کے لیے وہ "دہر آرا باغ" سے روانہ ہوا لیکن شائستہ خان اور شیخ میر نے روک لیا۔ اس کے فوراً بعد ہی رکے رہنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ وہ (شاہجہاں) دشمنوں کو ایک قلیل مدت میں سزا دے۔ اس تحریر نے قطعی طور پر شاہجہاں کی دو عملی کا راز فاش کر دیا۔ اورنگ زیب نے فیصلہ کیا کہ وہ ملاقات کے لیے نہ جائے گا۔ آگرہ کا قلعہ اس سے پہلے ہی اس کے قبضے میں آگیا تھا اس لیے اس کے بعد شاہجہاں اس میں قیدی کی حیثیت سے رہا [90]۔

دارا کی سرگرمی

آگرہ سے دارا کے فرار ہونے کے بعد سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ یہ ہے کہ اورنگ زیب سے اتنا ڈر گیا تھا کہ وہ دہلی میں بھی نہ رکا بلکہ لاہور چلا گیا۔ دریائے بیاس کو اپنے اور دشمنوں کی رفتار بندی کے لیے حد فاصل بنایا۔ اس درمیان میں اورنگ زیب آگرہ سے روانہ ہوا اور متھرا کے قریب عیاری سے مراد کو قید کر لیا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھا۔ دہلی پہنچا یہاں بھی زیادہ نہ رکا۔ اس نے

دارا کی فوج میں اختلاف کا بیج بویا۔ اس کے وفادار سپہ سالار داؤد خان سے اسے بدظن کر دیا۔ دارا لاہور سے بھاگ کر ملتان اور سندھ پہنچا۔ اورنگ زیب کے افسر اس کا تعاقب بڑی بُری طرح کر رہے تھے۔ سندھ سے کچھ ہوتا ہوا گجرات میں داخل ہوا۔ یہاں ناظم گجرات نے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں اس کو جسونت سنگھ کی گفتگوئے صلح کی مدد ملی۔ اس لیے وہ اجمیر کی طرف چل پڑا۔ لیکن جسونت سنگھ نے پہلو بدلا اور دارا کو دیورائی میں اورنگ زیب کے افسروں سے ایک زور دار جنگ لڑنی پڑی۔ وہ ہار گیا اور احمد آباد بھاگ گیا۔ جہاں کے صوبہ دار نے اس پر دروازہ بند کر دیا۔ وہ سندھ واپس آیا اس خیال سے کہ ایران میں پناہ لے۔ وہاں راستے میں اس کے میزبان ملک جیون زمیندار داور نے فریب دے کر اسے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ دارا کو دہلی پہنچایا گیا۔ یہاں شہر میں تشہیر کرنے کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔

شجاع کی نقل و حرکت

اب تک شجاع کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے۔ مراد کی طرح اس نے بھی بنگال میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔ تینوں بھائیوں کے پیش رفت منصوبہ کے تحت وہ پٹنہ کی طرف بڑھا۔ یہ شہر جلد ہی اس کے ہاتھ آ گیا۔ جب اس کے آگے بڑھنے کی خبر شاہجہاں کو ملی تو دارا کی اس تجویز سے وہ متفق ہوا کہ جے سنگھ اور سلیمان شکوہ کو اس کے مقابلہ میں بھیجا جائے۔ شجاع کو بہادر پور میں شکست ہوئی۔ یہ مقام بنارس سے شمال و مشرق کی طرف 5 میل کے فاصلہ پر تھا۔ ہارنے کے بعد وہ بنگال بھاگ گیا۔ فتح یاب سلیمان شکوہ اس کا پیچھا کرتا رہا۔ لیکن باپ کی ایک فوری طلب پر اپنے کو مجبور دیکھ کر اس نے شجاع سے صلح کر لی (ابتدائے مئی 1658ء) اس کے باپ نے اس لیے واپس بلا لیا تھا کہ مراد اور اورنگ زیب سے اس کو لڑنا تھا۔ لیکن اب تک اورنگ زیب لڑ کر کامیاب ہو چکا تھا۔ دہلی سے اس نے شجاع کو ایک محبت آمیز خط لکھا۔ لیکن پنجاب میں اورنگ زیب کی عدم موجودگی سے

آگرہ پر قبضہ، شاہجہاں کی حفاظت اور پرانی حکومت کو بحال کرنے کا حوصلہ، شجاع کے دل میں پھر پیدا ہوا۔ مگر اس کی ریشہ دوانیاں خاک میں مل گئیں۔ اس نے اورنگ زیب کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔ اواخر اکتوبر 1658ء میں وہ ایک زبردست فوج لے کر چلا۔ بغیر کسی مخالفت کے روہتاس، چنار اور بنارس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن فوراً ہی اورنگ زیب اس سے لڑنے آ گیا۔ کھجوا میں اس کو شکست دی۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ معظم خان اور شہزادہ سلطان محمد نے اس کا پیچھا کیا۔ اسے بنگال سے باہر نکال کر ارکان کے کسی غیر معروف مقام پر بیکسی کی موت مرنے پر مجبور کیا۔

سلیمان شکوہ کا حشر

جنگ وراثت کی داستان کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک مختصر حوالہ سلیمان شکوہ کے انجام کا بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اس کے باپ کی مصیبت سن کر جسونت سنگھ اور بعدہ دلیر خان نے اس سے علاحدگی اختیار کر لی۔ وہ بھاگ کر ہر دوار گیا۔ وہاں سے پار کر کے گڑھوال پہنچا۔ یہاں پر تھوی سنگھ راجا سری نگر، نے اسے پناہ دی۔ لیکن میزبان نے بعد میں اس کو اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ اورنگ زیب نے گوالیار کے قلعہ میں اس کو زہر دے کر ختم کر دیا۔ اسی قلعہ میں اس کا چچا مراد بھی رہتا تھا۔ علی نقی کے قتل کرنے کا الزام لگا کر مراد کو بھی تہ تیغ کرا دیا۔

شاہجہاں سخت نگرانی میں ایک قیدی

آئندہ ساڑھے سات سال تک آگرہ کے قلعہ میں شاہ نے سخت نگرانی میں ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کی۔ ابتداء میں تو اس نے حالات سے سمجھوتہ نہ کیا۔ دارا کو برابر خط لکھتا رہا۔ اپنی لازوال محبت، امداد اور نصیحت سے سرفراز کرتا رہا بلکہ ایک بار اس نے آخری کوشش بھی اپنی رہائی کی۔ جب شجاع پٹنہ سے آگے بڑھ کر آگرہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تو بوڑھے شہنشاہ نے اس کو خط لکھے اس کی مہم کی

کامیابی پر نزول برکت کی دعا کی۔ جملہ وفادار رعایا کو آواز دی کہ مجھ کو رہا کرانے والے کے ارد گرد جمع ہو جاؤ۔ لیکن اس کی کوشش ناکامیاب ہوئی۔ نتیجہ بُرا ہوا۔ اس کی اسیری کی بندشیں اور بڑھادی گئیں۔ اس سے بات چیت کرنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اور اجازت ملتی بھی تھی تو اس طرح کہ سلطان محمد، داروغہ مجلس موجود ہیں اور پہلے ہی سے اورنگ زیب کی منظوری بھی حاصل ہو چکی ہو۔ ہر بات جو اس کے منہ سے نکلتی تھی فوراً اورنگ زیب تک پہنچادی جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے موثر اقدام سے شاہجہاں کی خطوط نویسی کا سلسلہ بند کر دیا تھا، جو خواجہ سرا چھپا کر ایسے خطوط لے جاتے تھے ان کو ملازمت سے نکال دیا جاتا تھا۔ اور دوسروں کی ایسی حرکت سے باز رہنے کی سزا سے باخبر کر دیا جاتا۔ بالآخر یہ قیدی سامان تحریر سے بھی محروم کر دیا گیا[91]۔

داروغہ محبس کی ایذادہی

قید کی سختی یہیں نہیں ختم ہوئی اس کی ایذاء رسانی کے لیے چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی تحقیر آمیز انداز میں کی جاتیں۔ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو سارے جواہرات، قیمتی پتھر اور دوسرے سامان سے محروم کر دیا حالانکہ وہ ان سب چیزوں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یہ سختی یہاں تک بڑھی کہ شاہی ملبوسات، سامان آرائش، ظروف وغیرہ رکھنے کے کمرے سر بہ مہر کر دیئے گئے۔ یہ کمرے اسی وقت کھولے جاتے جب کوئی ذمہ دار افسر اور معتمد خان اورنگ زیب کا با اعتماد خواجہ سرا موجود ہوتے۔ ہر موقع پر شاہجہاں کی ذلت پہرہ دار کرتے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو عام قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آخری کار خدا نے اس کو ان مصیبتوں کے برداشت کرنے کی طاقت بھی عطا کر دی اور تسلیم و رضا کی کیفیت میں وہ مذہبی فرائض و مطالعہ میں اپنا وقت صرف کرتا رہا۔

اورنگ زیب کے برتاؤ پر اعتراضات

اورنگ زیب کا اپنے باپ سے سلوک اخلاقی لحاظ سے بدترین ملامت کا سزاوار

ہے۔ شروع سے آخر تک اس کا رویہ کسی گہری منافرت یا انتقام کا نتیجہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ قید بادشاہ زبردست خطرات کا سرچشمہ ہوتا ہے لیکن اورنگ زیب کا شاہجہاں کو ان معمولی ضروریات سے بھی محروم رکھنے کا جو اس کے شایان شان تھیں کوئی جواز نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخت پر قبضہ کر لینے کے بعد اورنگ زیب فرائض پسری بھول گیا۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ شاہی خزانہ قانوناً معاشرہ کی ملکیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اورنگ زیب نے عوام کے مفاد کے لیے کیا کیا۔ اس نے اندوختہ سرمایہ دکن کی بے سود لڑائیوں میں صرف کر دیا۔ اگر اس کو شاندار لباس پہننے یا جواہرات استعمال کرنے کی خواہش نہ تھی تو اس نے باپ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے بھی کیوں محروم رکھا۔ اگر یہ بات شاہجہاں کے لیے وجہ تسکین ہو سکتی تھی۔ کیا یہ اس کا فرض نہ تھا کہ قید کی سختیاں جتنی بھی ممکن ہوں کم کر دی جائیں؟ اورنگ زیب کے کردار کا جو بھی مذہبی جواز ہو لیکن تاریخ جس کا خاص تعلق انسانی فطرت کا مطالعہ ہے اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے باپ کے لیے ناقابل عفو ظالم تھا۔

---

1. Beale

تتمہ حاشیے

باب 1

1- 11، ن، جلد 3 ص 921۔ جہانگیر کی تاریخ ولادت 999 ہجری لکھتا ہے۔ جو صریحاً غلط ہے۔ اب جلد 1 ص 19، قزوینی ص 116۔ لاہوری جلد اص 16۔ معاصر جہانگیری ص 42۔

2- 1، ن۔ جلد 3 ص 749۔ منی پرشاد ص، 3 ن 5۔ بی ایل[1] اس نے اس کا نام غلط بتایا ہے۔ ص 363، کویراج شیام لال داس کہتا ہے کہ اس کا دوسرا امام جودھا بائی تھا لیکن شادی کی تاریخ 1588 لکھتا ہے۔ ج 1، س، ب، 1888 ص 71۔ مان ریکو بھی اس کا نام بال حتمی بتاتا ہے۔ جلد 2 ص 201

3- ان۔ جلد 3 ص 921۔ دیکھو شاہجہاں کے زائچے فزوینی اور لاہوری۔

4- یہ شبہ ہے کہ کوئی قطعہ تاریخ ولادت کے وقت کہا گیا ہو۔ پادشاہ نامہ سے پہلے ان کا اندراج کس یاور کتاب میں نہیں۔ پہلے میں لفظ عالمگیر رعایت لفظی اور دوسرے میں لفظ شاجہاں اس قیاس کی تائید کرتا ہے۔

5- ر۔ ب۔ جلد 1، ص 48۔ قزوینی ف 18 گوبند کی پیشن گوئی کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس کا انتقال جہانگیر کے عہد حکومت کے بیسویں سال ہوا۔ اقبال نامہ ص 251۔

6- ابوالفضل شہزادہ سلیم کی رسم مکتب کا مفصل بیان پیش کرتا ہے۔اور اتفاقیہ خسرو کی اس رسم کا ذکر کرتا ہے ا،ن، جلد 3 ص 922 لیکن خرم کے مکتب کی رسم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔البتہ اس کے بعض اساتذہ کے نام بتاتا ہے۔رسمی طور پر اس رسم کا ذکر بعد کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً قزوینی، صالح اور منظوم پادشاہ نامے، قزوینی ف 34۔ صالح جلد 1، صفحات 30-32 تک

7- ابوالفضل کا بیان ہے کہ روحانی مراقبات کے لیے اس کو بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور بہت سے دلچسپ صوفیانہ بیانات اس کے لب اظہار پر آئے۔ا۔ن جلد 3۔ ص 1122، طبقات اکبری کا کہنا ہے کہ منطقی علوم کا ماہر تھا۔ ص 541، بلوچ میں بھی ملاحظہ ہو ص 517، اور 106۔

8- قزوینی اور صالح دونوں خرم کے استاد کا نام حکیم دوانی لکھتے ہیں۔ لیکن اکبری دور میں صرف ایک دوانی کا ذکر آتا ہے اور وہ نام ہے حکیم عین الملک شیرازی جو مشہور و معروف منطقی دوانی کی ذریت میں ہے، اور بداؤنی کا دوست بھی ہے لیکن حکیم شیرازی کا انتقال 1003 ہجری میں ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ وہ شہزادے خرم کا استاد نہیں ہو سکتا۔ میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حکیم دوائی سے مراد ہے حکیم علی گیلانی۔ آخر الذکر حکیم عین الملک کا بھانجہ تھا اور ممکن ہے اپنے ماموں کے لقب پر مشہور ہو گیا ہو۔ علاوہ اس کے وہ برابر شہزادہ خرم کا ساتھی رہا۔ جہانگیر حکیم علی کی خصوصیات کی تعریف کرتا ہے۔

عین الملک کے لیے دیکھو بدایونی جلد 3 ص 164، اور بلوچ میں ص 481، حکیم علی کے لیے دیکھو طبقات ص 291، ر۔ب جلد 1 ص 154, 152-68 معاصر الامراء جلد اصفحات 568-73 تک۔

9- قزوینی ف 34۔

10- طبقات ف 299۔ صبح صادق ف 100 محمد صوفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا

ہے کہ اس کا انتقال 1013 ہجری، سفر لاہور میں ہوا۔ یہاں وہ حسب الطلب جہانگیر کی خدمت میں جارہا تھا۔(Blachmamm)

11- ابتدا میں وہ خسرو کا اتالیق تھا۔ ا،ن، جلد 3 ص 922 دیکھو بلوچ مین کا تعارف یہ سلسلہ آئین اکبری جلد 33۔

12- لاہوری جلد 1 صفحات 33-132 قزوینی کا بیان ہے کہ شہزادہ خرم ترکی کی زبان کے چند حروف سے واقف تھا۔ اس لیے کہ رقیہ بیگم کی صحبت میں رہتا تھاف 134۔

13- جلد 3 ص 1177، جہانگیر کے عہد میں وہ بکاول بیگی تھا۔ ر۔ب۔ جلد 1 ص 318۔

14- 1598ء میں وہ لاہور کا بخشی تھا۔ ا،ن جلد 3 ص 1115، بلوچ مین صفحات 499-598 قزوینی ف 34۔ب۔

15- یہ سلامی مغل حکمرانوں کے یہاں ازروئے ضابطہ تھی۔ غالباً اس کا مفہوم مسلح سلامی پیش کرنے کا تھا۔

16- قزوینی ف 35۔ سالیوہان (Saliuhan) نے ابوالفضل کے لیے ایک خاص اشارہ، دربار سے دکن جانے کا حاصل کیا۔ ا،ن جلد 3 ص 1197۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ وہ دکن سے معہ دانیال کے ہاتھی کے آرہا تھا۔ ر۔ب۔ جلد 1 ص 46۔

17- قزوینی ف 35ب، 36

18- ایضاً ف 36

19- ا،ن، جلد 3 ص 1243

20- ایضاً ص 1244۔ معاصر جہانگیری ف 57 خرم کے جانے کا مقصد نہیں بتایا

21- ا،ن، جلد 3 ص 1245۔ قزوینی کا بیان ہے کہ شہزادۂ خرم بھی نہیں چاہتا

تھا کہ اس کے باپ کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ اسی لیے اس نے
اپنی رپورٹ بڑی ہوشیاری سے پیش کی، ف 35ب 37

22- معاصر جہانگیر ف 59ب۔ 61

23- ا، ن، جلد 3، صفحات 1257۔ 62 تک

24- معاصر جہانگیر صفحات 61-62۔ ر، ب جلد 1، ص 322۔

25- قزوینی ف 37-40 تک تسلیم کرتا ہے (ف 40) کہ اس نے یہ تفصیلات
جہانگیر نامہ سے لی ہیں۔

26- اقبال نامہ ص 9 معاصر جہانگیری ف: قزوینی ف 42۔ ر، ب جلد 1 ص 76

27- ایضاً ص 71

28- ایضاً ص 76۔ معاصر جہانگیری ف 73: قزوینی ف 43

29- ر، ب جلد 1 ص 87: اقبال نامہ میں غلطی سے لکھا ہے 20000 ص 222
معاصرین 8000 ذات اور 5000 سوار لکھا ہے۔ ف ص 76

30- قزوینی 43-44

31- بموجب توزک دوسرے سال کے نوروز کے دن شہزادہ خرم کو صرف
8000 ذات اور 8000 سوار کا منصب دل علم اور ایک جاگیر (ر۔ ب ص
87) حاصل ہوئے۔ حصار فیروزہ کی سرکار اس کو بعد میں عطا کی گئی۔
(ر۔ ب ص 132) اقبال نامہ اور توزک ہم رائے ہیں (ص 22) (لیکن
معاصر جہانگیری میں ہے کہ حصار فیروز بھی اسی موقع پر خرم کو دیا گیا۔ ف
76ب اور اسے ولی عہد مقرر کیا گیا۔ قزوینی ف 44) معاصر کی رائے سے
متفق ہے اس کے اندراج میں یہ بھی ہے کہ مہر یوزاک بھی اس موقع پر
شہزادہ کو دی گئی۔ میں نے یہ دونوں واقعات حسب توزک علاحدہ پیش کیے
ہیں۔

32- ر۔ ب۔ صفحہ 115: قزوینی ف 42

33- ر۔ب جلد 1 صفحات 122-23۔ اقبال نامہ صفحات 28-30 تک۔ معاصر جہانگیری ہیں اس کا تذکرہ صرف ایک جملہ میں کیا گیا ہے۔ ف 79

34- یہ ایک قسم کا شکار ہے جس میں جانور بیچ دائرہ میں ہنکا کر لائے جاتے ہیں اور شکاری بہت قریب سے مارتے ہیں یا نشانہ لیتے ہیں۔

35- ر۔ب۔، جلد ا ص 129

36- قزوینی ف 45

37- ر۔ب۔ جلد 1 ص 156

38- ر۔ب۔ جلد 1 ص 159: اقبال نامہ ص 38۔ معاصر جہانگیری ف 89 ب: قزوینی نے تفصیل کے ساتھ مظفر حسین صفوی کے آباواجداد کا حال بیان کیا ہے۔ ف 45-46ب

39- ر۔ب۔ جلد ا صفحات 184-188 تک: اقبال نامہ صفحات 47-48 معاصر جہانگیری ف 96-97: قزوینی ف 46ب۔ 47ب

40- ر۔ب جلد ا صفحات 184-188 تک: اقبال نامہ صفحات 47-48 معاصر جہانگیری ف 96-97: قزوینی ف 46ب۔ 47ب

41- اقبال نامہ، صفحات 54-57۔ معاصر جہانگیری ف 102 ب

42- ر۔ب جلد 1 ص 217

43- ر۔ب، جلد 1 صفحات 224-25: اقبال نامہ ص 67 معاصر جہانگیری ف 113: قزوینی 48ب۔ 49ب

44- قزوینی کا خیال ہے کہ رشتہ خان خاناں کی بدگمانی دور کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ ف 72 ب لاہوری کا کہنا ہے کہ یہ شادی بعض سیاسی امور کے لحاظ سے ہوئی۔ (جلد 1 ص 290) معتمد خان کا بیان ہے کہ خان خاناں کے اعزاز میں اضافہ ہوا۔ (اقبال نامہ ص 1000) اس کے بطن سے شہزادہ شاہجہان کے ایک لڑکا تھا جس کا نام جہان افروز تھا۔ لیکن بچپن ہی میں اس کا

استقال برہان پور میں ہو گیا تھا (لاہوری جلد 1 ص 390)

45- ر۔ب جلد 1 ص 118

46- ر۔ب جلد 1 ص 156

47- میواڑ کی مہم کا بیان بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر صفحات 237-48 تک۔

---

1. Rve

باب2

1- ر۔ب جلد 1 ص 288: قزوینی ف 64: معاصر جہانگیری میں بیس ہزار و دس ہزار ہے ف 131۔ ص306: قزوینی ف66-67۔

2- ر۔ب جلد 1 ص306 قزوینی ف66-67

3- ر۔ب جلد 1 ص280

4- ر۔ب جلد 1 صفحات 312-14: معاصر جہانگیری ف 140-141: اقبال نامہ صفحات 75-87۔ بنی پرشاد کی تاریخ جہانگیر میں 270۔ رو[1] جلد 1 صفحہ 192-193

5- ر۔ب جلد 1: ص329: اقبال نامہ 90: معاصر جہانگیر 147ب: قزوینی ف 39

6- ر۔ب جلد 1 ص336

7- ر۔ب جلد 1 صفحات 231 اور 335: معاصر جہانگیر ف144

8- ر۔ب جلد 1 ص 338: قزوینی ف 69: اقبال نامہ ص 90: معاصر جہانگیر ف148۔

9- محمد رضا بیگ ر۔ب، جلد 1 ص336

10- اپنے باپ سے بغاوت کے زمانہ میں خود جہانگیر نے شاہ کا لقب اختیار کیا

---

1. Rve

تھا۔ تشریح کے لیے کہا کرتا تھا کہ اس کا باپ شہنشاہ تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ اپنے بیٹے کو شاہ کا لقب دے کر اپنے کو بھی اتنا ہی سر بلند کرنا چاہتا تھا جتنا شہزادہ خرم کو۔

11- ر،ب، جلد 1 ص 339: قزوینی ف 69: اقبال نامہ ص 07۔ معاصر جہانگیری ف 147ب

12- اقبال نامہ ص 91

13- قزوینی ف 69 ب: اقبال نامہ ص 93: معاصر جہانگیری ف 148، ب: ر،ب جلد: ص 144

14- قزوینی ف 70: ر،ب جلد 1 ص 368، اقبال نامہ 69: معاصر جہانلیری ف ص 149۔

15- ر۔ب، جلد 1 صفحہ 380: اقبال نامہ 100: معاصر جہانگیری ف، 150: قزوینی ف 71

16- ر،ب، جلد 1 ص 393، اقبال نامہ ص 102، معاصر جہانلیری ف 174:

17- ر،ب، جلد 1 ص، 38

18- ر،ب جلد 1 ص 97,393 تک۔

19- ایضاً ص 399-401 تک

20- تاریخ جہانگیر، مصنفہ بنی پرشاد ص 289-300 تک

21- ر،ب، جلد 1، ص 424، ایک دوسری جگہ جہانگیر رقم طراز ہے کہ گجرات کی جاگیر شاہجہاں کو اس لیے دی تھی کہ رانا کے مقابلہ میں اس کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ ر،ب جلد 11 ص 261، قزوینی ف 5،ب

22- قزوینی ف 77: اقبال نامہ ص 110 ر،ب جلد 1 ص 443۔

23- ر،ب جلد ص 14: اقبال نامہ ص 115

24- ر،ب جلد 11 ص 84

25-ر،ب جلد 2 ص 183-86 تک۔ اس کا بیان شش فتح اور جملہ دوسری کتابوں میں دراصل وہی ہے جو جہانگیر نے قلم بند کیا ہے۔

26- قزوینی، ف88: ر،ب، جلد2 ص155-56، ص189-90 تک

27- قزوینی (ف89) بعض نمایاں باتیں کہتا ہے۔ اقبال نامہ ص176۔ معاصر جہانگیری ف173۔

28- قزوینی ف91,90۔

29- اقبال نامہ ص182-181

30- قزوینی ف92۔

31- ایضاً ف93۔

32- قزوینی94-93

33- دکن کے معاملات کی بنیاد قزوینی کے بیانات پر ہے۔ اس نے اپنے تمام پیشروؤں سے زیادہ مفصل بیان کیا ہے۔ معتمد خان بہت مایوس کن ہے، وہ دربار کے حالات بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے بہ نسبت ان حالات کے جن کا وہ چشم دید گواہ تھا (دیکھو قزوینی ف92-102)

باب3

1- قزوینی ف35،ب

2- ر۔ب، جلد1 ص436

3- رو[1] ص 191 ۔ میتھولڈ[2] شاہجہاں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: بغیر اپنے ساتھیوں کی خوشامد کے بھی شاہجہاں کافی مغرور و حوصلہ پسند تھا۔ اس کے عروج میں مضمر اس کی زبردست قوت ارادی شامل ہے۔ اس کا خود ساختہ قانون نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کی طرح دولت کا دلداہ تھا۔ ہندوستان میں انگریزی[3] کارخانے (23-1622) ص46۔ کیرج نے جو شاہجہاں کا جائزہ لیا ہے اس کے لیے دیکھئے (29-1624) ص205-207 تک۔

4- ر،ب، جلد2، ص206

5- ر،ب، جلد2، ص187 اور 199

6- ر،ب، جلد2، ص203

7- ر،ب، جلد2، ص209

8- ر،ب، جلد2، ص228

9- ر،ب، جلد2، ص221

---

1. Ro (2) Hethwold (3) The English Factories in India

10-ر،ب، جلد2، ص194

11-ر،ب، جلد2، ص200

12-ر،ب، جلد2، ص215

13-ج،ر،ا،(1907)ص599 تاریخ ہند مصنفہ الفنسٹن جلد2ص368

14-تاریخ جہانگیر مصنفہ بنی پرشاد ص336۔40تک اور حواشی۔

15-صالح ج،ا، ص137اور صفحات56,163تک۔

16-ر۔ب۔ج ۲ ص ۲۲۸: خسرو کے قتل میں شاہجہاں کی شرکت کی بابت عصری ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان میں عصری کارخانے" (23-1622) بالخصوص بنگھم کے برہان پور سے سورت روانہ کیے ہوئے خطوط کے صفحات 94,59 توجہ طلب ہیں، اور میتھولڈ کے بھی وہ خطوط دیکھئے جو اس نے مسلی پٹنم سے سورت بھیجے ہیں ص159 اور 98 میتھولڈ کی رائیں دلچسپ ہیں۔ سلطان خسرو کے برادرانہ وغیر فطری قتل کی سزا فی الحال ملتوی ہو گئی ہے مگر قتل میں شریک ہونے والوں پر زبردست انتقام عائد ہوگا۔ یہ سانحہ اس بدبخت مغل بادشاہ سے چھپایا جا سکتا ہے کیونکہ فاصلہ بھی ہے اور اس کے دوستوں کی سازش بھی لیکن اس سلطان السلاطین بھی ہے جو کبھی بغیر انتقام لیے ہوئے بے گناہ کا قتل نظر انداز نہیں کرتا۔ پیڑ منڈے ص244۔ ٹر وڈیلا ول جلد1 ص58۔ فتوحات عادل شاہی میں شاہجہاں کی بغاوت کا ذکر کچھ الجھا ہوا ہے لیکن اس کا بیان وضاحت کے ساتھ ہے کہ جہانگیر نے کتنی کشمکش کے ساتھ شاہجہاں کے سپرد، خسرو کو کیا تھا۔ کہتا ہے کہ اس کے کچھ ہی دن بعد سنا گیا کہ خسرو قتل کر دیا گیاف(85-281)

17-ر،ب جلد2، ص231: اقبال نامہ ص192: قزوینی ف102ب: معاصر جہانگیری ف105۔

18- قزوینی ف 103، ب صالح، ج 1، ص 167-168: جہانگیر کے قندھار بھیجنے کی خواہش تین وجہوں سے تھی۔ (1) کیونکہ وہ قابل سپہ سالار اور تجربہ کار سیاست دان تھا۔ (2) کیونکہ امام قلی خان نے جہانگیر کے خط میں شاہجہاں کا نام خاص طور پر لکھا تھا (لاہوری ج 1، ص 232-33) اور (3) کیونکہ جہانگیر نے سوچا کہ شاہجہاں، شاہ عباس سے خط و کتابت رکھتا ہے اس لیے وہ آخرالذکر کو متاثر کر سکے گا۔ یہ واضح کہ جہانگیر شاہجہاں کے خلاف اس وقت کچھ نہیں سوچ رہا تھا اب تک اس سلسلے میں نور جہاں کا اس نے کوئی اثر نہ لیا تھا۔

19- ر، ب، ج 2، ص 234-35۔ معتمد خان اب دکن سے واپس آتا ہے۔ دیکھئے اقبال نامہ 193

20- ر، ب، ج ص 236۔ جہانگیر اپنے لڑکے سے اتنا برافروختہ ہوا کہ اس نے بندوق سے شکار نہ کرنے کی قسم کھائی تھی وہ توڑ دی تھی۔ یہ قسم اس نے شاہجہاں کے لڑکوں کی محبت ودلدہی کے سلسلے میں کھائی تھی۔ دھول پور کے معاملات کا بیان سورت کے ایک خط میں ہے (ہندوستان میں انگریزی کارخانے ص 90 اور 94)

21- اقبال نامہ ص 194، قزوینی ف 104 صالح ج 1 ص 168-69

22- ر، ب، ج 2، ص 237، قزوینی ف 104 ب

23- ر، ب، ج، ص 238-39: اقبال نامہ ص 196

24- ر، ب، ج 2، ص 287

25- قزوینی اور معتمد خان دونوں شاہجہاں کے امن پسند ارادوں پر اس کا اتا محمول کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شاہجہاں کا شمال کی طرف کوچ کرنا شہنشاہ کی عیادت اور ایک مصالحت کرنے پر مبنی تھا لیکن یہ واقعہ کہ اس کے سات ایک زبردست لشکر بھی تھا۔ اس کی نیک نیتی کی تکذیب کرتا ہے۔ اقبال

نامہ ص300 قزوینی105، ب

26-ر، ب، جلد2، ص247: اقبال نامہ ص200

27-ر، ب، جلد2، ص249-50 اور ڈیلا ویل[2] ص121

28-ر، ب، جلد2، ص248

29-ر، ب، ج2 ص249

30-ر، ب، جلد2، ص250 اقبال نامہ ص200

31-ر، ب، جلد2، ص251 اقبال نامہ ص201

32-ر، ب، جلد2، ص249 اقبال نامہ ص199۔ معاصر جہانگیری نے معتمد خان کا نام بھی شامل کیا ہے (ف190)

33-ڈیلا ویل[1] لکھتا ہے کہ "آصف خان کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ بادشاہ نے اس کو حراست میں رکھ لیا ہے کیونکہ بغاوت کا شبہ تھا"۔ (121)
ولوگلی[2] نے آگرہ سورت لکھ بھیجا کہ "بادشاہ ضرور آگرہ آئے گا اور آصف خان بحیثیت قیدی لالہ بیر سنگھ کے ہاتھ میں ہے (ہندوستان میں انگریزی کارخانے 1622-23 ص197)

34-اقبال نامہ ص195

35-واقعہ یہ ہے کہ آصف خان کا آگرہ بھیجا جانا محض مہابت خان کی خواہشات کے احترام میں تھا کیونکہ مہابت خان اس وقت تک دربار نہ آنا چاہتا تھا جب تک اس کا سخت دشمن آصف خان یہاں سے ہٹایا نہ جائے۔ معتمد خان کا قیاس ہے کہ نور جہان کا پہلا خیال یہ تھا کہ آصف خان سے متعلق آخری خبر کہ بادشاہ نے اس کو حکم دیا کہ خزانہ آگرہ ہٹا دیا جائے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو آصف خان اس پر اعتماد نہ تھا"۔ (ص59)

36-غالباً اعتبار خان کو آگرہ سے خزانہ ہٹانے سے منع کیا۔ اگرچہ اقبال نامہ اور

---

1. Della Valle. (2) Willoughby

معاصر جہانگیری دونوں میں احتیاطی اقدام کے لیے آصف خان کو حکم دیا جانا معتمد خان کے سپرد تھا، ملاحظہ ہو اقبال نامہ ص 199: معاصر جہانگیری ف 189 ب، ر، ب جلد 2، ص 248

37- ر، ب، ج 2، ص 246

38- اقبال نامہ ص 198

39- ر، ب، ج 2: اقبال نامہ ص 201، معاصر جہانگیری عبداللہ خان کے کردار کے صحیح ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہنشاہ و ملکہ دونوں سے اسے شکایت تھی ف (190 ب) صالح کہتا ہے کہ جہانگیر نے اس لیے یہ عہدہ عبداللہ خان کو دیا تھا کہ اس کو یہ علم نہ تھا کہ شہزادہ کے ہم خیال وہ سازش میں شریک ہے وہ اطلاعات میں تصرف کرتا ہے غلط باتوں کو صحیح بتا دیتا ہے (ج 1، ص 171) عبداللہ خان کو ہر برٹ اس وقت کا "ہوا پیا" کہتا ہے (ص 95)

40- ر، ب، ج 2، ص 254-55: اقبال نامہ میں قلیل معاملات ص 202-203 اور معاصر جہانگیری ف 191

41- ر، ب، ج 2، ص 258-59۔ اقبال نامہ ص 204

42- ر، ب، جلد 2، ص 259: اقبال نامہ ص 203

43- گوری شنکر ہیرا چند راوجھا "راجستھان کا اتہاس ص 824-25

44- اقبال نامہ ص 209: ر، ب، ج 2، ص 271-72

45- ربٹ، جلد 2، ص 274: اقبال نامہ ص 210: معاصر جہانگیری ف 194: معاصر الامراج ا ص 706۔

46- ر، ب، ج 2، ص 278

47- ر، ب، ج 2، ص 278-79

48- ایضاً

59- صالح ج 1، ص 177

50- ڈیلا ویل لکھتا ہے کہ "قطب شاہ نے اس کی امداد نہ کی۔ اس کے باپ کا ڈر تھا۔ نہ اس کو اپنی مملکت سے باہر کیا اپنی عزت کا بھی خیال تھا۔ بلکہ اس کو ایک ایسے قلیل خطہ زمین پر قابض ہونے کی مسرت حاصل کرنے دی۔ جہاں وہ پہنچ چکا تھا۔ (419): ٹامس اور جان ڈڈنیجو مسولی پٹنم سے سورت خطوط بھیجے ہیں ان میں انہوں نے وہ شرائط بیان کی ہیں جن کی بنا پر شاہجہاں کو گول کنڈہ میں آنے کی اجازت ملی تھی (ہندوستان میں انگریزی کارخانے) ص 313-15 تک قزوینی ف 106: اقبال نامہ ص 215 ر، ب ج 2، ص 291:

حدائقۃ السلاطین ف 229: فتوحات عادل شاہی ف 285-270

51- جہانگیر نے شاہجہاں کی اس نقل و حرکت کا مشاہدہ کیا۔ ر، ب، جلد 2، ص 280-281۔ صالح ج ا، ص 177-78

52- اقبال نامہ اس شخص کا نام زمیندار گردھر بتاتا ہے (ص 217)

53- صالح میں لکھا ہے کہ احمد بیگ نے شاہجہاں کا راستہ بند کر دیا۔ ایک لڑائی لڑا، ہار گیا۔ تب پسپا ہو کر بنگال گیا (ج ا، ص 179)

54- ر، ب، ج 3، ص 299: اقبال نامہ ص 218: صالح ا ص 180

55- قزوینی ف 106 ب: اقبال نامہ ص 219، ابراہیم خان اکبر نگر کے قلعہ میں پناہ گزیں نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنے لڑکے کے مقبرے میں پناہ لی۔ یہ جگہ مختصر تھی یہاں آسانی سے مدافعت ہو سکتی تھی۔

56- اس جنگ کے مفصل بیانات کے لیے دیکھے اقبال نامہ ص 219-22، معاصر جہانگیری ف 196 صالح ص 181-84؎ : قزوینی ف 106-107 ب

57- اقبال نامہ ص 222۔ معاصرین جہانگیری ب 198 ب

---

1. Bangham.

58- اقبال نامہ ص222 روہتاس کی مفصل روداد کے لیے دیکھئے قزوینی ف107

59- ر، ب، ج2، ص294

60- اقبال نامہ ص 232-34 جنگ کی مفصل روداد کے لیے دیکھئے معاصر جہانگیری ف202 ب205۔ قزوینی صرف یہ کہتا ہے کہ شاہجہاں اپنے مشیر کاروں کے مشورہ سے جون پور سے پسپا ہوا۔ صالح کا خیال ہے کہ اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ جو فوج اس کے باپ کے خلاف بھیجی ہے اس کا مقابلہ کرے، ج1، ص187

61- اقبال نامہ ص239

62- اقبال نامہ ص244

63- اقبال نامہ ص248-49

64- اقبال نامہ ص274۔ قزوینی دس لاکھ بتاتا ہے (ف109 ب)

65- اقبال نامہ ص245۔ معاصر جہانگیری کا کہنا ہے کہ وہ اس لیے برطرف کیا گیا کہ امراء دکن اس سے مطمئن نہ تھے (ب213)

66- بنکھم نے یہ لڑائی دیکھی تھی اس کا ایک مکمل بیان پیش کرتا ہے (ہندوستان انگریزی کارخانے) (1624-29) ص151-53 تک۔

67- فتوحات عادل شاہی ف293-95۔ حدلقیۃ السلاطین ف229

68- صالح ج1، ص193

69- عالم آرائے عباسی ف243 ب44۔ جامع الانشا: 211-14 جامع المرسلات ف214-16۔ جامع المرسلات ف228

70- عالم آرائے عباسی ف275 ب۔76: جامع الانشاء ف214-216 جامع المراسلات ف228

71- عالم آرائے عباسی ف275-76

72- اقبال الانشاء ف216-18: جامع المرسلات ف227

73-اقبال نامہ ص280

74-جامع المراسلات ف227

75-اقبال نامہ ص289: قزوینی ف 111 ب عصری بیان کے لیے ملاحظہ ہو خطوط صدر کیمرج بنام ایسٹ انڈیا کمپنی (ہندوستان میں انگریزی کارخانے (29-1624) ص205-204

76-اقبال نامہ ص 294۔ قزوینی ف 136 ب، شہریار سے نورجہاں کی بہی خواہی کے لیے ملاحظہ ہو (ہندوستان میں انگریزی کارخانے (29-1624) ص 72-171

77-اقبال نامہ ص294 قزوینی ف114

78-اقبال نامہ ص299: قزوینی ف 114: لاہوری کہتا ہے کہ چونکہ آصف خان نے بلاقی (داور بخش) کی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان شہزادوں کو اپنے پاس رکھے۔ اس لیے ان کو صادق خان کے سپرد کر دیا (ج1، ص72)

79-اقبال نامہ ص296-97: قزوینی ف115-17

80-اقبال نامہ ص294

81-اقبال نامہ ص294

82-اقبال نامہ ص298: قزوینی ف117 بمراۃ الاحمدی ف81ب

83-اقبال نامہ ص299: قزوینی ف118

84-اقبال نامہ ص300۔ قزوینی ف118 مرۃ الاحمدی ف82۔

85- قزوینی ف199: اقبال نامہ ص301

86- قزوینی ف120: اقبال نامہ ص303

87- قزوینی ف120 لاہوری کا بیان ہے کہ کرن سنگھ کو پنج ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار کا منصب دیا گیا۔ ج1، ص 8 گوری شنکر ہیرا چندر اوجھا کی

کتاب راجستھان کا اتہاس ص 828۔

88- قزوینی، لاہوری اور معتمد خان نے صاف صاف لکھا کہ جملہ پانچوں شہزادے شاہجہاں کے حکم سے قتل کیے گئے لیکن ایران کی تاریخی تحریروں میں اور بعض مغربی سیاحوں کے مراسلات میں ہم کو ایک عجیب قصہ نظر آتا ہے کہا جاتا ہے کہ بلاقی یاد اور بخش نے اپنی جگہ دوسرے شخص کو سپرد کر کے اپنی جان بچالی۔ (ظاہر وحید، ف 17 ب) جامع المرسلات میں شاہ کے دو خطوط سلطان بلاقی کے نام ہیں (ف 263) خلد برینڈ ف 259۔ب 161 ب: منڈلسکو[1] بھی قزوینی میں بلاقی کی موجودگی کی شہادت دیتا ہے۔ ص 119 ہربرٹ بھی یہی کہتا ہے۔ منوچی[2] (ج 1، ص 181) اور یورنیر (ج) ص 338) بھی یہی کہانی دہراتا ہے اور آخر الذکر یہ بھی لکھتا ہے کہ برنیر نے بلاقی کو دیکھا اس سے باتیں کیں ص 339) لیکن گووا کے وائسرائے نے جو خط بادشاہ فلپ کو لکھا ہے اس میں کہتا ہے کہ یہ شخص فریبی ہے (ہندوستان میں انگریزی کارخانے)(1630-33) ج 1 نمبر 1

89- تخت نشینی کے مفصل احوال کے لیے ملاحظہ ہو قزوینی ف 121-22: لاہوری ج 1، ص 82-99 لاہوری لکھتا ہے کہ شاہجہاں نے شہاب الدین کا لقب آصف خان کی تجویز سے اختیار کیا (ص 96)

---

1. Mandilsls (2) Manucci

باب 4

1- خان جہان کے بزرگوں اور اس کی ابتدائی زندگی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "مخزن افاغنہ": ر، ب، ج 1، ص 87-89: معاصر الامراء ج 1، ص 716-32 تک

2- ر، ب، ج 2، ص 260

3- اقبال نامہ ص 229-31: معاصر الامرا، ج 1 صفحات 675-93

4- اقبال نامہ ص 231

5- اقبال نامہ ص 245

6- اقبال نامہ ص 279

7- صرف معتمد خان رشوت کا ذکر کرتا ہے۔ دوسرے لوگ معہ قزوینی، لاہوری، نیز شاہنواز خان بھی اس بات پر خاموش ہیں۔ شاہنواز خان کہتا ہے کہ خان جہان نے جب یہ افواہ سنی کہ مہابت خان مانڈو پر چڑھ آیا ہے تو اس نے نظام الملک سے یارانہ کر لیا۔ (اقبال نامہ ص 284 قزوینی ف 118، لاہوری ج 1، ص 76: معاصر الامرا، ج، ح: ص 722)

8- خان جہان نے اپنے لڑکے کو بروچ دیا تھا اور اس صوبہ کی تمام جاگیروں میں حتیٰ کہ نریاد میں بھی بلاقی کے نام پر خطبہ پڑھا گیا۔ (ہندوستان میں انگریزی کارخانے ص 233)

9- معاصر الامرا،ج 1،ص 722

10- قزوینی ف 18، ہندوستان میں انگریزی کارخانے (1624-29) ص 241

11- قزوینی ف 118: لاہوری ج 1، ص 76

12- قزوینی 179 ب: لاہوی ج 1، ص 76

13- قزوینی ف 180: معاصر الامرا، نے لکھا ہے کہ خان جان نے شاہجہان کو موتیوں کا ایک ہار بھیجا (ج 1، ص 723)

14- لاہوری ج 1، ص 273

15- معاصر الامرا،ج 1، ص 723

16- معاصر الامرا ج،ج 1، ص 273

17- قزوینی ف 180 ب، 181: لاہوری صفحات 274-275

18- قزوینی ف 115 ب، لاہوری، ج 1، صفحات 73,72

19- جب خان جہان ہتھیاپل کے دروازے پر پہنچا تو اس نے بآواز بلند کہا اے خدا میں اپنی عزت بچانے کے لیے گریز کر رہا ہوں میرا کوئی ارادہ بغاوت کا نہیں (معاصر الامرا،ج 1، ص 725)

20- قزوینی صفحات 180-83: لاہوری، ج 1، صفحات 276 سے 80 تک

21- معاصر الامرا،ج 1، ص 726

22- قزوینی ف 192: لاہوری ج 1، صفحات 304-301: معاصر الامرا، نے خان جہان کی نیم ولی کا ایک پر لطف قصہ بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ جنگ کے دن خان جہان، آرام سے پالکی میں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس بات پر اس کے لڑکے عزیز نے اس سے کہا اگر آپ لڑنا چاہتے ہیں تو گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کیجئے اس سے کیا فائدہ کہ آپ ان لوگوں کی جان بلا وجہ لے رہے ہیں؟ خان جہاں نے جواب میں دریافت کیا کہ تم یہ سوچ سکتے ہو کہ ہم شاہی فوج سے جیت سکتے ہیں؟ خدا اس کی طرف ہے۔ میں ایک پر سکون

فضا اپنے رویہ سے پیدا کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم ایک موقع عروج کرنے کا پا جاؤ۔ اور میں چلا جاؤں (معاصر الامراء)(ج 1، صفحات 726-27)

23- قزوینی ف 200: لاہوری، ج 1، ص 321

24- قزوینی ف 200 ب۔ 202 ب: لاہوری ج 1، صفحات 322-26

25- قزوینی ف 202: لاہوری صفحات 326

26- قزوینی ف 207: لاہوری صفحات 234-35

27- لاہوری، ج 1، ص 236: قزوینی ف 207 ب

28- لاہوری، ج 1، صفحات 238-39 قزوینی ف 208-209 ب

29- لاہوری، ج: صفحات 248-52 قزوینی ب 216 ب 217 ب

30- معاصر الامراء، ج 2، صفحات 197-99: اس کے آباو اجداد کے لیے شیخ جلال حصاری کی تاریخ ملاحظہ ہو ف 137-39 ب اور چھتر پر کاش

31- شیخ جلال حصاری ف 139۔ ب

32- قزوینی ف 152: لاہوری، ج 1، ص 196

33- قزوینی ف 168 ب: لاہوری نے کوئی وجہ اس کے اچانک فرار ہونے کی نہیں لکھی (ج 1، ص 203) شیخ جلال متفق ہے قزوینی سے (ف۔ 140) معاصر الامراء، ج 2، ص 215

34- قزوینی و لاہوری جھجار کے تعاقب چھوڑنے کے لیے ہم زبان ہیں کہ شہنشاہ نے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دیا۔ قزوینی ف 168 ب: لاہوری صفحات 203-204

35- معاصر الامرا، ج 2، صفحات 212-41: قزوینی ف 169

36- قزوینی ف 169: لاہوری یہ نہیں کہتا کہ اسلام خان کا تقرر مہابت خان کے جوش کو معتدل کرنے کے لیے ہوا (ج 1، ص 24) شیخ الاسلام ف 140

37- معاصر الامرا، ج 2 صفحات 256-60

38- قزوینی ف 1772: صلح کی گفت و شنید لاہوری کے نزدیک اراج کی فتح کے بعد شروع ہوئی۔ (جلد 1، ص 246) اس ضمن میں شیخ جلال حصاری کا بیان تشنہ ہے۔

39- چتھر پرکاش، تعارف صفحات 109۔ شیام سندرداس نے بدقسمتی سے بندِمل کھنڈ کے دونوں حملوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔

40- قزوینی خاص طور پر مہابت خان کا نام نہیں لیتا ف (172) لیکن لاہوری نے واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ (ج 1، ص 246) شیخ جلال لاہوری سے متفق ہے۔

41- قزوینی ف لاہوری، ج 1، ص 254-255

42- لاہوری، ج 1، صفحات 296-303

43- لاہوری، ج 1، ص 405

44- قزوینی ف 343: لاہوری، ج 1 حصہ 2 ص 95: شیخ جلال ف 140

45- قزوینی ف 136 ب لاہوری، ج 1 حصہ 2، ص 95: شیخ جلال ف 141

46- خان جہان کے تعاقب کے سلسلے میں خدمات کے اعتراف میں وکرم جیت کو جگ راج کا خطاب عطا ہوا: قزوینی ف 209 لاہوری، ج 1، ص 399

47- طباطبائی کہتا ہے کہ اللہ وردی خان جو اس کی (جگ راج کی) راہ میں تھا اس نے بیشک اس کا پیچھا کیا۔ ف 137: لیکن قزوینی، لاہوری اور شیخ جلال مذکورہ بالا رائے سے متفق ہیں۔

48- وہ راجہ بھارت بندیلا کا لڑکا تھا اس کا انتقال 1633-34 میں ہوا: اس لیے سرداری کا حق دیبی سنگھ کو تفویض ہوا (معاصرالامرا، ج 2، صفحات 295-97)

49- جاریٹ، ج 1، ص 188

50- قزوینی ف 344، طباطبائی ف 137 ب: لاہوری، ج 1، ص 96

51- قزوینی ف348ب: لاہوری، ج1، حصہ2، صفحات98-99

52- لاہوری، ج1، حصہ2، ص99

53- لاہوری، ج1، حصہ صفحات 110-16: قزوینی ف 353 ب اور ف 357-59: شیخ جلال کا بیان صرف تسخیر دھامونی تک مفصل ہے کیونکہ اس کے بعد ہی اس کا سرپرست سید خان جہان جھجار سنگھ کے اس خزانہ کے برآمد کرنے پر تعینات کر دیا جو جنگل اور کنویں میں پوشیدہ تھا۔ لیکن چند الفاظ میں مصنف جھجار سنگھ کے زوال کا ذکر کرتا ہے۔

54- اس بندیلا مہم کے حالات قلم بند کرنے کے صلہ میں قزوینی کو شاہی مراعات حاصل ہوئے (ف110 اور ف355-56ب)

55- چھتر پرکاش صفحات10-11 معاصر الامراء میں باقی خان کا حال ملاحظہ ہو، ج ا، صفحات427-29 لاہوری ج2، ص136

56- بندیلوں کی خلل اندازی کے سلسلے میں مظفر بارہہ خان جہان کے خطوط ملاحظہ ہوں۔ حان جہان گولیار کا جیلر بھی تھا (ب1۔25) لاہوری ج2، ص136: چھتر پرکاش ص25

57- لاہوری، ج11، صفحات193-94

58- لاہوری، ج11، صفحات221 اور 247

59- لاہوری، ج1، ص247

60- لاہوری، ج2، صفحات 303-304۔ معاصر الامرا، ج2، صفحات57۔58، چھتر پرکاش صفحات30-31 پرگنہ کونچ چمپت کا عطا ہوا۔

61- چھتر پرکاش: صفحات31-32

62- ایضاً صفحات36-37

63- معاصر الامرا، ج2: صفحات157-60: ر، ب، ج1، ص49

Archeological surueg of sidio Aunual Report 1904-5 PP-20

64- معاصر الامرا، ج2، صفحات 176-179 اور صفحات 238-41 :ر،ب، ج2، صفحات 54-57 اور صفحات 74-75

65- شہریار اور شاہجہاں کی لڑائی میں جگت سنگھ آخرالذکر کی صرف سے لڑائی قزوینی ف116 ۔ لاہوری کا کہنا ہے کہ وہ آصف خان کے ساتھ آگرہ آیا اور تین ہزار ذات اور پانچ سو سوار کے منصب پر مستقل کر دیا گیا اور دسویں سال کے اختتام پر تین ہزار ذات اور دو ہزار سوار کی منصبداری پر برقرار تھا (ج1، ص183)

66- لاہوری، ج1، ص9، قزوینی ف307

67- لاہوری، ج1، حصہ 2، ص64، قزوینی ف334

68- لاہوری، ج2، ص13

69- قندھار واپس لینے میں اس نے حصہ لیا اور سعید خان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا (لاہوری، ج2، ص135)

70- لاہوری، ج2، ص144

71- لاہوری، ج2، ص190

72- لاہوری، ج2، صفحات 237-38

73- لاہوری، ج2، ص239۔ شیخ جلال ف128 ب، 130 ب

74- لاہوری، ج2، ص261 شیخ جلال ف130

75- لاہوری، ج2، صفحات 261-78 تک

76- شیخ جلال، ف135

77- شیخ جلال، ف135

78- عرض داشت، ف20، ب240

باب5

1- امپیریل گزیٹ آف انڈیا۔ ج 13 ص Compsoin 164 (بنگال میں پرتگالیوں کی تاریخ۔ باب 5 ڈن ورس لکھتا ہے کہ تخمیناً اس زمانے میں بنگال میں پرتگالیوں کے اثرات بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستان میں پرتگالی، ج ا، ص422)
2- طباطبائی ف11ب: قزوینی252: لاہوری، ج1، ص434
3- مان[1] ریکو، ج2، ص292 (کبرال کے خطوط)
4- مان ریکو، ج2، ص393
5- برنیر صفحات174-176 قزوینی252ب
6- ڈن ورس، ج2، ص246: قزوینی کی نظر ست گاؤں کے انحطاط پر ہے۔ (ف252)
7-مان ریکو، ج2، ص314
8- جے، کبرال[2] کے خطوط
9- ایضاً
10- جے، کبرال پرتگالیوں کی تاریخ کے احکام کے سلسلے میں شاہجہاں کی مذہبی معتقدات پر زور دیتا ہے۔ قزوینی (ف 252ب) اور لاہوری (ج 1

---

1. Manrique (2) J. Calral

صفحات 35-434) مذہبی جذبات کا اثر دوسرے درجہ پر لاتے ہیں۔ لیکن ان کا اثر سیاسی اہمیت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مگر ڈن ورس[1] غلط طریقہ پر سوچتا ہے کہ ہوگلی پر شاہ جہاں کا یہ حملہ دکنی شکست کی تلافی کے لیے تھا (ج 2، ص 247) کبرال کا بھی خیال ہے کہ مغلوں کی نظر بندیل کی دولت پر تھی۔ منوچی کی رائے میں اس حملہ کی وجہ ممتاز محل کا سخت اصرار تھا۔

11- قزوینی ف 252 ب 53۔ لاہوری ج 1 صفحات 36-435۔ کبرال، قاسم خان کو بادشاہ کا قابل قدر دوست سمجھتا تھا۔ قزوینی اور لاہوری کی طرح وہ بھی کہتا ہے کہ قاسم خان ضرب لگانے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھا (مان ریکو، ج 2 ص 396) یہ تعداد مان ریکو کی بتائی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حفاظت کرنے والوں کی تعداد 180 پرتگال اور 600 غلاموں کی تھی۔ لیکن حملہ آوروں کی نظروں میں اتنی زیادہ تھی کہ وہ حملہ کرنے کے پہلے انہوں نے محافظ کو حفاظت ترک کرنے پر اصرار کیا بہت سے وعدے روپیہ کی لالچ دیتے رہے (ج 2 ص 333) ڈن ورس کی رائے میں پرتگالیوں کی تعداد دو سو تھی۔ (ج 2، صفحات 247-48)

13- اس مصالحت کا بیان جے کبرال کے خطوط پر مبنی ہے

14- قزوینی 253

15- برنیر صفحات 176-77: مان ریکو، ج 2، ص 325: صفحات 331-33: ص 336۔ اور صفحات 336-39: منوچی ج 1، ص 183

16- قزوینی ف 413 ب

17- قزوینی ف 306

18- قزوینی ف 413-17 لاہوری، ج 1، صفحات 281-89

19- بھٹا چاریہ کی تصنیف شمالی و مشرقی سرحدوں کی مغلیہ پالیسی (The

---

1. Danvers

(Moghul North East Frontier Policy) صفحات 25-96

: لاہوری، ج 2، صفحات 64-90

20- قزوینی ف 407-8 ب: لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 271-74

21- قزوینی ف 299 ب۔ 340: لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 74-76

22- لاہوری، ج 2، صفحات 356-61: ج 1، س۔ ب 1871، صفحات 111-24

23- قزوینی ف 259: لاہوری، ج 1، صفحات 449-50

24- لاہوری، ج 2، صفحات 370-72

25- ر۔ ب، ج 1، ص 218

26- لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 90-930

27- وارث ف 142 ب 143 ب

28- وارث ف 157، اور ف 159 ب

29- معاصر الامرا، ج 2، صفحات 246-47

30- لاہوری، ج 1، صفحات 190-91: قزوینی، ف 155 ب 56

31- لاہوری، ج 1، صفحات 311-13: ف 195 ب 197

32- لاہوری، ج 2، صفحات 12-14

33- لاہوی، ج 2، ص 222

34- وارث، ف 67 ب

35- قزوینی ف 387: لاہوری، ج 1، حصہ 2، ص 206۔ صدور الٹس ٹیل نے جو خطوط سورت سے ایران روانہ کیے (مئی 13 / 1631ء) ان میں اس افواہ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ بائنگر نے شاہجہاں کی مغربی سرحدوں پر تاتاریوں کے حکمران سے مل کر حملہ کر دیا۔ ہندوستان میں انگریزی کارخانے (1630-33) ص 160۔ بائنگر کے لیے ملاحظہ ہو۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی اردو اور 1869ء ص 218۔

باب 6

1- برہان معاصر، ص19: فرشتہ، ج11، ص96
2- فرشتہ، ج2، ص105
3- برہان اول نے راستی خان کو ہمایوں کی خدمت میں اس التماس کے لیے بھیجا کہ ہمایوں دکنی بادشاہوں کے جتھا کے خلاف اس کی امداد کرے (فرشتہ، ج11، ص116)
4- آ۔ن، ج111، ص108: بدایونی، ج11 (لوہے) ص74
5- برہان اول نے بہادر شاہ کے نام کا خط پڑھا۔ (فرشتہ جلد2، ص107)
6- ابوالفضل رقم طراز ہے کہ بہ مطابق اصول شہنشاہ کہ دور طلب معاملات کو کمتر معاملات پر ترجیح دی جائے تسخیر دکن میں تاخیر کی گئی اور اس کی ساری توجہ مشرقی صوبجات پر قبضہ کرنے اور وہاں کے باغیوں کی سر کوبی پر ہوئی۔ (آ۔ن، ج111، ص109)
7- سی، بی اول: ہندوستان میں آریہ حکومت باب 2۔
8- برہان معاصر، ص109
9- فرشتہ، ج2 فتوحات عادل شاہی (ف 183) تذکرۃ الملوک (ف 135 ب) دونوں کا کہنا ہے کہ برہان اول سے پہلے بیجاپور میں پناہ لی۔
10- ا۔ن، ج111، صفحات 909-182

11-ا-ن، ج111، صفحات145-48
12-یہ سلیم کی بغاوت تھی۔
13-ملک عنبر کے عروج کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الملوک، ف 234-8:
فتوحات عادل شاہی، ف666، ب72
14-فتوحات عادل شاہی، ف294، اور325۔
15-فتوحات عادل شاہی325
16-فتوحات عادل شاہی، ف325: اقبال نامہ، ص283
17-اقبال نامہ خص284
18-لاہوری، ج1، ص199
19- قزوینی، ف175: لاہوری، ج1، ص(257
20- قزوینی، ف189، لاہوی، ج1، صفحات293-294
21-لاہوری، ج1، ص293
22- قزوینی، ف194: لاہوری، ج1، ص310
23- قزوینی، ف194: لاہوری، ج1، صفحات339-43
24-رندولا خان نے شاہجہاں کی نیک نیتی بجانب عادل شاہ کے ثبوت میں دھار ور کا مطالبہ کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے قزوینی، ف211ب: لاہوری، 1، صفحات44۔46
25-لاہوری، ج1، ص356
26- قزوینی213ب: لاہوری یہ نہیں لکھتا کہ اعظم نے یہ اقدام آصف خان کو تجویز پر کیا۔ (س۔ف لاہوری، ج1، ص356)
27- قزوینی، ف214
28- قزوینی، ف214 لاہوری، ج1، صفحات 357-58
29- قزوینی، ف214ب15: لاہوری، ج1، صفحات358-60

30- قزوینی، ف 216، اور ف 227-28 ب: لاہوری، ج 1، صفحات 77-374

31- قزوینی، ف 223۔ لاہوری، ج 1، ص 367

32- فتوحات عادل شاہی، ف 325 ب

33- قزوینی، ف 228-29 ب: لاہوری، ج 1، صفحات 378-79

34- قزوینی، ف 238 ب: لاہوری، ج 1، ص 402: فتوحات عادل شاہی، ف 224 ب 25: حدیقۃ السلاطین، ف 243 ب 244: طباطبائی، ف 4 ب

35- لاہوری، ج 1، ص 402: قزوینی، ف 239

36- لاہوری، ج 1، صفحات 409-10: قزوینی، ف 241: ف 244 ب 45

37- لاہوری، ج 1، ص 422: قزوینی 247: حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے کہ فتح خان سپردگی کے بعد پنج ہزاری بنادیا گیا یعنی 5000 کا سپہ سالار (ف 249 اور ف 250 ب)

38- قزوینی (ب 248) فتوحات عادل شاہی میں لکھا ہے کہ جب شہنشاہ نے اللہ وردی خان کو بیجاپور بھیجا کہ آصف خان کو بلا لائے اور اس کی بھی اطلاع کر دے کہ دکن میں نائب سلطان کا عہدہ دیا جانے والا ہے تو آخر الذکر نے قاصد سے بطور راز یہ کہا کہ "میں اپنی ملتان اور لاہور کی جاگیر بلکہ شہنشاہ مجھے اور جو کچھ عطا کرنے کے خیال میں ہوں سب سے باز دعویٰ دینے کو تیار ہوں لیکن میں دربار سے دور نہیں رہنا چاہتا" جب اللہ وردی خان نے شاہجہاں کو اس بات کی اطلاع دی تو اس نے اپنے احکام منسوخ کر کے مہابت خان کو بحیثیت نائب سلطان مقرر کیا (فتوحات ف 324) لاہوری کا کہنا ہے کہ مہابت خان کا تقرر اعظم خان کی نااہلی کی وجہ سے ہوا۔ (ج 1، ص 274)

39- لاہوری، ج 1، ص 422: قزوینی ف 247

40- قزوینی ف 255-56: لاہوری، ج 1، ص 441-44

41- قزوینی ف 278 ب: لاہوری، ج 1، ص 497

42- ایضاً

43- قزوینی ف 279-99: لاہوری، ج 1، صفحات 496-531

44- لاہوری، ج 1، ص 532: قزوینی ف 98 ب

45- ایضاً

46- قزوینی ف 299-203: لاہوری، ج 1، صفحات 533-540

47- لاہوری، ج 1، حصہ 2، ص 33: قزوینی ف 319

48- معاصر الامراء، ج 1، صفحات 279-85

49- معاصر الامراء، ج 1، صفحات 207-51

50- قزوینی ف 336-37: لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 68-70

51- لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 104-105: قزوینی ف 349 ب 50

52- لاہوری، ج 1، حصہ 2، ص 130

53- لاہوری، ج 1، حصہ 2، ص 135

54- لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 135-36: قزوینی ف 363-164

56- لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 217-21: قزوینی ف 891-92 ب

57- لاہوری، ج 1، حصہ 2، فصحات 202-205 قزوینی 358-86 ب

58- لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 217-21 قزوینی ف 391-92 ب

59- لاہوری، ج 1، حصہ 2، صفحات 225-30 قزوینی ف 393- ب 97 ب

سرکار[1] اورنگ زیب، ج 1، ص 48۔ کنکیڈ و پاراسنس مرہٹہ قوم کی تاریخ، ج ا، صفحات 117-21

60- سرکار تاریخ اورنگ زیب، ج 1، ص 41

1. J N. Sarker: History of Aurangabad

61- سرکار تاریخ اورنگ زیب، ج1، صفحات 49-52
62- سرکار تاریخ اورنگ زیب، ج1، صفحات 191-94۔ معاصر الامراء، ج3، صفحات 493-500

باب 7

1- ا۔ن، ج 3، ص 88

2- فرشتہ، ج 2، ص 47

3- ا۔ن، ج 3، ص 1171

4- ا۔ن، ج 3، ص 1239: تذکرۃ الملک ف 225 ب 227: فتوحات عادل شاہی ف 250

5- فتوحات میں ہے کہ احمد نگر کی تسخیر کے بعد ملک عنبر کافی عرصہ تک بیجاپور میں رہا (ف 261 ب)

6- فتوحات ف 287-59: بینی پرشاد تاریخ جہانگیر ص 387

7- فتوحات ف 287-59: ص 389-90: فتوحات عادل شاہی ف 286 ب 294

8- ایضاً

9- فتوحات عادل شاہی ف 294

10- ایضاً ف 297 ب اور ف 315، بساطین السلاطین ف 41

11- ایضاً ف 415-19

12- ایضاً ایضاً، 321-21

13- ایضاً ف 321 قزوینی ف 213 ب: لاہوری، ج 1، ص 356

14- بساطین السلاطین ف45(ب)

15- ملاحظہ ہو باب[6] ن24

16- قزوینی212ب

17- ایضاً213:لاہوری، ج1، ص255

18- قزوینی ف213ب لاہوری، ج1، ص358

19- لاہوری، ج1، ص379: قزوینی ف213ب بساطین السلاطین میں لکھا ہے کہ معین الدین اس لیے روک لیا گیا تھا کہ مغلوں نے خلاف معاہدہ بیجا پور، دھارور پر حملہ کر دیا تھا(ب46): حدیقۃ میں ہے کہ سفیر اس لیے روکا گیا تھا کہ شاہ پرستوں نے سرحد بیجاپور پر غارت گری کی اور قطب شاہ نے معین الدین کے لیے روپیہ بھیجا(ب242ب)

20- قزوینی ف229ب:لاہوری، ج1، ص379

21- ایضاً ف230:ایضاً، ج1، ص380-81

22- لاہوری، ص411-13: قزوینی ف242

23- قزوینی ف242ب

24- ایضاً ایضاً:لاہوری، ج1، ص413حدیقۃ السلاطین ف249

25- ایضاً

26- قزوینی ف243ب۔لاہوری، ج1، ص414

27- فتوحات عادل شاہی ف323ب: حدیقۃ السلاطین ف249

28- قزوینی ب۔44:لاہوی، ج1، صفحات 414-16:فتوحات عادل شاہی ف323ب

29- ایضاً

30- ایضاً

31- ایضاً

32-ایضاً

33-لاہوری، ج1، ص416: قزوینی ف، ف244

34-دیکھو، ن28

35-فتوحات میں ہے کہ آصف خان کی ناکامیابی پر شاہجہاں بہت برافروختہ ہوا لیکن آصف خان نے قیمتی تحائف نذر کر کے راضی کر لیا۔(ف324)

36-بساطین میں لکھا ہے کہ مراری پنڈت نے مغل فوج کا پیچھا کیا(ب46)

37-ملاحظہ ہو باب[6] ن47

38-لاہوری، ج1، ص537: قزوینی ف300

39- قزوینی ف300ب۔301: لاہوری، ج1، ص537-36

40-لاہوری، ج1، حصہ2، ص34: قزوینی ف319ب

41-لاہوری، ج1، حصہ2، ص35: ایضاً ایضاً ب20

42-ایضاً ایضاً

43-لاہوری، ج1، حصہ2، ص36: قزوینی ف321

44-ایضاً

45- قزوینی ف320ب: لاہوری، ج1، حصہ2، صفحات36-39

46-ایضاً

47- قزوینی ف321-22: لاہوری، ج1، حصہ2، صفحات42,39

48-لاہوری، ج1، حصہ2، ص45: قزوینی ف334

49- قزوینی ف324-35: لاہوری، ج حصہ2، ش45

50-ایضاً

51-ایضاً

52-لاہوری1 حصہ2، ص47: قزوینی ف325ف

53- قزوینی (ف232ب) اور لاہوری (صفحات59۔ج1، حصہ2) نے مختصر

سا تذکرہ مہابت کی موت کا کیا ہے آخر الذکر معتمد خان کے اس قطعہٗ تاریخ کا حوالہ دیتا ہے۔"امن بحال ہو"اس عظیم سپہ سالار کی سوانح عمری کے لیے ملاحظہ ہو معاصر الامراء، ج۱، ص 385۔ 407 حدیقۃ السلاطین ف265-66: فتوحات عادل شاہی ف322-34ب

54- فتوحات عادل شاہی ف322-34ب

55- ایضاً ف331 لیکن قزوینی (ف355) اور لاہوری (ج حصہ 2 ص118) کا کہنا ہے کہ دربار میں اس کا استقبال گرمجوشی سے ہوا یہاں تک کہ شاہجہاں نے بھی اعزاز بخشا۔

56- لاہوری، ج1، صفحات126-30

57- فتوحات عادل شاہی ف 335-41 حدیقۃ السلاطین کے بموجب عبداللہ قطب شاہ نے بھی غواص خان کے زوال و موت میں حصہ لیا (ف 267 ب70)

58- لاہوری، ج1، حصہ 2، ص144: قزوینی ف368

59- قزوینی ف367ب: لاہوری، ج1، حصہ 2، ص143

60- ایضاً368: لاہوری، ج1، حصہ 2، ص144

61- ان سپہ سالاروں کی نقل و حرکت کے لیے دیکھیے قزوینی ف371-77: لاہوری ج1، حصہ صفحات151-65

62- ان لوگوں کے نام یہ ہیں شاہ اور، شیخ دبیر، قاضی ابو سعید اور میر ابوالحسن

63- فتوحات عادل شاہی، ف348ب

64- قزوینی ف 381-83 ب: لاہوری، ج1، حصہ 2، صفحات 267-47: فتوحات عادل شاہی ف349-51

65- فتوحات عادل شاہی ف399-400ب لاہوری نے صرف میر رجب کی آمد اور مظفر حسین کے ہمراہ اس کا جانا بیان کیا ہے۔ (ج2 صفحات

(336-335

66-سرکار "تاریخ اورنگ زیب" ج1، ص255

67-سرکار "تاریخ اورنگ زیب" ج1، ص255

68-ایضاً ص256

69-ایضاً ص256-58

70-ایضاً ص262

71-تاریخ محمد قطب شاہی کا کہنا ہے کہ احمد بحری اور عادل خان کے ایما سے قطب الملک نے آزادی اختیار کی (ف25)

72-اکبر نامہ، ج3، صفحات940-1171,909، اور1256

73-بنی پرشاد، تاریخ جہانگیر ص335

74-حدیقۃ السلاطین ف209

75-حدیقت ف211

76-حدیقت ف231

77-قزوینی ف 222 ب: حدیقت: حدیقت ف 237: لاہوری، ج1، صفحات 67-366

78-حدیقت ف249ب

79-حدیقۃ ف 237 ب 39: قزوینی ف 206-7: لاہوری، ج1، صفحات 34-332

80-حدیقت ف249ب

81-ایضاً ف250-51

82-ایضاً ف251-53

83-ایضاً ف264ب

84-ایضاً ف268-70

85- ف272: لاہوری، ج1، حصہ 2، ص139

86- تاریخ محمد قطب شاہی (ایڈیشنل 6542) ف167-8

87- قزوینی ف361ب، 2ب

88- حدیقت ف272

89- ایضاً، قزوینی ف367

90- قزوینی ف368۔ حدیقت ف272ف

91- حدیقت ف273

92- حدیقت میں لکھا ہے کہ مغل سفیر نے یہ فوجی تیاریاں دیکھ کر اپنے آقا کو مشورہ دیا کہ وہ عبداللہ کے پیش کردہ تحائف پر اکتفا کرے۔ (ف273ب)

93- حدیقت ف274

94- حدیقت ف274ب

95- قزوینی ف368: 382ف83ب، حدیقت ف272-77

96- قزوینی ف388ب: لاہوری، ج1، حصہ 2، ص210

97- لاہوری، ج1، حصہ 2، صفحات 210-11

98- حدیقت ف285

99- ایضاً ف284ب

100- حدیقہ ف285-86

101- مراسلات قطب شاہی ب301

102- عصری مراسلات بالخصوص خطوط عبداللہ مشمولہ مراسلات قطب شاہی سے ہم ان جھگڑوں کے متعلق بڑی واضح رائے قائم کر سکتے ہیں۔

103- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سرکار کی تصنیف تاریخ اورنگ زیب، ج ا، باب10

باب 8

1- رش[1] برک ویلمس "سولہویں صدی کا ایک معمار سلطنت" ص 102
2- ر۔ب، ج 1، ص 89
3- لاہوری کہتا ہے کہ متشر خان کے ملک پر روسیوں کے قبضہ کر لینے کے بعد یار محمد ماوراالنہر یا (ج 1، ص 217) دہمیرے کی تصنیف تاریخ بخارا ص 305
4- دسمبر[2] ص 305: ہاور تھ[3] کی تاریخ منگول، ج 2 حصہ ص 344
5- قزوینی ف 162
6- قزوینی ب 150، اور 151۔ لاہوری، ج 1، ص 193
7- ملاحظہ ہو باب[6]
8- قزوینی ف 155-58: لاہوری، ج 1، صفحات 206-15
9- قزوینی ف 165-67 ب: لاہوری، ج 1، صفحات 231-15
10- قزوینی ف 176 ب ایضاً 360-61
11- ایضاً 251 ب ایضاً ص 431
12- ایضاً 265 ایضاً صفحات 465-72

---

1. Ruskbrook Willisms: An Empire builder of the sixtunth century.
2. Vambary (3) Howarth

13-لاہوری، ج 1، ص139

14-لاہوری، ج2، ص154

15-لاہوری، ج ۲ صفحات 252-56: نظر محمد نے جو برتاؤ امام قلی کے ساتھ کیا اس کی مشابہت طاہر وحید نے برداران یوسف (ف 26) کے سلوک سے دی ہے۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ اس نے شاہ سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ امام قلی کی امداد سے گریز کرے لیکن درخواست نامنظور ہوئی (ف16) خلد بریں میں بھی یہی بیان امام قلی کے زوال کا ملتا ہے (ف 165-68) ولی قلی شاہ بھی امام قلی کے ایران پہنچنے اور اس کے خیر مقدم کیے جانے کا ذکر کرتا ہے (49)

16-لاہوری، ج2 صفحات536-56

17-ایضاً ص416

18-ایضاً صفحات456-58

19-اس رائے کی تائید ایرانی مؤرخ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو خلد بریں ف 183: طاہر وحید ف56ب: قصص ف52ب

20-لاہوری، ج2 ص479

21-ایضاً صفحات530-32

22-ایضاً ص 502

23-ایضاً صفحات 520-25

24-ایضاً صفحات 525-55

25-ایضاً صفحات556-65

26-ایضاً ص 492

27-ایضاً صفحات 572-77

28-ایضاً صفحات 458-462:24:613

29-اورنگ زیب کی بلخ کی مہم کے لیے ملاحظہ ہو "سرکار کی تاریخ اورنگ زیب"
ج1، باب5

باب 9

1- برنیر ص128
2- راش برک ولیمس "سولہویں صدی کا ایک معمار سلطنت" صفحات 119-117
3- ونسنٹ اسمتھ "اکبر مغل اعظم" ص258
4- ر۔ب، ج2، صفحات 240-42
5- عالم آرائے عباسی، ف416 (معہ 684,16)
6- جامع المراسلات ف 229: قزوینی ف 176ب 77۔لاہوری، ج، صفحات 261-62
7- ایضاً ف252ب53
8- قزوینی ف 183 ب 87: لاہوری، ج 1، صفحات 281-87: جامع المراسلات ف252
9- خلد بریں ف39
10- قزوینی ف219ب: لاہوری، ج1، صفحات 361-62
11- قزوینی ف249-50: ایضاً ص441
12- ایضاً 245ب 460ب ایضاً صفحات 410-21 خلد بریں ف40-41ب
13- ایضاً 269ب اور 107

14- خلد بریں ف 90 اور 107

15- ساکس[1] تاریخ ایران، ج 2، صفحات 210-11

16- ان جھگڑوں کے لیے ملاحظہ ہو قصص الخاقانی مصنفہ ولی قلی شاملو

17- لاہوری، ج ا، حصہ 2، صفحات 57-66، خلد بریں ف 114

18- بہار سخن ف 45

19- خلد بریں میں علی مردان کی فہرست الزامات دی ہوئی ہے (ف 114-116 ب) : طاہر وحید کہتا ہے کہ علی مردان کے شبہات بے بنیاد تھے (ف 236) ولی قلی شاملو، ظاہر وحید کی اس رائے سے متفق ہے۔ ف 43 اور 73: برنیر کہتا ہے کہ قندھار کی سپردگی علی مردان خان کی دغابازی کا نتیجہ تھی۔ دربار ایران میں اس کے بہت سے مخالف تھے وہاں جاکر اپنے انتظام کی کارگزاری بیان کرنے سے وہ خائف تھا (ص 184)

20- لاہوری، ج 2 ص 32

21- لاہوری، ج 2، ص 32 ولی قلی شاملو نے اس کا نام مشہد علی بتایا ہے (ف 44)

22- قصص ف 44

23- لاہوری، ج 2، ص 35۔ طاہر وحید کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ شہنشاہ ہند نے قندھار کے انتظامات سنبھالنے کے لیے صفدر خان کو بھیجا (ف 24)

24- لاہوری، ج 2، صفحات 24-54 خلد بریں میں اس جنگ کا تذکرہ صرف ایک جملہ میں ختم کردیا گیا ہے۔

25- جامع المراسلات ف 253 ب 54۔ قصص ف 43: لاہوری، ج 2، ص 93

26- لاہوری، ج 2، ص 49: طاہر وحید کا کہنا ہے کہ شاہ ایران نے رستم خان کے نام احکام جاری کیے، کہ خراسان میں فوج اکٹھا کی جائے لیکن اس کا انتقال ہوگیا (24) ف

1. Sykes

27-جامع المراسلات،ف254ب

28-لاہوری،ج2، ص125

29-طاہر وحید کہتا ہے کہ یہ مہم اس لیے ترک کر دی گئی کہ دارا واپس آ گیا تھا (ف24)لاہوری،ج2، ص129

30-لاہوری،ج2، صفحات492۔500:طاہر وحید ف61-64:قصص ف54

31-جامع الانشاء ف122ب۔126ب

32-طاہر وحید ف48-49

33-لاہوری جلد2 صفحات595-602

34-قصص میں لکھا ہے کہ یہ سفیر سلطان ابراہیم کی نیک خواہشات، مجوزہ قندھار مہم کے لیے کرایا[4] (ف55)

35-منشات طاہر وحید ف25-26

36-وارث ف411-13

37-تفصیل کے لیے دیکھیے قصص الخاقانی مصنفہ ولی قلی شاملو

38-دیکھیے سر کار کی تاریخ اورنگ زیب،ج1، باب8,7

39-وارث ف463-65 (معہ6556) دارا کی مہم کی تفصیلات کے لیے قصص الخاقانی اور لطیف الاخبار ملاحظہ ہو۔

40-منشات طاہر وحید ف7،اور11ب۔12ب

41-ایضاًف3،ب4ب

باب 10

1- ہندوستان کی دولت کے بیان کے لیے دیکھیے منڈلسلو ص 118: منوچی، ج 1، ص 206: برنیر ص 202 مانریکو کہتا ہے کہ ہر شہر میں خزانے تھے اس نے ایک ایسا ہی خزانہ راج محل میں دیکھا تھا۔ ج 2، ص 274: ٹرنیور، ج 1۔ باب 8 اور 10: لاہوری، ج 2، صفحات 713-14 محمد صادق ف 108: سرکار ہندوستان کے مغلیہ کا مطالعہ، (صفحات 16-20) وہ ایک مستند بیان پیش کرتا ہے۔

2- سرکار، تاریخ مغلیہ ہندوستان، ص 15

3- روزانہ کاروبار کا بیان قزوینی۔ لاہوری اور چندر بان دوسرا چمن ملاحظہ ہو۔ منوچی مشورے کے لیے غسل خانہ کا حوالہ دیتا ہے۔ ج 2، صفحات 462-63 مغربی سیاح عام انداز میں مغل شہنشاہ کی روزانہ کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہیں۔

4- یہ ایک قسم کی ہوادار کھڑکی تھی۔

5- اکبر و جہاں گیر کے عہد حکومت میں اس کا نام غسل خانہ تھا۔ لیکن شاہجہاں نے اس کا نام دولت خانہ خاص کر دیا، لاہوری، ج 2 ص 320

6- ٹیورنیر، ج ا، صفحات 105-109

7- وارث ف 17-23

8- قزوینی شاہ برج میں خود اپنے معاملات پیش کرنے جایا کرتا ہے ف 141

9- اس کا بھائی طالب اس سے بیحد مانوس تھا وہ ایران سے آگرہ آئی۔ براون، تاریخ ادب ایران، (1500-1924) ص 255

10- منوچی کا کہنا ہے کہ یہ خاموشی تعجب خیز تھی اور حکم الجھاؤ سے بری تھا۔

11- لاہوری، ج 1، ص 110-112۔ ایسے دوسرے احکام ہیں یہ بھی شامل تھا کہ الہی سنہ کی جگہ ہجری لکھا جائے (لاہوی، ج، صفحات 126-29) اور پگڑی میں شہنشاہ کی تصویر نہ رکھی جائے (محمد صادق ف 7)

12- چار تسلیم ایک طریقہ سلام کرنے کا تھا جس میں آدمی جھک کر اپنی پیشانی آنکھ اور بازو چھوتا تھا۔

13- منڈ لسلو ص 118

14- برنیر صفحات 288-69: منوچی، ج 2، صفحات 348-49: مان ریکو ج 2 صفحات 348-49: مان ریکو، ج 2، صفحات 200-4 ٹیونیر، ج:، صفحات 81-376

15- لاہوری، ج 1، حصہ 2 صفحات 78-81: برنیر کہتا ہے کہ طاؤس کی تعمیر ایک فرانسیسی دانشور نے کی تھی۔ ص 269: ہفت تخت کا بیان مصنفہ ٹیور نیر، ج 1، صفحات 381-87: مان ریکو، ج 2، صفحات 198-19

16- محمد صادق نے طبقات شاہجہاں میں لکھا ہے کہ میر شمس الدین خلجانی کو آگرہ کے ایک اسکول میں شاہجہاں نے بہ حیثیت مدرس مقرر کیا (ف 320) پھر حافظ محمد خیال کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ دہلی کے عظیم ترین علماء میں سے تھا (ف 324) ف 295 ف 294 بھی ملاحظہ ہوں۔

17- محمد صادق کی تصنیف طبقات کے اس پہلو کی تائید ڈلاویل کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو اس ایک دیہاتی اسکول کے سلسلے میں لکھا ہے صفحات 227-280: بینی پرشاد کا تبصرہ ان کے اس مضمون میں ملاحظہ ہو جس کا

عنوان ہے "تعلیم و ادب مغلوں میں" یہ مضمون اس روداد میں ہے جو (Indian Historical Record Commission) کی روداد مورخہ 1923ء ص 49 میں شامل ہے۔

18- منوچی کا بیان ہے کہ لاہور میں کثیر التعداد دانشوروں کا اجتماع تھا ج 2، ص 424

19- لاہوری، ج 1 حصہ 2 ص 55

20- ملاحظہ ہو آئین، صفحات 201-202

21- چندر بھان نے اپنی تصنیف چمن میں علمی وادبی تحریکات کا ذکر کیا ہے۔

22- موازنہ کیجیے ڈیلا ویل کے اس بیان سے کہ "تعجب کی بات نہیں کہ ہندوستان کے مغلیہ ممالک میں فارسی زبان کا زیادہ رواج تھا بہ نسبت دیسی زبانوں کے ص 96"

23- صالح ف 702 ب: معاصر الامراء، ج 1، صفحات 405-408

24- طبقات ف 322: صالح ف 698 ایک تبصرہ 687: براؤن (1500-1924) صفحات 258-59 شبلی حصہ 3 صفحات 185-208

25- طبقات ف 324 ب: صالح ف 696-97: ریو (Rieu) ص 694

26- ریو (Rieu) 1852 ص 1001

27- ایضاً ایضاً 292: براؤن (1500-1924) صفحات 265-76

28- صالح ف 703 ریو، ص 738

29- ایضاً ف 697-90507 نمبر 1573

30- ایضاً ف 704

31- طبقات ف 324 ب 325

32- صالح ف 710

33- طبقات ف 322: صالح 998-99

34-چندر بھان نے اپنی سوانح عمری کا ذکر چوتھے چمن میں کیا ہے، ب۔م معہ
16963: صالح ف707
35-طبقات ف321: صالح ف710
36-ایضاً ف223ب
37-ایضاً ف327ب
38-صالح705ب
39-اس کا مصنف جلال الدین طباطبائی تھا۔ ملاحظہ ہو بنی پرشاد، ن18ص317
40-جے سنگھ کے بہت سے خطوط جامع الانشاء میں بھی نقل کیے گیے ہیں ب۔م
170352
41-طبقات فالح ف691ب692ارز ص708
42-صالح ف692اور ف708
43-ایضاً ب ایضاً
44-ایضاً ف689ب۔690اور ف709
45-ایضاً ف710
46-.M.U ج1، ص587-90
47-ریو معہ1685
48-ایضاً صفحات178-79
49-ایضاً ایضاً
50-ایضاً معہ5555، معہ5556، معہ5554۔1، ل نمبر2226
51-فارکوہر[1] ہندوستان کے مذہبی ادب کا خاکہ ص287: ریو معہ18404:
اول نمبر1949اور1972
52-ا۔ا، ل نمبر45

1. Farquhar: out line of the Religious Literature of India

53-ایضاً 1990

54-ایضاً معہ 224

55-ریو، معہ 16670

56-منوچی، ج 2، صفحات 255-56۔ اس نے اطباء کے نام کی فہرست دی ہے۔

57-صالح ف 695 ب.M.U ج 3 صفحات 923-36

58-ایضاً ف 695 ب 696

59-ایضاً ف 695

60-.M.U صفحات 577-79

61-لاہوری، ج 1، ص 316

62-طبقات ف 330 ب:37253:507 و نمبر 2254

63-ریو معہ 16744

64-ایضاً معہ 16869

65-صالح ف 694

66-ایضاً ف 694 ب

67-طبقات ف 32

68-ایضاً ف 319

69-ایضاً ف 321

70-صالح 693 ب

71-طبقات ف 318 ب

72-صالح ف 668

73-طبقات ف 314

74-صالح ف 681 ب-82

75-طبقات ف313ب: صالح ف683-84

76-ایضاً308-11: صالح ف691ب

77-مسرا بندو، ونود، ج2 صفحات 454-55 ہندی سد ساگر، ج4، اختتام، ص129

78-مسرا بندو، ونود، ج2 صفحات 457-59: ہندی سد ساگر، ج4، اختتام، ص133

79-مسرا بندو، ونود، ج2 صفحات453-54

80-ملاحظہ ہو رام بابو سکسینہ کا تبصرہ ان کی تصنیف تاریخ ادب اردو ص12

81-فارگیوسن[1] ہندوستانی اور ایشیائی تعمیر کی تاریخ، ص 286: اسمتھ "تاریخ فنون لطیفہ" صفحات172، اور180

82-ہادل[2] ہندوستانی تعمیرات باب6

83-اس محکمہ کا ایک داروغہ تعمیرات ہوتا تھا جو سرکاری عمارتوں کا ذمہ دار تھا۔ ایک زمانہ میں مکرانت خان اس عہدے پر مامور تھا۔

84-ملاحظہ ہو سید محمد لطیف کی تصنیف آگرہ تاریخی ومحاکاتی۔ صفحات74-5

85-ایضاً ص82

86-ایضاً ص86

87-ایضاً صفحات90-94: فارگیوسن صفحات317-18

88-لاہوری، ج1 حصہ 2، ص 252: فارگوسن صفحات 318-20: لطیف صفحات184-88 قزوینی ف406

89-ہادل: ہندوستانی تعمیرات، ص29

90-ملاحظہ ہو ہادل کی مذکورہ بالا تصنیف باب2: لطیف صفحات100-23، فارگو

---

1. Fergusson History of Indian and Eastern Architechore

2. E. B. Hawell (3) Sleeman

سن صفحات 313-17

91- سلی مان Rambles-recollections ج 1، ص 385

92- اسمتھ تاریخ فنون لطیفہ، صفحات 183-85

93- ہاول ہندوستان تعمیرات صفحات 33-39۔ سر جان مارشل (Archac-ological survey of India Report) (1904-1905) صفحات 1-3

94- دلی کا محل: وارث ف 16 اور ف 1723 فار گوسن صفحات 309-12 Archacological survey of India Report (1911-12) صفحات 1-27

95- وارث: ف 23

96- فار گوسن صفحات 318-20

97- پرسی براؤن[1] Indian Painting under Moghuls ص 92

98- اسمتھ کا تبصرہ خوش خطی پر۔ تاریخ فنون لطیفہ، صفحات 208-209 چندر بھان کہتا ہے کہ شاہجہاں خوشخطی کا ماہر تھا چار چمن ف 33 ب

99- صالح ف 33-34 (معہ 6557): چندر بھان حسب ذیل اور کچھ خوش خط لکھنے والوں کی فہرست پیش کرتا ہے (1) یاقوت صرفی (2) ملا میر (3) علی سلطان (4) علی میر عمار (5) ملا درویش (6) محمد خان (7) محمد حسین

100- لاہوری، ج 1 حصہ 2، ص 56: قزوینی ف 329 ب 331

101- وارث ف 70 دیکھیے ڈیلا ویل کی تصنیف، بین کا بیان، صفحات 117-18

1. Percy Brown

باب 11

1- آئین، ص 2 لاہوری، ج1، ص 7: منوچی خان خاناں (ہونا چاہئے خان عالم) کی سرگزشت ایران بیان کرتے ہوئے وہ جملہ لکھتا ہے جو اس نے شاہ ایران سے کہا تھا کہ ہمارا شہنشاہ ارضی خدا ہے۔ ج2، ص 461

2- چار چمن ف 27ب: لاہوری نے شہنشاہ کو ستون شرع سے تعبیر کیا ہے، ج ا، ص 7: قزوینی ف 188

3- آئین ص 2

4- مغربی سیاح اکثر و بیشتر مغل بادشاہوں کی انصاف پسندی کی تعریف کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی گورنمنٹ کی مذمت بھی کرتے ہیں: ایسی متضاد باتوں کی مثالیں رنیر کے بیانات میں مان ریکو اور منوچی کے یہاں ملتی ہیں: ملاحظہ ہو منوچی، ج1، صفحات 197-204، اور ج2، ص 292 برنیر، ص 227 اور ص 236: مان ریکو، ج1، ص 24 اور ص 354

5- سرکار (مغل انتظامیہ 1924) ص 11

6- برنیر ص 236: مان ریکو، ج1، ص 354 اور ج2، ص 268: منوچی، ج1 صفحات ص 197-204

7- سرکار (مغل انتظامیہ 1924) ص 5

8- مورلینڈ ہندوستان اکبر کے انتقال پر ص 31

9- بینی پرشاد جہانگیر ص 94

10- ٹیورنیر، ج1، ص325
11- مثلاً مورلینڈ نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی کا ہندوستان معمولی آدمیوں کے لیے دوزخ رہا ہوگا۔ اکبر سے اورنگ زیب تک، ص232
12- آئین، ص4
13- لاہوری، ج1، ص180: قزوینی ف147ب
14- آئین ص4
15- بنی پرشاد ص96
16- ایضاً
17- ایضاً
18- یہ حکم دسمبر 1643ء میں جاری ہوا تھا۔ لاہوری، ج2، ص350
19-20-21 بنی پرشاد ص86: آئین ص ۴ اور صفحات 202-203
22- آئین ص4
23- ایضاً
24- صالح ف710ب۔ وارث ف164
25-26 آئین ص4
27- ایضاً۔ سرکار (مغل انتظامیہ 1924) صفحات 23-4: منوچی، ج2، ص419: منڈلسلو ص117
28- منوچی، ج2، ص419: سرکار (مغل انتظامیہ 1924) صفحات 46-8: مورلینڈ لفظ تان کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے مراد تنخواہ دار افسر ہے۔ زرعی نظام ص94
29- سرکار (مغل انتظامیہ) صفحات 46,41: لاہوری کا کہنا ہے کہ دیوان کل کے دونائب ہوتے تھے۔ ایک دیوان، تان، دوسرا دیوان خالصہ، ج1، ص446
30- لاہوری ملا عبدالرؤف اور ملا عبداللطیف کے نام بہ حیثیت مصطفوی رقم

کرتا ہے، ج2، ص610

31- آئین (بلوچ مین) فوج کا محتسب ص6ن14

32- ایضاً ص6ن15

33- ایضاً ن 16 ،اور سرکار (مغل انتظامیہ) صفحات 48-52: منوچی اس کو تیسرے درجہ کا عہدہ سمجھتا ہے۔ ج2، ص418

34- افضل خان ایک سال تک میر سامان تھا۔ سعد اللہ خان 2 سال تک اور فاضل کئی سال تک اسی عہدے پر رہا۔

35- آئین ص14

36- آئین صفحات192-3

37- ایضاً ص198: سرکار (مغل انتظامیہ) صفحات28-9: لاہوری ص316

38- لاہوری، ج2، ص316

39- ایضاً صفحات315-15

40- سرکار مغل انتظامیہ ص24: برنیر اس کو حکومت کا دوسرا یا تیسرا مرتبہ خیال کرتا ہے۔ ص171: منوچی، ج2، ص419

41- سرکار (مغل انتظامیہ) کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے اواخر میں۔ ماتحت بخشی تعداد میں تین تھے۔ ص24

42- مثلاً مہابت خان جھجار سنگھ سے لڑنے گیا تھا تو اسلام خان کی فوج کا بخشی مقرر ہوا تھا۔ لاہوری، ج ا، ص 241 اس کے علاوہ اسحاق بیگ نیروی کا تقرر بحیثیت بخشی اور واقعہ نویس دکن کی ایک فوج میں ہوا تھا۔ لاہوری، ج 1، حصہ 2 ص136

43- صالح کہتا ہے یہ عہدہ صرف قابل اعتماد لوگوں کو تفویض کیا جاتا تھا۔ ف62: منوچی کا کہنا ہے کہ اس کا لقب داروغہ خاص چوکی، ہوتا تھا ج2، ص422

44- سرکار مغل انتظامیہ ص27۔ منوچی، ج2 ص 419 کہتا ہے کہ اس کی

نیابت کے لیے دو مفتی ہوتے تھے اور پھانسی کا مقدمہ بغیر تین بار شہنشاہ کے سامنے پیش کیے ہوئے انجام تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

45- لاہوری اس نام کا تذکرہ دارا کی شادی کے سلسلے میں کرتا ہے۔ ج1، ص458

46- صالح ف576

47- عبد الرحمٰن رشیدائے خوش نویس، میر سید علی، اعتماد خان، عنایت خان ابن ظفر خان کے نام اس عہدہ کے سلسلے میں لیے جاتے ہیں۔

48- منڈ لسلو ص118

49- آئین ص13

50- ر۔ ب، ج2، ص195: لاہوری ج1، ص95

51- صالح ف575 الف و ب

52- مولانا محمد فاضل بدخشی، سید عبد القادر مانک پوری۔ میر بار کا بخاری، اور حاجی سعید مسلسل اس عہدے پر مامور رہے۔

53- تین نام اس عہدہ داروں کے سلسلے میں لیے جاتے ہیں۔ دیانت خان، عنایت خان اور میر جعفر۔

54- آئین، ص284: مان ریکو، ج1، ص418 اور ج2، ص137 جہاں وہ دیکھتا ہے کہ کوتوال محصول کے لیے افسر اعلیٰ تھا۔ بعد ازاں غالباً ڈی لایٹ کی سند پر وہ کہتا ہے کہ ایک کوتوال پر خاص شہر میں تعینات کیا جاتا۔ ج2، ص270۔ ن7 اور 271: مور لینڈ۔ ہندوستان اکبر کی موت کے وقت، ص۔ 37-39

55- منڈ لسلو ص118

56- منوچی، ج2، ص421

57- لاہوری، ج2 صفحات 71-11

58- نومبر 1629ء میں جب شاہجہاں دکن گیا تو اسلام خان آگرہ کا ناظم مقرر

ہوا۔ اور جب شاہجہاں 1638ء میں کشمیر گیا تو سیف خان آگرہ کا ناظم مقرر ہوا۔ یہی طریق کار اس وقت بھی اختیار کیا گیا۔ جب دار السلطنت دہلی کو منتقل ہوا۔

59- اورنگ زیب جملہ چاروں صوبہ جات کا ناظم مقرر کیا گیا جس میں احمد نگر، برار، خاندیش اور تلنگانہ شامل تھے۔

60- اودھ کا ذکر اس عہد تک زیادہ نہیں کیا گیا۔

61- آئین صفحات 280-81 سرکار، مغل انتظامیہ صفحات 80-68

62- لاہوری، ج 2 ص 290: صالح، ج 3، ص 64۔ مراۃ سکندری میں لکھا ہے کہ اعظم خان کے مظالم کی شکایت سید جلال کی ف 87

63- لاہوری، ج 2، ص 282

64- ایضاً ص 283۔ دس لاکھ روپیہ بقایا جو ظفر خان پر واجب الادا تھا شاہجہاں نے معاف کر دیا اس لیے کہ اہل کشمیر اس کے انتظام سے مطمئن تھے: لاہوری، ج 2، ص 420

65- لاہوری، ج 2، ص 185

66- مور لینڈ اس عہد کی نوعیت دو طرح کی بتاتا ہے ایک کچا اور دوسرا پکا: ہندوستان اکبر کے انتقال کے وقت" ص 31۔ برنیر کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں ناظم کی مدت ملازمت بہ نسبت ترکی کے زیادہ تھی، ص 231۔ بنی پرشاد ص 104، مان ریکو کہتا ہے کہ مدت کم تھی۔ ج ا، ص 52

67- سرکار: مغل انظامیہ صفحات 56-91 صفحات 280-83

68- سرکار: ایضاً صفحات 62-3

69- وارث ف 7

70- آئین صفحات 285-88

71- ایضاً ص 288

72- ایضاً ص288

73- ایضاً ص289

74- سرکار: مغل انتظامیہ صفحات 71-5: منوچی کہتا ہے کہ ان افسروں کی عرض داشت شہنشاہ کے حضور میں رات کو پڑھی جاتی۔ ج2، صفحات 331-32

75- ی۔ ج1645ء میں قاضی ظاہر آصف خان ایسے متحدہ عہدے پر مقرر کیا گیا: لاہوری، ج2، ص475

76- مور لینڈ: زراعتی نظام ص277۔ منوچی کہتا ہے کہ سرکار کے معنی ایک حصہ ہے۔ ج2، ص413

77- آئین ص283 منوچی، ج3 صفحات 450-51 پیٹر منڈی، ج2 صفحات 4-73

78- قزوینی ف132

79- آئین ص283

80- مان ریکو (ج2 ص249) بیان کرتا ہے کہ کوتوال کے جاسوس نے کیسے اس کا پتہ لگا لیا حالانکہ اس نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی بہت کوشش کی۔ منوچی، ج2، صفحات 420-21

81- دیکھیے ٹیوورنیر، ج1 باب 4 س، 8 تک

82- مان ریکو ہندوستان کی کاروان سراؤں کی تعریف کرتا ہے۔ ج2 صفحات 7-99۔ منوچی 2، ص68 اور ص116: برنیر بُرائی کرتا ہے ص223۔

83- ٹیورنیر، ج۱، ص292 اور ص325: منڈلسلو کہتا ہے کہ احمد آباد کے ناظم کے فرائض میں تھا کہ سڑکوں کی محافظت کرے ص114۔ مان ریکو بھی عام انداز میں سڑکوں کی محافظت کا ذکر کرتا ہے منوچی صفحات 450-51

84- آئین ص284۔ پیٹر منڈے، ج2 ص47۔ منوچی، ج2، ص24

85- مان ریکو کہتا ہے کہ سزا کا تعین بلحاظ جرم ہوتا تھا۔ ج2 ص269: منوچی،

ج 1، ص 197-204

86- پیٹر منڈے کا بیان ہے کہ چور زندہ جلا دیے جاتے تھے۔ ج 2، ص 47 ص 232 ص 233، ص 234 اور ص 254

86- مان ریکو، ج 1، ص 423

87- میوراس ڈاکیہ ہوتے تھے۔ آئین ص 188: خانی خان 1 ص 243، منوچی کہتا ہے کہ کبوتر بھی نامہ بر کا کام کرتے تھے، ج 2، ص 467: ٹیورنیر، ج ا ص 292: پل سارٹ ص 58

88- برنیر ص 209

89- مور لینڈ لکھتا ہے کہ اس دور میں ملازمت، کہنا درست ہو گا۔ ملامتوں سے تعبیر کرنا مناسب نہ ہو گا کیونکہ اس زمانے میں فرائض کی علیحدگی یا امتیازی خصوصیت کا فرق نہ تھا۔ ایک بار جو ملازم ہو جاتا تھا اس کی مدت کا انحصار شہنشاہ کی مرضی پر ہوتا اس کی فوجی خدمات سے بھی وابستہ کیا جاتا یا انتظامیہ سے بھی متعلق کیا جاتا تھا زراعتی نظام ص 93۔

90- ی۔ ج۔ سید جلال چھ ہزار ذات اور 5 ہزار سوار کا سپہ سالار تھا: لاہوری، ج ۲، ص 718

91- اردن: مغلوں کی فوج ص 4۔ دیکھیے پیٹر منڈے کی تحریر جس میں وہ منصب دار کی تعریف بتاتا ہے، ج 2 ص 124

92- آئین صفحات 144-45

93- اردن ص 4

94- دیکھیے بلوچ مین صفحات 238-47

95- اردن ص 9

96- انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ میں کمیشن، ج 5-1923 صفحات 20-2

97- لاہوری، ج 2 صفحات 505-8

98- ایضاً منوچی لکھتا ہے کہ درجہ اوّل کے ایک ہزاری کو 250 گھوڑے رکھنا پڑتے تھے۔ ج2، ص275

99- ملاحظہ ہو وارث کی فہرست منصب داروں کے سلسلے میں

100- دستورالعمل ب۔ م193752: اردن ص6

101- دستورالعمل ایضاً

102- دیکھیے وہ فہرست جو منصب داروں کی وارث میں دی ہوئی ہے۔ ب۔ م1937

103- دستورالعمل ب م 1690 ف 102ب، برنیر کہتا ہے فوج کی تنخواہ ہر دوسرے مہینے دی جاتی تھی۔

104- وارث ف62ب

105- ایضاً اور لاہوری، ج1، ص115

106- دستورالعمل ب، م، ہ1937

107- ایضاً: اور باب3 اردن، مغلوں کی فوج

108- ایضاً

109- ایضاً۔ م 52-1937، اور اردن ص 54: منوچی کہتا ہے کہ بخشی سال میں دوبار جائزہ لیتا تھا۔ ج2، ص277

110- اردن، ص9، ص211

111- ایضاً

112- ایضاً ص43 اور آئین ص187

113- وی اسمتھ کی تصنیف اکبر ص360: برنیر صفحات 10-209

114- ڈاکٹر ہارن کا حوالہ دیتے ہوئے اردن کہتا ہے کہ مغلیہ فوج رسالہ، پیدل، توپ خانہ پر مشتمل تھی لیکن دوسری اور تیسری شاخیں اوّل کے مقابلے میں بڑی کمتر درجہ رکھتی تھی ص 57 سے برنیز کا تبصرہ لہسر پر" ص43

115- آئین صفحات 180-90: منڈ لسلو کہتا ہے پیدل سپاہ بندوق کے استعمال میں غنیمت ہے ص 118: بر نیر کہتا ہے بندوقچی اچھے نہ تھے۔ ص417

116- مان ریکو لکھتا ہے کہ گھوڑے زیادہ تر عربی، ایرانی اور ترکی تھے، ج اا، ص277: منوچی کہتا ہے کہ بادشاہ کی ملازمت میں ہر سوار کو ترکی گھوڑا رکھنا ضروری تھا ج2، ص376

117- برنیر صفحات48-9

118- ایضاً ص 217: منڈ لسلو لکھتا ہے کہ مغلوں کے پاس بہ لحاظ تعداد زبردست توپ خانہ ہے توپیں زیادہ تر کمتر درجہ کی ہیں۔ ص118: منوچی، ج ا، ص95

119- برنیز ص218

120- مان ریکو پر اثر بحریہ کی کمی کی وجہ مغلوں کی بزدلی پر محمول کرتا ہے۔ ج2، ص278:،2ص168

121- ملاحظہ ہو ہوگلی کی تسخیر کا بیان

122- آسام کی مہم کا بیان ملاحظہ ہو۔

123- ملاحظہ ہو شاہجہاں نے جو حکم کشمیر سفر کرنے میں کاشتکاروں کو معاوضہ دینے کا حکم دیا تھا۔ لاہوری، ج1، ص2 صفحات4-5

124- قزوینی ف267ب

125- لاہوری، ج2، ص168

126- ضبطی کے نظام کا بیان کے سلسلے میں ملاحظہ ہو مورلینڈ کا مضمون، ج۔ ر۔ا۔س سوسائٹی1918

127- ایضاً

128- ایضاً

129- مورلینڈ زراعتی نظام ص 37-234
130- مورلینڈ زراعتی نظام ص135
131- ایضاً ص124
133- ایضاً ص126
134- لاہوری، ج2، صفحات 64-362: مراۃ سکندری ف 83 ب: منڈ لسلو ص120
135- لاہوری، ج2 صفحات 83-282
136- لاہوری ص289 اور ص632: محمد صادق ص116
137- اجمیر میں براہمہ مندر کی بے حرمتی۔ ر۔ ب، ج1 ص154 اور کانگڑا کے مندر کی توڑ پھوڑ کے بابت ج2 ص223۔ ملاحظہ ہو قزوینی کا تبصرہ ف 60: شش فتح کانگڑا ف25۔
138- یہ حکم جنوری 1633ء میں جاری ہوا تھا۔ لاہوری، ج، ص 72:452 مندر بنارس میں مسمار کیے گیے۔
139- قزوینی ف302: برنیر کشمیر میں مندروں کے مسمار کیے جانے کا ذکر کرتا ہے ص400
140- قزوینی ف302
141- ایضاً ف 331-12 ف411: جو کھو بھمبھار کا زمیندار تھا اس کے قبیلہ کے لوگ مسلمانوں ہو گئے۔ چار سو ہندو پنجاب میں مسلمان کیے گئے۔
142- تبدیلی مذہب کی اہم مثالیں حسب ذیل ہیں: (ا) جھجار سنگھ کے دو لڑکے دوگ بھان اور در جن سال کے نام اسلام قلی اور علی قلی رکھے گئے۔ قزوینی ف362 ب (2) پرتگالی قیدی قزوینی ف ص299 ب (3) دلپست سر ہندی سے بھی کہا گیا کہ اگر وہ دو مسلمان لڑکیاں رکھنا چاہتا ہے تو اسے مسلمان ہو جانا چاہیے لیکن اس نے انکار کر دیا اس کو تکلیف کے ساتھ موت

کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کردی گئی۔ قزوینی ف 411 ٹیو ونیر، ص 391، ج 1

143- طبقات شاہجہانی ف 317

144- قزوینی ف 302

145- ایضاً ف 303 ب

146- ایضاً ف 238

147- طباطبائی ف 19 لیکن لاہوری کا کہنا ہے کہ مایہ داس کافی عمر کا ہو گیا تھا، ج 1، ص 446

148- پی ڈیلا ویل، ج 1، ص 71

149- دیکھو مان ریکو کا بیان، ج 2 صفحات 105-15

150- مان ریکو، ج 2، صفحات ایضاً

151- ایضاً ص 147

152- برنیر ص 212 ایک دوسری جگہ کہتا ہے ہم عموماً مشرقی حکمرانوں کو وحشی بھی سمجھتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ایسے انصاف سے روگرانی نہیں کرتے تھے جو رعایا کے ساتھ کرنا چاہئے۔ ص 263: منوچی، ج 2 ص 147

153- منوچی، ج 1، صفحات 198-204: ٹیو ونیر، ج 1، ص 325

154- منڈ لسلو ص 118: برنیر، ص 55: اردن 185

155- ایضاً ڈیلا ویل کہتا ہے کہ ہندوستانی سپاہی ایک مخصوص اسلحہ میں مہارت حاصل کرتا ہے اور جنگ میں دوسرے ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔ ص 225۔

156- منوچی کہتا ہے کہ شاہجہاں تین ہزار ہاتھی رکھتا تھا ج 2، ص 10: برنیر ص 277: پیٹر منڈے کا بیان، ج 2، ص 52-3، اردن صفحات 175-81

157- زاہد خان کا دس سال کا لڑکا فیض اللہ ایک ہزار ذات اور چار سو سوار کا

منصب دار مقرر ہوا۔ لاہوری، ج2، ص434: محمد مراد بن صلابت خان 5
سوذات اور سو سوار کا منصب دار مقرر ہوا۔ ایضاً ص384: منڈلسلو ص118۔

159- برنیر ص205، اور ص227: ٹیورنیر، ج1، ص391

160- برنیر ص 171: منوچی، ج2، ص378: منڈلسلو ص 1021: مان ریکو، ج2، ص172 پٹر منڈے، ج2، ص147، اور ص223۔

161- لاہوری، ج2 ص184: ولیم فاسٹر کی رائے ہے کہ ظریف (جس کو وہ شریف کہتا ہے) کا مقصد ترک و مغل کا اتحاد بر خلاف ایران عمل میں لانا تھا۔ انگریزی کارخانہ کے اندراجات (41-163) تعارف

162- لاہوری، ج2 ص186۔

163- ایضاً صفحات 18-216

164- وارث ف73 ب اور ف80

165- وارث ف81 ب

166- جامع الانشاء ف139-57

167- وارث (معہ 65-56) ف494 اور ف488

168- ایضاً ف481 (معہ 65-46)

169- جامع الانشاء ف139-57

170- وارث ف485-86 (معہ 65-56)

171- لاہوری، ج1، ص204: ج1 حصہ 2 ص102: ج2 ص 406,390, 342,164 وارث ف 14 ف 29 ف 68 ف 81 ب 92 ف 467 486(56,65) ب

172- وارث ف81 ب

173- مان ریکو، ج2، ص178

174- ہندوستان میں انگریزی کارخانے 33-1630ء صفحات 47-8: تعارف

10۔

175-ڈیسورس، ج2، ص252

176-ہندوستان میں انگریزی کارخانے 33-1630 صفحات 5-123: منوچی، ج ا، ص185۔

177-ایضاً ایضاً تعارف 18

178-ایضاً (21-1618) تعارف 37

179-ایضاً (29-1624) ایضاً 30,25

180-ایضاً (36-1634) ایضاً 7-9, 12، 3ة، 16 ،اور ڈینورس، ج2، ص240

181-ایضاً (45-1642) ایضاً 10

182-ایضاً (50-1646) ایضاً 21,20,18,17

183-ٹھٹہ میں چار اہل ڈچ کا آنا: ہندوستان میں انگریزی کارخانے (54-1651) ص116 ،اور تعارف 12,11

184-ہندوستان میں انگریزی کارخانے (60-1655) ص68:

185-ایضاً (29-1624) تعارف 32,29,25

186-ایضاً (33-1630) تعارف 34,25,8

187-ایضاً (36-1634) تعارف 15

188-ایضاً (ایضاً) ایضاً

189-ہندوستان میں انگریزی کارخانے (26-1634) تعارف 22-7

190-ایضاً (41-1637) ایضاً

191-ایضاً (45-1642) ایضاً 10

192-ایضاً (50-1646) ایضاً 22-3

باب 12

1- لاہوری، ج 1، ص 243: قزوینی ف 167 ب

2- لاہوری، ص 254: قزوینی ف 172 ب

3- لاہوری، ص 296: قزوینی ف 190

4- لاہوری کوئی نام نہیں لیتا ج 1، ص 300: قزوینی اس کا نام حسن آرا بیگم بتاتا ہے ف 191

5- لاہوری، ج 1 صفحات 381-89: قزوینی ف 232-35 دیکھیے برٹش میوزیم کیٹلاگ بھی معہ 8910 تاج محل اور شاہجہاں کی نظمیں۔

6- قزوینی لکھتا ہے کہ شہنشاہ عینک بھی استعمال کرنے لگا ف 232 ب

7- قزوینی ف 235: لاہوری، ج 1، ص 403

8- ایضاً 247 ب اور ف 250: لاہوری، ج 1، ص 422 اور ص 428

9- ایضاً 251: لاہوری، ج 1، ص 430

10- ایضاً ف 256 ب 57 ب اور 261-56: قزوینی کا کہنا ہے کہ تیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا لاہوری ج 1، صفحات 452

11- ایضاً 265-266 ب: لاہوری صفحات 460-65

12- قزوینی ف 274-77 ب۔ سیدائے گیلانی نے اس واقعہ کو منظوم کیا اس کو چاندی میں وزن کرایا گیا۔ طالب کلیم نے بھی اس پر نظم کہی۔ قزوینی نے واقعہ کو نثر میں قلم بند کر کے حضور شاہ پیش کیا۔ اس نے داد سخن دی اس کا

وظیفہ بڑھادیا شاہجہاں کا وہ منظور نظر ہو گیا۔ اس سے اکثر فرمائش کی جاتی کہ مرصع انداز بیان میں نثر لکھا کرے (ف 277 ب) لاہوری، ج ا صفحات 489-92 وہ قزوینی یا کلیم کا اس سلسلے میں ذکر نہیں کرتا وہ صرف سیدائے گیلانی کا ذکر کرتا ہے صفحہ 493

13- قزوینی ف 300: لاہوری، ج 1، ص 536

14- ایضاً 304: ایضاً حصہ 2، ص 4

15- قزوینی لکھتا ہے کہ دارا کی بیماری کا راز اس کی لڑکی کی موت تھی ف 307: لاہوری، ج 1، حصہ 2 صفحات 1579

16- قزوینی ف 312 ب: لاہوری، ج 1، حصہ 2، ص 20

17- کشمیر کے بیان کا موازنہ قزوینی اور جلال الدین طباطبائی کے الگ الگ بادشاہ ناموں سے کیجیے: اور قدسی اور کلیم کے منظوم بیانات کا بھی مقابلہ کیجیے: قزوینی اس وقت شاہی جلوس میں شریک تھا۔ ف، 329

18- قزوینی 362 ب: لاہوری، ج 1، حصہ 2، ص 49

19- قزوینی 443: لاہوری ایضاً ص 62

20- ایضاً ایضاً ص 70

21- ایضاً ایضاً ص 70

22- ایضاً 340 ایضاً ص 74

23- ایضاً 350 ایضاً ص 105

24- ایضاً ف 354 ب 357 ایضاً صفحات 120-123

25- ایضاً 360 ایضاً ص 123

26- ایضاً 363 ایضاً ص 135

27- ایضاً 386 ایضاً ص 205

28- ایضاً 393 ب ایضاً ص 224

29- ایضاً 400 ص235

30- ایضاً 402 ایضاً صفحات244-45

31- ایضاً ف4061-7اور ف408ایضاً صفحات266-71

32- لاہوری، ج2، ص110

33- ایضاً ص163

34- ایضاً ص292

35- ایضاً ص257

36- ایضاً ص304-5

37- ایضاً ص320

38- ایضاً ص344-49

39- ایضاً ص 400,393,375,69,363 ولیم فاسٹر نے کسی انگریز کے ہاتھ سے جہان آرا کے شفاپانے کی کہانی کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے دیکھیے دیباچہ "ہندوستان میں انگریزی کارخانے1642 36,35,25,

40- لاہوری، ج2 صفحات380-84 محمد صادق نے اس واقعہ کو خود دیکھا اس کا کہنا ہے کہ صلابت خان مکرمت خان سے باتیں کر رہا تھا اور شہنشاہ، عبداللہ خان فیروز جنگ کے لیے ایک فرمان لکھا رہا تھا۔ امر سنگھ بد گمان ہوا اس نے سمجھا کہ صلابت جنگ اس کی شکایت کر رہا ہے۔

41- لاہوری، ج2 ص407

42- ایضاً ص413

43- وارث ف5ب

44- ایضاً 12ب

45- ایضاً 12

46- ایضاً 15ب: صالح ف541

47-ایضاً ۲۸ ب

48-ایضاً 50ب

49-ایضاًف 64-62 Archasological Surveg of India Report 911-21

50-ایضاًف 75

51-ایضاً 91

52-ایضاًد 99ب

53-ایضاً (معہ 6556)ف 462ب

54-ایضاًف 475ب۔77،اور ف 487

55-ایضاًف 481

56-ایضاً 481ب

56-ایضاً 481ب

57-ایضاً(167553)ف 123ب۔126

58-ایضاً(معہ 6556)ف 489

59-وارث ف،490

60-ایضاًف 491

61-ایضاًف 419

62-ایضاًف 521

63-سرکار: تاریخ اورنگ زیب،ج 1 صفحات 302-3

64-لطیف الاخبار کا مصنف دارا کے کردار کی ایک مختصر ترین تصویر الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

65-سرکار: تاریخ اورنگ زیب ج 2 صفحات 127-28

66-ظفر نامہ عالمگیر ف 9

67- عنایت نامہ اورنگ زیب سے شجاع تک ف 38 ب: جامع الانشاء مراد سے اورنگ زیب تک ف 359۔

68- ایضاً ف 37 جامع الانشاء ف 375

69- ایضاً ف 38 ب

70- ایضاً ف 37

71- جامع الانشاء مراد سے اورنگ زیب تک ف 357

72- عنایت نامہ: اورنگ زیب سے مراد تک ف 41

73- ایضاً ف 40: ظفر نامہ ف 17 ب

74- سرکار: تاریخ اورنگ زیب، ج 1، ص 308

75- جامع الانشاء مراد سے اورنگ زیب تک ف 355

76- سرکار کی تاریخ اورنگ زیب، ج 1، ص 309

77- ایضاً

78- جامع الانشاء: مراد سے اورنگ زیب تک ف 366

79- ایضاً ف 365: مراد نے اورنگ زیب کو لکھا کہ میں خوش ہوں کہ آپ نے میر جملہ کو جیت کر قید کر دیا۔

80- خلاصۃ التواریخ ف 384

81- سرکار کی تاریخ اورنگ زیب، ج 2 ص 1-30

82- ایضاً ایضاً ایضاً

83- جامع الانشاف 157-58: صالح کا کہنا ہے کہ جہاں آرا نے یہ خط اپنے بخشی محمد فاروق کے ہاتھ بھیجا۔

84- ایضاً 158-60

85- فتوحات عالمگیری میں لکھا ہے کہ یہ ہاتھی راج، گوہاد کا زمیندار تھا۔ ف 23 ب دل کشا میں ہے کہ چمپت تھا۔ ف 156 دیکھیے چھتر پرکاش ص: خلاصۃ

التواریخ خاموش ہے۔

86- جامع الانشاء مراد سے شاہجہاں تک ف 379-80

67- ایضاً مراد سے شجاع تک ف 376

88- ظفر نامہ ف 36: فتوحات عالمگیری ف 27

89- ظفر نامہ ف 32 ب: محمد صادق لکھتا ہے کہ وہ گفت و شنید میں ایک فریق تھا۔ اورنگ زیب نے خلیل اللہ خان کو روک رکھا اور افضل خان کو اور راقم کو رخصت کر دیا۔ ف 201-2 صالح بھی مستند ذرائع سے یہی خبر دیتا ہے ف 237۔

90- ظفر نامہ ف 38

91- سرکار: تاریخ اورنگ زیب، ج 3 ص 145